بلوچ

1

مہرگڑھ سے تشکیلِ ریاست تک

شاہ محمد مری

\Sangat\etc\sangat.j
not found.

ضابطہ

جملہ حقوق سنگت اکیڈمی کے نام محفوظ ہیں!

کتاب:	بلوچ: مہرگڑھ سے تشکیلِ ریاست تک
مصنف:	شاہ محمد مری
پہلا ایڈیشن:	1999
دوسرا ایڈیشن:	2010
تیسرا ایڈیشن:	2016
تعداد:	1000
قیمت:	400روپے

چاپ ءُ شنگ:

سنگت اکیڈمی آف سائنسز، کوئٹہ

بہاءِ جاہ:

سنگت اکیڈمی

فاطمہ جناح روڈ، کوئٹہ

فون:+92-81-2843358

email: books@sangatacademy.net

Web: www.sangatacademy.net

انتساب

بلوچستان کی بلند ترین چوٹی پرلہرانے والے
اُس پرچم کے نام،
جس پرایک ستارہ ہوگا،
سرخ رنگ کا!

بلوچ سیریز

جلد اول : بلوچ، مہر گڑھ سے تشکیلِ ریاست تک
جلد دوم : بلوچ، قبائلی وجاگیرداری عہد
جلد سوم : بلوچ، نوآبادیاتی عہد
جلد چہارم: بلوچ، بلوچ صنعتی عہد
جلد پنجم : بلوچ، عورتوں کی تحریک

فہرست

2016 میں تیسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

''بلوچ'' نامی اِس کتاب کا پچھلا ایڈیشن جلد نمبر 1 کی حیثیت سے 2010 میں شائع ہوا تو اُس کے بعد جلد نمبر دو''بلوچ ، قبائلی و جاگیرداری عہد'' کے نام سے چھپی جو کہ ریاست کی تشکیل کے بعد بلوچ سماج کے مکمل فیوڈلزم میں داخل ہونے تک کے عہد تک کا احاطہ کرتی ہے۔

اس عرصے میں تیسری جلد''بلوچ، نو آبادیاتی عہد'' بھی شائع ہوئی جو کہ انگریز کے خلاف بلوچ سامراج دشمن سٹرگل کے پورے اسی برس کا احاطہ کرتی ہے۔

چوتھی جلد''بلوچ، صنعتی عہد میں'' کے اندر میں 1947 میں انگریز سے آزادی حاصل کرنے کے بعد کا زمانہ شامل ہے،یعنی جب سے بلوچ مکمل طور پر سرمایہ داری سماج میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس میں طبقات کی نئی شکل، ٹریڈ یونین سرگرمیوں ، اور پوسٹ سوویت بلوچستان کی معیشت وسیاست کا تذکرہ شامل ہے۔

''بلوچ'' سلسلے کی پانچویں جلد بلوچ سماج میں'' عورتوں کی تحریک'' کی سرگزشت پر مشتمل ہے۔

اِس پہلی جلد کے پچھلے ایڈیشن میں تاریخی واقعات کو کلاسیکل بلوچی شاعری کی بھاری مدد حاصل تھی۔ بلوچ کی خوب صورت صلاحیت یہ رہی کہ وہ واقعات کو شاعری میں ریکارڈ کرتا رہا۔ یوں ایک ضخیم شاعری اُس جلد میں شامل تھی۔ بعد میں ''بلوچی زبان وادب'' کی تاریخ الگ سے تیار ہوگئی۔ اُس میں ظاہر ہے کہ مائتھالوجی ، اور کلاسیکل ادب سے لے کر جدید ادب تک بلوچستان کا

ادبی سرمایہ شامل کیا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں، بلوچ تاریخ کی اس جلد میں دی گئی شاعری حذف کرنا پڑ رہی ہے۔ اس لیے کہ غیر ضروری طور پر ری پٹیشن ہوجائے گی۔ چنانچہ شاعری ساری کی ساری وہاں چلی گئی اور یہ والی جلد، ماقبل مہرگڑھ سے شروع ہوکر بلوچ کی طرف سے قلات میں باقاعدہ ریاست کی تشکیل تک کے مراحل تک آتی ہے۔

دوسری بڑی تبدیلی جگہ جگہ محسوس ہوگی، اس لیے کہ پچھلے سات آٹھ سال میں سائنس کی ساری شاخوں میں اس قدر تیزی اور وسعت آئی ہے کہ نظریات سے لے کر حقائق تک سب کچھ میں اضافے ہوتے رہے۔ بلکہ کہیں کہیں تو پچھلی باتیں مسترد تک ہوتی رہیں۔ سائنسی حقائق کو تسلیم کرنا دلیل کی حاکمیت کو ماننے والے کے لیے لازم ہوتی ہے۔ چنانچہ بے شمار کجیاں اِن دریافتوں نے صحیح کروالیں۔

زبان اور اسلوب کو بھی بہتر اور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی۔

جاوید اختر اور عابد میر نہ صرف میری کتابوں کے ہر صفحے کے ساتھی رہے ہیں بلکہ ناترس ناقد بھی۔ پتہ نہیں یہ دونوں میری کتنی موضوعی باتیں، فقرے اور پیراگرافوں کو ہاضمے کی بلوغت کے ترازو میں تول کر ردی میں پھینک چکے ہیں۔ کیا قیامت کے دن بے دردی سے کاٹے گئے یہ الفاظ، فقرے اور پیراگراف اُن دونوں احباب کے خلاف کوئی شکایت، عرضی پیش نہیں کریں گے؟!!

شاہ محمد مری

چھ جولائی، 2016

2010 کے دوسرے ایڈیشن کا پیش لفظ

بلوچ ڈیڑھ صدی سے اپنی محکومی کے خلاف بہت تسلسل اور زخم آلود جدوجہد کرتا چلا آ رہا ہے......یہی زیردستی وہ مہمیز وترغیب ہے جو ہر بلوچ کو خود سے یہ سوال کرتے رہنے پر مجبور کردیتی ہے کہ ''درحقیقت میں کون ہوں؟''۔ دنیا بھر کا انسان بالعموم، اور بلوچ تو بالخصوص اگر کسی بھی ایک چیز کے لیے بھوکا نظر آتا ہے تو وہ چیز ہے: ''میں کون ہوں؟''۔ جواب کا ذرا سا بھی نشان ملے تو بلوچ اپنے سارے کام کاج چھوڑ کر اُن معلومات کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ بلوچ کو اپنی تاریخ سے جنون کی حد تک پیار ہے۔

قدیم یونانی لفظ ہسٹری (History) مطالعہ اور بیانیہ کو کہتے ہیں۔ یہ انسانی زندگی سے متعلق ماضی کے واقعات کا مجموعہ ہوتا ہے۔ تاریخ' نہ صرف بناتے انسان ہیں بلکہ اُسے محفوظ بھی وہی رکھتے ہیں اور اس سے فائدہ بھی وہی اٹھاتے ہیں۔ تاریخ ہمیشہ رواں رہتی ہے، رکتی نہیں، مڑتی جُڑتی رہتی ہے مگر خود کو دُہراتی کبھی نہیں۔ ''جنگِ گوخ پروش'' ''جنگِ نُفسک'' نہیں بن سکتی اور مستیں توکلی کے ساتھی کا نام مخیفو نہیں ہوسکتا۔

تاریخ میں یہ ممکن نہیں کہ جو کچھ ہو چکا ہو اُس کو تبدیل کیا جا سکے۔ سچی بات یہ ہے کہ تاریخ کا نغمہ وہ واحد نغمہ ہے جو ایک ہی دفعہ بجتا ہے، اِس کو آپ بار بار ''ری پلے'' نہیں کرسکتے۔ یہ ایک ہی بار لکھی یا لکھائی جاتی ہے۔ بس جو ہوا ہوا۔ بہتی ندی میں جو چُلّو ایک بار بھرا، وہی پانی دوبارہ اُسی جگہ سے چلّو میں نہیں آتا۔

پندرہ بیس برس قبل میں نے ایک کتاب لکھی تھی : ''بلوچ قوم ،عہدِ قدیم سے عصرِ جدید تک''۔ کتب فروش بتاتے ہیں کہ وہ کتاب دس سے زائد بار چھپی اور بکی۔اکیڈمیشنوں کے ہاں بھی اس کے حصے میں بہت پذیرائی' بہت مقبولیت آئی تھی۔

مگر،بعد میں مجھے ایک لحاظ سے اپنی اُس کتاب کو(جزوی طور)پر مسترد کرنا پڑا۔اور یہ بہت بڑی انہونی مجھ سے سائنس نے کروائی۔ نئے علم نے پرانے علم کو مسترد کرادیا۔اور میں نے بلاجھجک نئے علم کے سامنے سرِ تسلیم ختم کردیا۔علم کے سامنے ذات ،انا،سب کی گردن جھکانا لازمی ہوتا ہے۔

سائنس کا ایک شعبہ کچھ دریافت کرتا ہے تو دوسرے سارے شعبے متاثر ہوتے ہیں۔اِس بار یہ شعبہ آرکیالوجی کا تھا۔آرکیالوجی نے مہرگڑھ میں اتنی بڑی دریافت کرڈالی کہ بلوچ کی ابتدا کے بارے میں پچھلے سارے نظریات تہہ وبالا ہوگئے۔

انگریز اور سوویت سکالروں محققوں سمیت سارے متشرقین (Orientalists) کی وسطی اور جنوب وسطی ایشیا کی قدیم تاریخ کے بارے میں لکھا ہوا سب کچھ غلط ثابت ہوا۔مگر وہ اپنی اپنی ان کتابوں پہ نظرِ ثانی کرنے کو زندہ نہیں۔

صرف بلوچ نہیں بلکہ پشتون، سندھی، سرائیکی، پنجابی، ازبک، ترکمن .... سارا خطہ ازسرِ نو اپنی تاریخ لکھنے پر مجبور ہوگا۔''پرستی'' کا دُم رکھنے والے سارے الفاظ اپنے معانی بدل دیں گے۔

میں اُن سب قوموں کے بہی کھاتے اُنہی کے محققوں ،مؤرخوں کے لیے چھوڑتے ہوئے صرف اپنے حصے کا کام کرتا ہوں۔چنانچہ اُس زمانے کی بلوچ تاریخ کے بارے میں اپنے ہی لکھی تختی کو ڈسٹر کے حوالے کرلیا۔

اور وہ تختی کیا تھی؟۔اس پہ ایسا کیا لکھا تھا؟۔ اُس زمانے کی مطابقت میں بلوچ کی ابتدا کے بارے میں جُزوی طور پر اُس نظریے کو دہرایا گیا تھا جس کے مطابق بلوچ کہیں باہر سے آ گئے۔وہ یہاں کے باشندے نہیں بلکہ (یوپی، مشرقی پنجاب ،اور سی پی سے آئے دوسرے

پڑوسیوں کی طرح) کہیں سے مہاجرت کرکے یہاں آباد ہوئے۔مائیگریشن تھیوری!!۔اور اِس تھیوری کے مطابق مائیگریشن بھی کہاں سے؟ کوئی کہتا تھا کہ:

الف: کیسپین سمندر سے۔لہٰذا یہ آریا ہیں۔اس نظریے کے لوگ بلوچی زبان کو ثبوت کے بطور پیش کرتے رہیں۔مائیگریشن کی یہ تھیوری اس مہاجرت کو 1200 ق م بتاتی ہے۔

ب: کوئی کہتا تھا کہ کیسپین کے بجائے حلب ہماری جائے روانگی ہے۔لہٰذا یہاں' بلوچ عرب یعنی سامی نسل قرار دیے جاتے ہیں۔

مگر، سچی بات ہے کہ میں پہلے ہی سے اُن احباب میں شامل رہا جنہوں نے مہاجرت والے نظریے کو بلوچ کا واحد سرچشمہ کبھی نہ مانا۔ میں نے بلوچ کو، مقامی آبادی کے اندر' ہزاروں سال قبل باہر سے آتے رہنے والوں کے ضم ہوتے رہنے سے وجود میں آنے والی قوم گردانا۔یعنی بلوچ یہیں کے اصل باشندے ہیں۔

پچھلے ایڈیشن کے چھپنے کے تقریباً ربع صدی کے عرصے میں کئی نئے حقائق سامنے آئے۔تاریخی شواہد میں کئی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں اور بہت سارا نیا مواد منظر عام پہ آیا۔ آرکیالوجی نے ہماری تاریخ سے متعلق بہت سے چُھپے ہوئے گوشے جھاڑ پھونک کر سائنس دانوں کے سامنے لاکر رکھ دیے ہیں۔مہرگڑھ کی کھدائی نے تو گویا سمت ہی بدل ڈالی۔مہرگڑھ' نوشہرو، پیرک،اور پھر موہن جودھڑو مائیگریشن نظریے کے باطل ہونے کے ثبوت ٹھہرے۔بلاشبہ ہماری آبادی میں دوسرے لوگ بھی وقتاً فوقتاً ملتے رہے' بے شک کچھ کیسپین سے آئے ہوں گی اور کچھ حلب سے،اور کچھ زنجیبار سے بھی۔

اس ایڈیشن میں ان ساری نئی سائنسی دریافتوں کو صرف بلوچی زبان کی آریائی ساخت والے واحد نکتہ کی زیردستی میں نہ رہنے دینے کا مزید سامان میسر ہوا۔

اِن نئی سائنسی تحقیقات نے تنگ نظری کو وسعت کا ایک اور ٹُھڈا مارا۔جس بلوچستان کو میں صرف بلوچوں کی تاریخ کا مسکن ومنبع سمجھتا تھا،وہ غلط نکلا۔جدید آرکیالوجی کی دریافت ہے کہ بلوچستان محض ایک نسل اور قوم کی جنم بھومی نہیں ہے بلکہ اُن انسانوں کی سرزمین ہے جنہوں نے

ہزاروں برس بعد سندھی، پشتون، بلوچ، سرائیکی اور پنجابی کے نام اپنائے اور الگ الگ قومیں تشکیل دیں۔

مگر یہاں تو تماشا یہ ہے کہ مہر گڑھ سے بھی بہت پہلے کی دریافتیں ہو گئی ہیں۔ اب تو یہ شک بھی گزرتا ہے جیسے زمین پر زندگی کی ابتدا ہی یہیں سے ہوئی ہو۔ معمولی ایلچی اور بیکٹر یا سے لے کر بلوچی تھیریم، وھیل مچھلی میتھ، (بڑے ہاتھی) اور ڈائنوسار تک یہیں ہمارے ڈیرہ بگٹی بولان اور بارکھان کے وسیع جنگلات میں موجود تھے۔

بعد ازاں، درہِ بولان کے دھانے پہ تو لگتا ہے ''انسانی'' زندگی کے اوائل کی شروعات ہوئی ہو۔ بغیر تباہ ہوئے پورا پتھر کا زمانہ مہر گڑھ پر بیتا۔ لہٰذا تحقیقی دماغوں کے سمجھو طوطے ہی اڑ گئے۔

تصور کیجیے کہ پوری انسانی زندگی کا ارتقا یہیں ہمارے وطن میں ہوتا رہا ہو، اور ہم بے خبر، درزادہ ونقیب کی فرسودہ بحثوں میں الجھے رہے۔ ہم، جو ابھی تک بلوچ کے بھی قبائل اور قبائل کی بھی ذیلی شاخوں کی آمد و رفت میں الجھے لوگ ہیں، اب اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ہم تو کُل کائنات کے خالق خطے کے مالک لوگ ہیں تو تاریخ ہمارے عہد کے دانش ور کو کتنا چھوٹا کہے گی۔ جی ہاں' اگر ثابت ہو جائے کہ معمولی چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک اور ہاتھی سے لے کر انسان تک سب کی پیدائش وارتقا کا ایک بڑا گہوارہ ہمارا بلوچستان ہے، تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنی بڑی ذمہ داری آئے گی بلوچ دانش ور پر، بلوچستان کے سائنس دانوں پر۔ سوچتا ہوں کہ کاش اگر ڈارون اپنی کتاب کی بنیاد بلوچستان کو بنا لیتا تو ایک تو اُسے اس قدر مخالفتوں اور بحثوں میں الجھنا نہ پڑتا' اور دوسرا بلوچ دانش وروں پر کام کا اتنا بڑا بوجھ نہ پڑتا۔ اب برسہا برس درکار ہیں بلوچستان کی تاریخ مرتب کرنے میں............ بلوچ ہونا واقعی بڑا چیلنج ہے۔

اس کے تقاضوں کی برآوری کے لیے جنون چاہیے، عشق چاہیے، اور بہت ہی بلند ذہنی سطح چاہیے۔ اور جب ذمہ داری بڑھ جاتی ہے تو آٹومیٹک انداز میں چھوٹا پن گم ہو جاتا ہے۔ چھوٹی بات کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بلوچ ہونے اور کائناتی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے شاونزم کے جراثیم کو سائنسی نقطہِ نظر کے سپرے سے مار دینا لازمی ہو جاتا ہے۔

بندۂ عشق شدی ، ترکِ نسب کن جامیؔ
کہ در این راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

چنانچہ حتمی بات یہ ہے کہ بقول گل خان نصیر ''بل دیوتا کی پرستش کرنے والوں کی سرزمین''، بلوچستان کی تاریخ اب محض چاکر رند یا پھر اُس سے قبل آریاؤں کی آمد و رفت تک محدود نہیں بلکہ یہ تو بہت پیچھے ہزاروں سال قبل تک سے شروع ہوتی ہے۔ اچھا لگتا ہے یہ تصور کہ ہم نسلِ انساں کے اجداد کے وطن سے ہیں۔ مگر، اب اسے کنگھالنا، لکھنا آسان ہوتا تو یہ کتاب پچھلی کتاب کی اشاعت کے بعد سے پوری چوتھائی صدی نہ لیتی۔ پس پتہ چلا کہ:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بودم ، پختہ شدم ، سوختم

(رومیؔ)

مہرگڑھ کی کھدائی کے بعد حاصل شدہ معلومات کی روشنی میں یہ آئیڈیا میں نے جب بلوچستان سنڈے پارٹی، سنگت اکیڈمی آف سائنسز اور دیگر دانش وروں کے سامنے رکھا، مباحث اور مکالمہ کیا تو سب دوستوں کی دلچسپی قابلِ دید تھی۔ بالخصوص ماما عبداللہ جان جمالدینی تو اچھل پڑا اِس تصور سے۔ سنگت سرور اور دوستین بحثوں میں مجھے جگہ جگہ شکست دیتے رہے، جیئند خان تو سپریم کورٹ میں پیش ہونے والے وکیلوں کی طرح دس پندرہ موٹی کتابیں بغلوں میں لیے میری لیبارٹری پہنچا۔ خوشی اور تجسس سے ڈاکٹر تاج بریسگ کی آنکھیں چمک اٹھیں، عزیز بگٹی اپنی تحریروں کو نظرِ ثانی کرنے کے ارادے سے دیکھنے لگا اور شک و تشکیک سے یقین میں بدلتی ڈاکٹر بدل خان کی آنکھیں شرارتی بن گئیں۔

ایک طویل اور پہلو دار بحث چلتی رہی۔ مہرگڑھ کا پتھر کا زمانہ خود انسانی ارتقا اور انقلاب کی ایک تشریح ہے۔ گورڈن چائلڈ کی کتاب ''Man Makes Himself'' اس تشریح کے لیے ہمیں زبردست راہنمائی بخشتی ہے۔ اسی طرح عرفان حبیب کی کتاب Peoples History of India مہرگڑھ کی دریافت شدہ اشیا کی تفصیل سے بھری ہوئی دستاویز ہے۔ فریڈرک اینگلز کی

کتاب ''خاندان ریاست اور ذاتی ملکیت کا آغاز'' تو انسان کو تاریخ کے بارے میں ایک بھرپور نقطۂ نظر بخشتی ہے۔ میں نے ان سب سے بہت معلومات لیں۔ انٹرنیٹ تو ایک ایسا پیر ثابت ہوا کہ اگر یہ زندہ اور مجسم انسان ہوتا تو اس کے بے شمار مرید ہوتے، الگ فرقہ ہوتا، بے شمار خلیفے ہوتے۔ .... یہ منابع میرے لیے آکسیجن ثابت ہوئے۔

مہرگڑھ کی دریافت نے ہماری اب تک کی موجود تاریخ کی ساری تحقیقی کتابوں میں باقاعدہ ''ہڑادھڑی'' مچائی۔ صرف ماقبل تاریخ کی حد تک ہی نہیں بلکہ اگر آج دستیاب منابع اور وسائل سے کام لیا جائے تو بلوچ تاریخ کی اب تک لکھی گئی ہر کتاب کے تقریباً ہر باب کے ساتھ حشر نشر کرنا پڑے گا۔ اور اب وہ ساری بے ترتیبی اور ٹیڑھ پن نکالنا پڑے گا جو اُس وقت تک سائنس کی دنیا میں دریافتوں کی کمی، یا پھر، سائنسی دنیا تک ہماری رسائی میں کمی، کی وجہ سے موجود تھی۔ اب بلوچ کی تاریخ کی کتاب نسبتاً زیادہ مسلسل ہوگی اور بڑی بڑی ناہمواریوں یا ''خاموشیوں'' سے پاک ہوگی۔ ہم ''ماقبل ہُوراسک عہد'' سے لے کر آج کے بلوچستان تک سلامت سلامت پہنچ سکتے ہیں۔ نہرو نے ٹھیک کہا تھا کہ تاریخ کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کرنا مشکل ہے۔ یہ تو ایک بہتی ہوئی ندی ہے جس کی دھار کبھی نہیں رکتی۔ لہٰذا بلوچ تاریخ اب نسبتاً زیادہ مسلسل ہوگئی ہے۔ اور اگر اب بھی بلوچ تاریخ کے اندر کوئی Missing Points رہ گئے ہیں، تو وہ، عمومی طور پر سائنس کی اب تک کی محدودیت کی بنا پر ہیں۔

صرف ماقبل تاریخ کے ابواب میں ہی نہیں بلکہ ایک مسرت بھری حیرت ہوتی ہے کہ بلوچ بہت امیر اور وسیع کلاسیکل ادب کی مالک قوم بھی ہے۔ ہنگلاج مائتھالوجی سے لے کر پندرھویں اور سولھویں صدی کا بلوچ ادب ہمارے مجموعی ادب کا ایک ضخیم حصہ تشکیل کرتا ہے۔ ایسی ضخامت جو آس پاس کی کسی قوم کو میسر نہیں۔ اور اب میں دعوے سے کہتا ہوں کہ ایک فرد کے لیے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس سب کو ایک زندگی میں جمع کر پائے۔ میں اِس ایڈیشن میں اس بلوچ خزینے سے کچھ ہی موتیوں کا حوالہ دے سکا ہوں۔

اس پورے کام میں اس بات کا خصوصاً خیال رکھا گیا ہے کہ بلوچیالوجی کے غیر بلوچ

ماہرین کے حوالوں کے ساتھ ساتھ خود بلوچوں کے بیان کو بھی سامنے لایا جائے۔ خواہ یہ اورل اور تحریری شاعری میں ہو، تحریر و تحقیق ہو، یا ضرب الامثال میں۔

اس ایڈیشن میں کئی نئے باب شامل کیے گئے ہیں اور، تقریباً ہر باب کو نئے سرے سے دیکھنا اور لکھنا پڑا ہے۔ لہٰذا مکمل طور پر کتاب کا ایک نیا ایڈیشن وجود میں آ چکا ہے جو ضخامت اور مواد کے اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ 1999 کی میری وہ واحد والیوم والی کتاب، اب چھ جلدوں تک پھیل چکی ہے۔

پچھلے ایڈیشن میں قارئین کو بلوچ تاریخ کے اندر جغرافیہ کا حصہ شامل کرنا پسند نہ آیا۔ ماما عبداللہ جان نے بھی پچھلے ایڈیشن میں اس بارے میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی تھی۔ لہٰذا اِس ایڈیشن میں بلوچستان کا جغرافیہ شامل نہیں ہے۔

شاہ محمد مری

29 جنوری، 2016

1999 کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ

سچی بات یہ ہے کہ میرا کوئی ارادہ اس قسم کی کتاب لکھنے کا نہیں تھا۔ مگر بندہ کیا ہے' بقول خدائیداد ''بس اندھا محتاج، لنگڑا، لاچار'' ہے۔ انقلاب کی ضرورت اور سوشلزم کے غم میں ایسی بہت سی کتابیں سرزد ہو جایا کرتی ہیں۔

ہوا یوں کہ جب سے 1971 کے آخر میں مابدولت نے نیم پختہ انقلابی پن میں اپنے کمیونسٹ ہونے کا اعلان فرمایا تو اس وقت بلوچستان میں قوم پرستی کی سیاست کا ''مرغا'' بولتا تھا۔ اور قوم پرستی سے باہر ہر ''پرستی'' کفر تھی، روس دشمنی تھی، روسی کمیونسٹ پارٹی کی دشمنی تھی اور دھرتی، ملک، وطن اور بلوچ، الغرض، ہر اچھی چیز کی دشمنی تھی۔ ہم بے چارے کمیونسٹ بے جڑ نظر آتے تھے۔ کچھ یاروں نے انہی قوم پرست سرداروں کی صفوں میں پناہ لے کر اپنے کمیونزم کو بچا لیا تھا (یا شاید محض نیکر ہی رہ گئی تھی)۔ باقی رہ گئے ہم، تو، ہم تو ایمان کے زور سے (جوش ہوتے تو ایمان کی بجائے مثلاً ''سینہ کے زور سے'' کہہ ڈالتے) کمیونسٹ تھے۔

یہ زور آور قوم پرست لوگ دلیل بازی کے کچھ زیادہ قائل نہ تھے۔ بحث مباحثہ روایت کے ہی خلاف قرار دیا گیا تھا۔ ہماری والی یہ بکواسیات ''ڈرائنگ روم سیاست'' کے زمرے میں آتی تھی۔ لہٰذا وہ زبان استعمال نہیں کرتے تھے، مکا اور لات مارتے تھے۔ اس مُکا بازی اور لات ماری کی مثالیں سیکڑوں ہیں جو شہروں میں تو جیل اور پروپیگنڈہ کی صورت میں ہوتے تھے مگر پہاڑوں میں مخالفوں کی لاشوں، قافلے لوٹنے کی وارداتوں اور معاشی ثقافتی ناکہ بندیوں کی صورت میں

ہوتے تھے۔ مخالفین پنجابیوں کے ایجنٹ کہلائے گئے، اسلام آباد کے ایجنٹ، ایجنسیوں کے ایجنٹ

....

کہیں کہیں اور کبھی کبھی جب کوئی اور راہ نہ ہوتی تو پھر مجبوراً بحث انہیں سننا پڑتی تھی۔ مگر آپ بے شک دو گھنٹہ تک اپنا مبلغ علم جھاڑیں، اقتباسات لائیں، مثالیں دیں، دستاویزات دکھائیں، وہ ایک ہی فقرہ بول کر آپ کے سارے دلائل کا چلتن زمین بوس کر دیتے تھے۔ ان کا وہ امرت دھارا فقرہ ہوتا تھا ''بلوچستان میں طبقات نہیں ہیں''۔ بس ہم سمجھو فوت ہو جاتے تھے۔

دوسری طرف سرکار مخالف غیر بلوچ لکھاریوں نے بھی بلوچ نیشنلزم کو خُوب بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا گویا بیڑہ اٹھا لیا۔ (بیڑہ اٹھانے اور بیڑہ غرق کے تعلق کو فراموش کرتے ہوئے)۔ وہ ہمارے عوام کی متحرک خصوصیت میں اپنی خواہشیں بھی شامل کر کے گویا پریوں، طلسموں والی کہانی بنا ڈالتے۔ بڑی بڑی زبردست نظریاتی، سٹرٹیجی والے' اور یہاں کے اہم لوگوں کی طبقاتی حیثیت کے بارے میں واضح حقیقتوں سے آنکھیں بند کر جاتے تھے۔ فتوے دے دے کر ہمارے لیڈروں، سرداروں کو مافوق الفطرت مخلوق، ولی اللہ اور روحانی طاقتوں سے سرشار قرار دیا گیا اور عوام کی حیثیت بہت حد تک ثانوی قرار دی گئی۔

تب ہی سے طے کر لیا تھا کہ اس ظالمانہ طبقاتی سماج کا پول کھولنا ہوگا۔ انہی زمانوں میں ہم نے اپنی کتاب کا موضوع بھی چن رکھا؛ ''بلوچستان میں طبقاتی سماج کا ارتقا''۔ بعد میں خواہ بلوچستان میں سرداروں کی طرف سے خودکشی ہوئی یا بھٹو کی طرف سے فوج کشی، خواہ ہمارا کمیونزم خوب جوان ہوا، اور خواہ ضیاالحق کے مارشل لا نے ہمیں قوم پرستوں کے ساتھ متحدہ محاذ میں ڈال کر سیاست کروائی، خواہ افغانستان میں انقلاب ہوا اور یا پھر بالآخر سوویت یونین میں سوشلزم کا اگلا جنم آیا اور خواہ افغانستان کا انقلاب ''طالب آلود'' ہوا، ہمیں بلوچستان میں طبقاتی نظام گُند ہوتا ہوا کبھی نظر نہ آیا۔

خود افغانستان میں ہمارے اپنے محبوب انقلاب کی دیوی، ہمارے سامنے اپنی حسین بانہوں میں دنیا جہاں کے خوب صورت گلدستے لیے، سرداروں، خانوں پر لٹاتی رہی (موت آپ

کس کو کہتے ہیں!)۔ ہمارے گلے بیٹھ گئے تھے ثور انقلاب کے نعرے لگا لگا کر، آنکھیں سوج گئیں اس کے حق میں رات بھر وال چاکنگ کرتے کرتے، مگر کابل ریڈیو فیوڈلوں کے لیے ننانوے نام تراشنے میں مصروف تھا۔ ہم اپنے انقلاب کو پاک رکھنے کی جائز تگ و دو میں ایک ٹکہ تک کی خواہش رکھنے سے بھی دور بھاگتے، فیوڈلوں کو انقلابی قرار دے کر تو رخم اور سپین بولدک سے ٹرکوں کے ٹرک ''نعمتوں'' اور ''من وسلویٰ'' سے آ رہے تھے۔ اللہ جانتا ہے کہ ہم نے تب بھی سوویت کمیونسٹوں سے اپنی کمیونزم کے جائز ہونے کی سند نہیں لی بلکہ اپنے وطن میں طبقاتی نظام کی تہوں کو چاک کرنے کے عہد و پیمان کی تکمیل میں سختی سے لگے رہے۔

فقرہ فقرہ جوڑا۔ نئی بات تھی، کوئی مواد نہ تھا، کوئی ادارے، کوئی اعداد و شمار، کوئی این جی او نہ تھے۔ اور سب سے بڑی بات، کہ سماج میں کوئی مقبولیت نہ تھی............بس ہم تھے اور ہمارا اللہ تھا۔

......اور بالآخر یہ کتاب مکمل ہوئی۔

کسی مصنف کی تحریر پر ہمیشہ ایبٹ آبادیوں کے بقول ''پکَڑّ، دَھکَڑّ'' کا بڑا میدانِ کارزار لگتا ہے، اس لیے اپنا مورچہ مضبوط تر کرنے کے لیے میں نے اپنی یہ کتاب جب دوستوں میں اور ان کے سرخیل ماما عبداللہ جان کو برائے غور دکھائی، تب ہی سے گویا اس کی شہرت ہونے لگی۔ ماما تو ویسے ہی چھوٹوں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی میں گنیز بُک میں درج ہیں۔ انہوں نے مسودے کے حاشیوں میں بڑے برجستہ اور عوامی زبان میں تبصرے بھی کیے، جو کسی اگلے ایڈیشن میں شامل کر دیے جانے کے قابل ہیں۔ ایک آدھ باب شیام کمار نے دیکھا۔ پھر میرے نوجوان دوست ڈاکٹر سلیمان قاضی نے مذکر مؤنث ٹھیک کیے۔ پبلشر کو لاہور بھجوا دیا تو وہاں ایک اچھے 'پڑھے لکھے شخص ریاض احمد دانش ور نے اس کی خوب نوک پلک سنواری۔ جناب بشیر بلوچ نے بہت سی فکری، تجزیاتی اور لسانی غلطیاں درست کیں۔ اور بالآخر مجھے اس کتاب کے شائع کرانے کا گرین سگنل مل گیا۔ ''جانے دوس' چلے گا'' یہ تھا یاروں کا نچوڑا ہوا فقرہ۔ سو یہ ہے پتا اس کتاب کی آمد کی۔

یہ کتاب کسی تاریخ نویسی کے نقطۂ نظر سے نہیں لکھی گئی۔ بلکہ محض ایک سیاسی فریضہ کی بجا

آوری میں یہ ''جنرل سٹور'' مرتب ہو گیا۔ اس لیے اس کتاب کو کم از کم تاریخ کی سپیشلٹی کے فریم میں فٹ کر کے دیکھا نہیں جانا چاہیے۔ ابھی اس میں اضافے کی بڑی گنجائشیں موجود ہیں۔ اور دو چار سال مزید ریاضت کی اس میں ضرورت باقی ہے۔ مگر چوں کہ طبقاتی نکتۂ نظر سے بلوچ سماج کے ارتقا پر یہ پہلی کاوش تھی اس لیے اسے اسی حالت میں ابھی شائع ہونا چاہیے تھا۔ اس نکتۂ نظر کی بنیاد فراہم کرنے کی ضرورت ہے، آگے سکالر لوگ خود بڑھ جائیں گے۔

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری، 1999

کچھ باتیں

عبداللہ جان جمالدینی

ڈاکٹر شاہ محمد بلوچستان کے معروف دانش ور، مترجم، مؤلف اور مصنف ہیں۔ اور اب یہ ماشااللہ صحافت کے میدان میں لحظہ بہ لحظہ اور کو بہ کو مقبولیت حاصل کر رہے ہیں۔ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ بلوچستان کے لق و دق، بے آب و گیاہ اور محروم سرزمین پر ایک ایسی ہستی نے جنم لیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ان کی علم سے لگن اور کاوش کا، میرے نزدیک قابلِ ستائش، حاصل ہے۔ میں ان کی اس طرح کی سماجی معاشرتی اور علمی اور بعض اوقات ادبی کاوشوں کا عرصہ سے معترف ہوں اور ان کا یہ عمل، علم و آگہی کی کھوج میں میرے خیال میں قابلِ تقلید اور قابلِ رشک ہے۔

ایک اتوار دوستوں کے ہم راہ محفل کے مقررہ دن وہ آتے ہی ایک بڑا لفافہ میرے حوالہ کر گئے اور کہا کہ اسے دیکھ لیجیے۔ میں نے ان کی اس بات کا کوئی زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ میرے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ چند دن گزر جانے کے بعد میری نظر اس لفافے پر جم گئی۔ میں نے اسے اُٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ یقین جانیے کہ میرے لیے اس تحریر کو بنا پڑھے رکھنا آسان نہ تھا۔ اس تحریر کی دلچسپی نے مجھے مسحور کیا اور اسے ختم کیے بغیر میں رہ نہ سکا۔ ٹیلی فون پر میں نے شاہ محمد کو ان کی اس طرح کی کاوش پر مبارک باد دی اور پوچھا، مزید بھی کچھ ہے؟۔ جواب ملا کہ ابھی تو بہت کچھ ہے۔ تو میں نے ان سے کہا، لائے۔

چنانچہ وہ اقساط میں کتاب کے مسودے کو میرے حوالہ کرتے رہے اور میں نے بھی لگن اور انہماک سے اُسے پڑھا اور پڑھتے پڑھتے اپنے مختلف جذبات اور تاثرات حاشیوں میں اُردو اور انگریزی میں اپنے ریمارکس کی صورت میں لکھتا رہا۔ بالآخر میں نے اسے ختم کیا مگر تشنگی باقی رہی۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ شاہ محمد اپنے طالب علمی اور اس کی سیاست کے دوران سماجی علوم کا گہرا مطالعہ کرتے رہے ہوں گے۔ اور عرصہ سے اپنے ذہن میں بلوچستان کے سماجی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی، تاریخی اور ثقافتی مسائل پر لکھنے کا ارادہ کیے ہوئے ہوں گے اور اس مقصد کے لیے وہ بہت گہرا مطالعہ کرتے رہے ہوں گے۔ کیوں کہ اس طرح کی تحقیق اور تحریر اس طرح کی لگن کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر شاہ محمد سماج کے سائنسی علوم کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ وہ تاریخی مادیت، جدلیات اور زندگی کے بارے میں سائنسی آؤٹ لک کے نظریات سے بہ خوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں کیوں کہ ان کی تحریر ان باتوں کی غماز ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد بلوچستان کے اس نسل پرستانہ اور انتہا پسندانہ ماحول میں قوم پرستی کے انتہا پسندانہ خیالات سے مبرا ہیں اور ان کی فکر ایسے خلفشار اور ملغوبوں سے پاک دِکھتی ہے۔ ان کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ قبائلی اور علاقائی بلند بانگ دعووں اور بڑھ چڑھ کر اپنی قبائلی اور نسلی برتری کو جتلانے کے برعکس اصل حقائق کی کھوج لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ حالاں کہ ایک مری کے لیے جو اس سنگلاخ اور طویل بلوچستان کی سرزمین میں جہاں سیاست اور سیاسی لیڈر اس طرح کی فکر اور گفتگو اور سیاسی بیانات میں ایسی باتوں سے اپنے آپ کو دور نہیں رکھ سکتے۔ بعض اوقات تو سیاسی لیڈر جو اپنے آپ کو ترقی پسند اور عوام کے سچے درست ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، ایسی باتیں کرتے ہیں، سیاسی بیان داغتے ہیں جو مظلوم، محروم اور مسائل میں اُلجھے ہوئے ان پڑھ اور محروم عوام میں ایک دوسرے سے نفرت اور حقارت کا باعث بن جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات ان میں تصادم اور اموات واقعہ ہو جاتی ہیں۔

کتاب کی ابتدا میں رسماً بلوچستان کا جغرافیہ یعنی عرض بلد طول بلد، زمین کی ساخت اور آب و ہوا بیان ہوئی ہے۔ جس کی آج کل چنداں ضرورت نہیں۔ کیوں کہ بلوچستان پر لکھنے والا

ہمیشہ ایسا ہی کرتا ہے۔ اور قاری کو اکثر ہر کتاب میں یہی کچھ پڑھنے کو ملتا ہے۔

مگر شاہ محمد نے اپنے پُر لطف طرزِ بیان میں آگے چل کر ہر موضوع کو اس طرح دلچسپ اور انوکھے پیرائے میں پیش کیا ہے کہ قاری بور نہیں ہوتا۔ پڑھنے کو بہت ساری نئی چیزیں مل جاتی ہیں۔

کتاب بلوچستان اور بلوچوں سے متعلق ہے۔ اگرچہ موجودہ بلوچستان میں ایک اور بڑی اکثریت پشتون قوم کی آباد ہے۔ جسے بالجبر یا تاریخی جبر سے بلوچستان کے ساتھ ملا لیا گیا ہے۔ یہ کام سابقہ دور میں برطانوی سامراج نے اپنی سامراجی ضروریات کے لیے کیا تھا۔ اور اس طرح اس دوسری بڑی اکثریت کو اپنے تشخص سے بے بہرہ کر دیا ہے جو کہ اس صوبے کی دونوں اکثریتوں کی ترقی میں رکاوٹ کا باعث ہے۔ شاہ محمد کی تحریر واضح طور پر اس زیادتی کے حق میں نہیں اور وہ کھلے دل سے بلوچستان میں آباد تمام انسانوں کی آزادی، ترقی اور خوش حالی کے طلب گار ہیں۔ کتاب کے آخر میں انہوں نے واشگاف الفاظ میں اپنی ان نیک تمناؤں کا اظہار کیا ہے اور اس صورت حال کو ختم کرنے کے لیے عالمانہ اور انسان دوستانہ طریقے سے تجاویز پیش کی ہیں۔

انسان وہی اچھا، اور عالم اور دانش ور وہی قابلِ احترام ہوتا ہے جو سب انسانوں کا بھلا چاہتا ہو۔ اور یہی فکر انسانی مسائل کو حل کرنے کا باعث ہو سکتی ہے۔

بلوچ اور بلوچستان سے متعلق ڈاکٹر شاہ محمد نے کافی مواد اور معلومات اکٹھی کی ہیں۔ جو قاری کے لیے نئی اور دلچسپ ہیں۔ مگر بلوچ اور بلوچستان بہت وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں او ر منتشر ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح اور حقائق پر مبنی تحریر پیش کرنے کے لیے چند اہم وسائل درکار ہیں جو شاہ محمد کی دست رس سے باہر رہے ہیں۔ اوّل یہ کہ اس تمام سر زمین کو دیکھنا جہاں بلوچ آباد ہیں اور جسے بلوچستان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی رسومات، قبائلی انداز زیست، لباس، لہجے اور رہنے سہنے کے طریقے دیکھ لیے جائیں۔ برطانوی دور میں اس وقت کی حکومتوں نے اپنی ضرورت کے مطابق ایسا پروگرام تشکیل دے کر جہاں جہاں ان کی حکومت کے زیرِ طابع علاقے تھے۔ وہاں کے اضلاع کے بارے میں ڈسٹرکٹ گیزیٹرز تیار کر کے چھپوا دیے تھے۔

ڈاکٹر شاہ محمد نے تقریباً تمام مواد پڑھ کر نظر سے گزار کر اپنی اس علمی اور تحقیقی تحریر میں اس سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ شاید ہمارے بلوچستان پر اب تک جو کتابیں کسی بھی زبان میں چھپی ہیں، حتی المقدور انہیں پڑھا ہے اور ان کے حوالے کتاب میں دیے ہیں۔ شاہ محمد نے صرف ان کتابوں کو پڑھ کر ان کے حوالے نہیں دیے ہیں، بلکہ اپنی فکر اور دانش کے مطابق ان کو پرکھا ہے اور اپنی رائے دی ہے۔

شاہ محمد کا تعلق بلوچستان کے مشہور اور معروف قبیلہ مری سے ہے۔ ظاہر ہے ہر قبائلی کو اپنے قبائلی مسائل، رسومات، آداب، ثقافت کے بارے میں زیادہ آگاہی ہے، اگر وہ ان کے درمیان زندگی گزارتا ہو۔ اس لیے انہوں نے اپنی قبائلی زندگی پر سیر حاصل حقائق اور معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ اس عمل میں انہوں نے پیہرسن کی مشہور کتاب Social Organization of Marri Baloch کو بھی بغور پڑھا ہے اور اس کے بارے میں کافی کچھ لکھا ہے۔ مصنف نے اپنی کتاب کے ذریعہ پیہرسن کی ناگہانی موت سے جو کام نیم تمام رہ گیا تھا، اسے مزید آگے بڑھایا ہے۔ میرا مطلب مری قبائلی تشکیل کے بارے میں۔

کتاب میں سماجی اور معاشرتی مسائل پر بہت تفصیل سے دھیان دے کر کام ہوا ہے۔ مثلاً کوئلہ کی کانوں کے مزدوروں کی زندگی اور انسان سوز رویوں پر شاہ محمد نے ایسا کام کیا ہے جو علمی لحاظ سے انتہائی گراں مایہ اور قابلِ تعریف ہے۔ شاہ محمد نے اس قدر تفصیل سے ان مظلوموں کی حالت زار پر تحقیق کر کے اسے منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی ہے کہ پڑھتے وقت مجھے فریڈرک اینگلز کی کتاب Condition of working Class in England یاد آ گئی۔ اینگلز نے خود جا کر اُن مزدوروں کی زندگی، رہائش، اجرتوں، اخلاق اور صحت کے بارے میں سب کچھ معلوم کیا اور کتاب لکھ دی۔ جب کہ شاہ محمد نے ان مقہوروں کی جو کئی فٹ زمین میں جا کر پیٹ پالنے کے لیے اور اپنے بچوں کو زندہ رکھنے کی جدوجہد کرتے ہیں، زندگی کے بارے میں مواد اکٹھا کر کے پڑھنے کے لیے پیش کیا ہے۔

اسی طرح شاہ محمد نے بلوچستان کی خواتین کی زندگی پر انتہائی تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ اور

ان کی زندگی کے نہایت تاریک گوشوں کو سامنے لایا ہے۔

ایک مرتبہ لاہور میں خواتین کے ایک اجتماع اور ورک شاپ میں مجھے شمولیت کا موقع ملا۔ اس میں ڈاکٹر نور جہاں پانے زئی صاحبہ اور مسز رب اور ڈاکٹر اللہ دین صاحب کی صاحبزادی بھی شامل تھیں بلوچستان سے۔ ڈاکٹر عطیہ صاحبہ کے ویمن ونگ Women Division نے اس کا اہتمام کیا تھا۔ نور جہاں کی زبانی پتہ چلا کہ بلوچستان کی خواتین کے بارے میں ایک نہایت بھیانک رپورٹ ویمن ڈویژن والوں نے تیار کی تھی، جسے بہ وجوہ منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ ہمارے معاشرے میں ہم اپنی غلاظتوں اور گناہوں کا سامنا نہیں کر سکتے۔ انہیں چھپائے رکھتے ہیں۔ تا کہ ہمارا سماج مزید خراب ہوتا جائے۔ کاش کہ ڈاکٹر شاہ محمد اس تحقیقی رپورٹ کو حاصل کر کے اسے مسعود کھدر پوش کی اس رپورٹ کی طرح منظر عام پر لاتے جو انہوں نے سندھ کے ہاریوں سے جو مظالم روا رکھے جاتے رہے تھے، اس کے بارے میں تھی۔ سچ کو ہمیشہ منظر عام پر لایا جائے تا کہ اہلِ بصارت اور انسان دوست حضرات اس سے واقف ہو کر سماج کی اصلاح کر سکیں۔

کتاب میں ایک بہت اہم مسئلہ پر بھی بحث ہوئی ہے جو آج کل سیاسی ورکروں اور اہلِ دانش میں موضوعِ گفتگو اور بعض اوقات اس پر سیاسی لیڈر بے لاگ طریقوں سے بیان داغ دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ قبائلی نظام اب بھی بلوچوں اور بلوچستان کے لیے بہترین نظام ہے۔ اس کا جرگہ، سرداری نظام اور اس کے دیگر طور طریقے سماج کے لیے ضروری ہیں اور یہی سماجی ترقی کی طرف لے جاسکتے ہیں۔ ان کے بغیر ہمارا سماج ترقی نہیں کر سکتا اور بلوچ اور بلوچستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑ جائیں گے۔ دوم یہ بات کہ ہمارے سماج میں طبقے نہیں، اور فیوڈلزم کا وجود ہمارے یہاں نہیں ہے۔

ڈاکٹر شاہ محمد صاحب نے ان مسائل پر بہت خوب صورت انداز میں بحث کی ہے اور تاریخی حقائق پر مبنی مثالیں دی ہیں۔ بات یہ ہے کہ طبقے ضرور ہیں۔ اگر نہ ہوتے تو کیوں کچھ لوگ اس کے حق میں ہوتے اور کچھ اس کے مخالف۔ میرا مطلب کچھ لوگ اس فکر اور ان رویوں کی حمایت کرتے ہیں۔ ان میں بلوچ عالم و دانش ور شامل ہیں۔ کئی اور سیاسی لیڈر کارکن اور شخصیات اس کے

برعکس کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آدمی میں مفاد پرستی بہت شدت سے چھپاں ہوتی ہے۔ وہ ہر مسئلے کو اپنے مفاد کی عینک سے دیکھتا ہے۔ لہٰذا جس کے مفاد کو طبقوں میں امتیاز کرنا ساز گار نہیں ہوتا وہ ایسا ہی کہے گا کہ ہم جیسے ہیں ویسے ہی ٹھیک ہیں' اس میں رڈ و بدل عوام الناس کے مفاد میں نہیں۔ اور وہ یہ باتیں مظلوم، محروم اور علم سے بے بہرہ عوام میں اپنی سیاسی پارٹی اور کارکنوں کے ذریعہ پھیلاتے ہیں اور ان کے ذہنوں کو خلفشار میں مبتلا کرتے ہیں۔

بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس طرح کی مفاد پرستی سے اپنے کو دور رکھتے ہیں۔ اور اپنے قلم، تحریر، تقریر اور فہم سے عوام الناس کو اس طرح کی جادوگری سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اپنا انسانی فرض سرانجام دیتے ہیں۔ ورنہ کہنے کو تو ایسی پارٹیاں ہیں جو عوام کی باتیں اپنے سیاسی پلیٹ فارم سے کہتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو عوام دوست اور عوامی فکر کے علم بردار بتلا کر عوام کو دھوکہ دے کر اپنا اُلو سیدھا کرتے ہیں۔ اپنی لیڈری چمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تا کہ الیکشن کے لیے عوام کے ذہن کو اپنے حق میں ڈھال دیا جائے۔

مصنف نے انگریز دور کے اور ان کی اہم پالیسیوں کے بارے میں وضاحت اور تفصیل سے لکھا ہے اور ان پر رائے زنی کی ہے۔ مثلاً اس دور کی اہم شخصیت سر رابرٹ سنڈیمن اور اس کی پالیسیوں کے بارے میں اور اس سسٹم کے بارے میں جسے سنڈیمن سسٹم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، بہت روشنی ڈالی ہے۔ رابرٹ سنڈیمن تنظیم کاری اور انتظامی معاملات میں جینئس (نابغہ) تھے۔ چاہے اسے ایول جینئس ہی کہا جائے۔ مگر برٹش پالیسی کو بلوچستان اور یہاں کی سرحدات پر جس طرح اس نے مستحکم کیا، وہ حیران کن ہے۔ اس نے قبائلی نظام، سرداروں اور یہاں کے مروجہ قبائلی قوانین کو جو جرگہ کے نام سے جانا جاتا تھا، اسے ایسے انداز میں ردّ و بدل کر کے اپنے مفاد میں کیا جس سے قبائل اور ان کے سردار اور قبائلی عصبیت اور سرتابی کے باوجود بالکل رام ہو گئے اور آج تک جو انتظامیہ کے اور مرکز کے ہاتھوں کھلونا بنے آرہے ہیں۔

شاہ محمد نے سماجی ترقی جو برٹش دور میں ہوتی رہی ہے۔ یعنی جو معاشرتی ڈویلپمنٹ ہوتی رہی، انہیں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یعنی پہلے ریلوے لائین کہاں سے بچھادی گئی۔ اور کب؟ پہلا

کارخانہ کہاں اور کس چیز کا قائم ہوا۔ پرنٹنگ پریس اور اخبار پہلے کون سے لگے اور چھاپے گئے۔ مزدور تحریک کی بلوچستان میں کس طرح ابتدا ہوئی اور کب؟ وغیرہ وغیرہ۔

بلوچستان سے متعلق مختلف شعبوں اور بلوچستانی موضوعات پر مغرب میں اور یونیورسٹی میں پاکستان سٹڈی سینٹر اور بلوچستان سٹڈی سینٹر میں جو تحقیقی کام ہو رہا ہے یا مستقبل میں ہوگا، اس کے لیے یہ تصنیف اہم و مفید ہے۔ اور ہمیشہ اس سے استفادہ ہوتا رہے گا۔ اگر آگے جا کر اسے انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو یہ کتاب مزید مفید ہو سکتی ہے۔

غرض ڈاکٹر شاہ محمد نے ایک اچھے علمی کام کا آغاز کیا ہے۔ مگر یہ موضوع اتنا اہم اور وسیع ہے کہ اس پر مزید کام کی بہت ضرورت ہے۔

اُمید ہے ڈاکٹر صاحب یہیں اسے ختم نہیں سمجھیں گے اور اس عملی کام کو مزید آگے بڑھائیں گے اور دوسرے دانش وروں اور محققین کو اس عمل کی طرف متوجہ فرمائیں گے۔

انشااللہ!

رخِ نگارِ زندگی نقاب در نقاب ہے
نہ ہو گا ختم سلسلہ مگر نقاب اٹھائے جا

جوشؔ

باب یک

بلوچستان کی جیالوجیکل ساخت

تاریخ، ماضی کی کہانی کی حیثیت سے حتمی تبدیلیوں کے تسلسل کا ایک بیانیہ ہے۔ ہماری انسانی تاریخ کا مکان ہماری زمین ہے۔ جو زمان کے اعتبار سے چار ارب ساٹھ کروڑ سال پرانی ہے۔

سائنس میں ''بِگ بینگ'' (بینگ کی بڑی آواز) کا لفظ بہت استعمال ہوتا ہے۔ سائنس دانوں کا متفقہ خیال ہے کہ تیرہ ارب سال قبل ایک بہت بڑے کائناتی دھماکے کے نتیجے میں آج کی یہ دنیا بن گئی۔ اس سے قبل تو سارا مادہ اور انرجی ایک ناقابلِ تصور گاڑھے نکتے کی صورت میں موجود تھا۔ اُس دھماکے کے بعد یہ دنیا پھیلنے لگی۔ پھیلاؤ کا یہ عمل آج بھی جاری و ساری ہے۔ اس پھیلاؤ میں مادہ بکھرنے لگا۔ یہ عمل ہر جگہ یکساں نوعیت کا نہ تھا۔ گیسوں کے زیادہ ارتکاز والے ٹکڑوں نے ''گرے وِٹی'' کی قوت سے زیادہ گیسوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس کے نتیجے میں کہکشاں وجود میں آ گئے۔

جہاں تک ہمارے نظامِ شمسی کے وجود میں آنے کی بات ہے تو عام اتفاق اس بات پہ ہے کہ گیس کا ایک بہت بڑا بادل چھوٹا ہونا شروع ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گرے وِٹی کی وجہ سے گیس پارٹیکلز نے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا۔ گیسوں کی کثیر مقدار نظامِ شمسی کے مرکز کو چلی گئی اور سورج بنالیا۔

علمِ فلکیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ بہت بہت زمانہ قبل زمین اور دوسرے ستارے سورج کا حصہ تھے۔ سورج اُس وقت بھی ایسا ہی تھا جیسے کہ اب ہے۔ یعنی شعلے بھڑکاتا ہوا، خوفناک

انداز میں گرم ایک مرکزہ۔کبھی کبھی سورج کے معمولی ٹکڑے ڈھیلے پڑ کر باہر ہوا میں تیز دھارے کی طرح نکلتے رہے۔سورج کے گرد چکر لگاتے ہوئے یہ ٹکڑے سیاروں کی حیثیت سے ٹھوس بن گئے جن میں ہماری زمین بھی شامل ہے۔..........زمین جو ایک وسیع کائنات میں محض ایک معمولی نکتے جتنی ہے۔(1)

شروع والی زمین مادہ کا ایک یکساں جسم تھی جس کی سطح پر کوئی براعظم نہ تھے،کوئی سمندر نہ تھے۔نہ ہی گہرائی میں اندرونی زون موجود تھے۔کم سن زمین شروع میں نوخیز نظامِ شمسی کے بے ترتیب و بے ہنگم اجسام کی بھاری سنگباری میں رہی۔اس سے اس کی سطح پر بے انتہا گرمائش ہوئی۔ نیز اس کے اندر بھی ریڈیو ایکٹو میٹریل کے زوال کے نتیجے میں زبردست حرارت پیدا ہوتی رہی۔ اس کے نتیجے میں ہماری زمین حل ہوگئی اور بھاری مواد مرکز میں ڈوبتا چلا گیا اور ہلکا مواد اوپر آتا گیا۔اس طرح زمین کا اندرونی حصہ،سطحوں میں ترتیب پاتا گیا۔جو کہ ایک دوسرے سے طبعی اور کیمیائی دونوں لحاظ سے فرق رکھتا تھا۔علاوہ ازیں،گیسیں بھی اندر سے باہر کی طرف نکلنا شروع ہوئیں جن سے بالآخر فضا اور سمندر بن گئے۔ ہلکے مواد کے اوپر اُبھر آنے سے اندرونی گرمائش اوپر آ گئی۔ زمین اپنی سطح پر سرد ہوتی گئی اور براعظموں کی شکل میں ٹھوس بنتی گئی۔مگر ابھی بھی مرکز میں ہماری زمین دانتے کی دھکتی دوزخ جیسی ہے۔(2)

1۔رقصِ درویش

سائنس کی دریافت کے مطابق نظامِ شمسی کے جو نو ستارے سورج کے گرد اپنے مقررہ مدار میں گھومتے ہیں اُن میں سے ایک ہماری زمین ہے۔اِن نو میں سے چار اندر والے سیارے ہیں: مرکری(رومنوں کے ہاں خداؤں کے پیغامبر کا نام ہے)،وینس(محبت اور حسن کی دیوی)، زمین......،اور مارس(جنگ کا دیوتا)۔یہ چٹانوں والے سیارے ہیں۔بقیہ پانچ باہر والے سیارے ہیں: پیٹر،سیٹرن(ٹائم کا دیوتا)،یورینس،نیپچون اور پلوٹو۔یہ گیس والے سیارے ہیں۔

چار اندرونی چٹانی سیاروں میں سب سے بڑا سیارہ ہماری زمین ہے۔

دلچسپ بات ہے کہ سارے ستاروں کو دیوتاؤں کے نام دیے گئے۔اور ہفتے کے سارے دن،انہی ستاروں کے نام سے ہیں۔Saturday یعنی ہفتہ saturn (ٹائم کا دیوتا) کے نام پر ہے۔Sunday اور Moonday سورج اور چاند کے نام ہیں،Wednesday wodin کا دن ہے،Thor Thursday کا دن ہے اور Friday محبت کے دیوتا Freya کا دن ہے۔آخر الذکر تینوں دن حملہ آور دیوتاؤں کے نام پر ہیں۔(3)

اور یہ سات کا ہندسہ مافوق الفطرت ہندسہ بن چکا ہے۔سات آسمان،سات زمین، ساتویں آسمان پر ستارے جڑے ہیں،مسیحیت میں خدا کے آرام کا دن ساتواں ہے،سات کا ہندسہ خوش قسمت ہندسہ(Lucky Seven) ہوتا ہے۔سر میں سات سوراخ ہیں،چاکرست گھرا میں دفن ہے،شہ مرید نے اپنے باپ کی ماری جوتی کو سات بار زیارت کیا،اونٹ سات جگہ سے حلال کیا جاتا ہے،مقدمہ سات جگہ تک لے جایا جاسکتا ہے۔(بلوچی ضرب المثل)۔

ہم سورج سے ڈیڑھ سوملین کلومیٹر کے فاصلے پر رہتے ہیں۔اور یہ تو معلوم ہی ہے کہ ہم سورج کے گرد ہمہ وقت طواف کی صورت ہوتے ہیں۔ہمیں اس کے گرد ایک چکر پورا کرنے میں تقریباً ساڑھے 365 دن لگتے ہیں۔ان چکروں کے چکر میں ہم سورج سے اپنے لئے ضرورت کی حرارت لیتے ہیں۔پانی تو خود ہمارے پاس موجود ہے۔

مگر ہم تو بہ یک وقت کرکٹ کی پھینکی گیند کی طرح خود اپنے گرد بھی گھومتے رہتے ہیں۔ اپنے ہی گرد اِس ''رقصِ درویش'' کے ایک چکر میں ہمیں 24 گھنٹے لگتے ہیں۔جو حصہ سورج کے سامنے آئے گا،دن لائے گا اور جو حصہ پیچھے ہوگا وہاں رات ہوگی۔یہ الگ بات ہے کہ ہم روزمرہ گفتگو میں زمین کے گھومنے کی بات نہیں کرتے بلکہ سورج کے نکلنے ڈوبنے(روش ٹِک،روش ٹُب) کی بات کرتے ہیں۔

آیئے ہم چکر کاٹنے کے نظریے کے مالک مولانا روم کا ایک اچھا ٹکڑا پڑھ لیں:

میں کھڑا ہوتا ہوں، اور میرا وجود
سَو وجود بن جاتے ہیں

وہ کہتے ہیں میں گھومتا ہوں تمہارے گرد
بکواس ہے ، میں اپنے گرد گھومتا ہوں

مگر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے بہت آرام سے مان لیا کہ زمین ساکت نہیں ہے۔ ہم صدیوں تک اپنی پرانی بات اور نظریے پر ڈٹے رہے کہ زمین ساکن ہے، زمین مرکز ہے اور سب کچھ یعنی سورج، چاند، ستارے اِسی کے غلام اور باندیاں ہیں اور اِسی کے گرد گھومتے ہیں۔ ذرا گیلیلو کو یاد کیجیے جسے آج سے پانچ سو سال قبل 1633 میں چرچ والوں نے یہ بات کہنے پر سزا دی کہ ''زمین سورج کے گرد گھومتی ہے''۔ چرچ والوں نے اعلان کیا:

''یہ نظریہ کہ زمین نہ تو دنیا کی مرکز ہے اور نہ یہ ساکت ہے بلکہ روزانہ کے حساب سے یہ گھومتی ہے، بکواس نظریہ ہے اور بالکل باطل ہے''۔

گیلیلیو کی کتابوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اُس کی جان بخشی اُس وقت ہوئی جب اُس نے اِن ملاؤں کے سامنے اپنے نظریے سے تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔ دو سو سال تک اس کی کتابوں پر پابندی لگی رہی۔ پادریوں نے اس کی کتابیں پڑھنے والوں پہ فتویٰ لگا دیا تھا کہ انہیں لافانی ارواح کی ہیبت ناک سزا ملے گی۔ گیلیلو کی کتابوں پر 1832 میں پابندی ہٹی۔

ہماری زمین کا ستر فیصد حصہ سمندر ہے۔ بقیہ تیس فیصد پہ ہم رہتے ہیں۔ ہماری زمین کو اگر گہرائی کی طرف کھودتے جائیں تو 35 کلومیٹر تک سخت خشک اور نسبتاً ہلکے وزن کا چٹانی پتر چڑھایا ہوا غلاف (Crust) ہی ملے گا۔ سارے درخت' جھاڑیاں' چرند پرند، درند، سمندر، پہاڑ، ہوا، انسان اور انسانی سرگرمیاں سب اسی غلاف پر قائم ہیں۔ جس نے کہ تین ہزار کلومیٹر موٹے سیال چونے (Mantle) کو ڈھانپ رکھا ہے جو کہ ٹھوس اور نیم ٹھوس مواد پر مشتمل ہے۔ (Mantle) نامی پیاز کے اِس موٹے چھلکے کے نیچے سوا دو ہزار کلومیٹر موٹے پگھلے ہوئے چٹانی مواد کی تہہ ہے جسے باہر کا گُودہ (Outer Core) کہتے ہیں۔ اور اُس چھلکے کے اندر زمین کا مغز یعنی اندرونی گُودہ (Inner Core) ہے جو کہ لوہے اور nickle سے بنی ٹھوس گیند ہے۔

2۔ آسٹریلیا کی سسّی، مکران کا پنّوں

ہمارا بلوچستان دو بلوچستانوں سے مل کر بنا ہے۔ ملینوں سال قبل (جب ہم انسان ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے) آج کے مغربی بلوچستان کی چاہت میں زمین کا ایک بہت بڑا ٹکڑا' قطبِ جنوبی والی برف سے منجمد زمین سے علیحدہ ہو گیا اور کچھوے کی رفتار سے یوریشیا کے سمندر کے جنوبی ساحل پہ موجود گرم اور دھوپ بھرے مغربی بلوچستان سے ملنے چل پڑا۔ چلنا کیا تھا نیم مائع مواد پر تیرتا ہوا آیا۔ مگر یہ تیراک' ایک انجن والا چھوٹا سا جہاز نہ تھا بلکہ زمین کا ایک بہت بڑا اور بھاری ٹکڑا تھا جسے ''براعظم'' کہتے ہیں۔ اُسے اپنے محبوب تک پہنچنے میں ملینوں برس لگ گئے۔ اس نے آ کر زمین کے ایک اور بڑے ٹکڑے کو ہزاروں میل پرے دھکیل دیا اور خود مشرقی بلوچستان بن کر مغربی بلوچستان کے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں پورا برصغیر پاک و ہند مشرقی بلوچستان تک ہند آسٹریلیائی پلیٹ پر مشتمل ہے۔ (4) ارے ہم انسان ابھی تک پیدا نہ ہوئے تھے ورنہ ہم ضرور کوئی شاعری بُنتے، کوئی عقیدے بنا لیتے یا کم از کم کوئی ضرب المثال ہی وضع کرتے۔

لیکن یہ کام ہمارے دو مصنف دوستوں نے کر دکھایا۔ ڈاکٹر محمود صدیقی اور محترمہ عظمیٰ محمود نے اِس سائنسی مظہر کو ایک بہت ہی خوبصورت ادبی رنگ عطا کر دیا:

''زمانے بیتے کہ قطب جنوبی کی منجمد سرزمین (جہاں سورج شاذ و نادر ہی طلوع ہوتا تھا) کے دیوتا کی ملاقات سمندر پار کی ہمہ وقت چمکتے سورج کی سرزمین کی دیوی سے ہوئی۔ دیوتا' دیوی کے آسمانی حسن سے اس قدر مسحور ہوا کہ اسے دیوی سے محبت ہو گئی۔ دیوی نے گو کہ منجمد زمینوں کے دیوتا کو پسند کیا مگر وہ شادی کر کے اپنے ہمہ وقت چمکتے سورج والی سرزمین کو چھوڑنا نہ چاہتی تھی۔ لہٰذا اس نے شرط رکھی کہ وہ دیوتا سے صرف اُس وقت شادی کرے گی جب وہ اپنی محبت ثابت کرے اور اپنی پوری سلطنت کو دیوی کے گرم اور روشن ملک کے قریب لائے۔ دیوتا نے اس کی شرط مان لی اور واپس اپنی سلطنت پہنچ کر، اپنے تخت کو اغوا کر لیا۔ اس نے اپنے وسیع ترین سلطنت سے ایک ٹکڑا پہاڑ لیا اور زمین کے اس ٹکڑے پہ سوار سمندر پار اپنا سفر جاری رکھا۔ زمین کا ٹکڑا اپنی بھاری وزن کے سبب کچھوے کی رفتار سے تیرتا رہا۔ جس سے دیوتا کو سمندر کے دوسرے کنارے پہنچنے میں

ملینوں سال لگ گئے۔ یوریشیا کے ساحل تک پہنچنے پر اس نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ کے پڑوس میں واقع سرزمین پر تو دیوی کے ایک اور عاشق کا قبضہ ہے۔ دیوتا حسد سے اس قدر مغلوب ہوا کہ اس نے رقیب کے علاقے کو دور دھکیلا اور اپنی زمین کے لئے جگہ بنائی تا کہ اپنی محبوبہ کی سرزمین کے پہلو میں ہمیشہ کے لئے لنگر انداز رہے۔ اس وقت سے وہ دونوں خوش وخرم رہ رہے ہیں''۔

''آج' دیوی کی آبائی سرزمین کو''مغربی بلوچستان'' کہتے ہیں اور دل پھینک دیوتا کے علاقے کو''مشرقی بلوچستان'' کہا جاتا ہے۔ محبت کے حکم سے زمین کے دونوں ٹکڑے ایک واحد جغرافیائی یونٹ میں ضم ہوگئے ہیں جسے آج کا''بلوچستان'' کہا جاتا ہے'(5)۔

مگر یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ دیوتا (اور اُس کی زمین کا ٹکڑا یعنی پلیٹ) کوئی وفا کا پیکر ہے 'اور اب وہ شکر صبر کر کے آرام سے محبوبہ کی آغوش میں بیٹھا ہے۔ نہیں، یہ پچھوا ابھی بھی شمال کی طرف سرک رہا ہے اور اپنے شمالی کنارے سے یوریشیا کو کچکوکے لگا تا جا تا ہے۔

ایک ہم ہی کیا' ساری دنیا کی زمین تیرا کی میں اپنے پرانے رفیقوں سے بچھڑتی اور نئے دوست بناتی رہی ہے۔ بچھڑتے وقت کچھ آنسو گرتے ہونگے یا نہیں، مگر یہ تو حتمی بات ہے کہ پچھلے سے بچھڑتے وقت بھی اور نئے سے بغلگیر ہوتے وقت بھی کچھ تھرتھلّی مچتی ہے۔ اس تھرتھلّی کو ہم بلوچی میں''زمیں چنڈ'' اور اردو والے زلزلہ کہتے ہیں۔ اور اسی بغلگیری (ٹکراؤ) سے دونوں کے بیچ مٹی اور چٹان بھینچ جاتے ہیں اور ٹنوں کے حساب سے اکھڑ کر اوپر کو دیوہیکل ڈھیریاں بناتی ہیں۔ انہیں ہم کوہ یا پہاڑ کہتے ہیں جو دو پلیٹوں کے بغلگیر ہونے کے ساتھ ساتھ ابھرتا ہوا سلسلۂ کوہ بناتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مشرقی بلوچستان نامی نو آمدہ پلیٹ مغربی بلوچستان نامی دیسی پلیٹ کے دندانوں میں فٹ ہونے کی لگاتار کوشش میں لگا رہتا ہے جس سے اُن کے اوپر کی منزل پہ موجود نباتات وحیوانات لڑھک لڑھک جاتے ہیں۔ یہ سلسلہ نامعلوم زمانوں سے جاری ہے اور نامعلوم زمانوں تک جاری رہے گا۔

زمین کا وہ ٹکڑا جس پر مشرقی بلوچستان واقع ہے ایک زمانے میں اُس پلیٹ پر واقع تھا جس پر ہمارے ساتھ انڈیا، آسٹریلیا، انٹارکٹیکا، افریقہ اور جنوبی امریکہ موجود تھے۔ 144 ملین سال

قبل یعنی جیوراسک عہد میں اِس (سُپر کانٹی ننٹ) کے مختلف حصے باہم دور ہونے شروع ہوئے۔ ہمارا علاقہ شمال کو سرکتا چلا آیا اور 58 سے 30 ملین سال قبل یوریشین براعظم سے جاملا۔(6)

انڈین کانٹی ننٹل پلیٹ جو کہ آج والی پلیٹ سے بہت بڑی تھی، اس نے 88 ملین سال پہلے بحیرہ ہند میں سے حرکت کرنی شروع کی۔ اتنی کاہلی اور نرم رفتاری کے ساتھ کہ یہ 65 ملین برس قبل یعنی 230 لاکھ سال بعد جا کر یہاں کی ایشین پلیٹ سے ٹکرائی اور ہیبت ناک تصادم سے اُس کے نیچے دھکیلی گئی۔ بلوچی تھیریم کے زمانے میں (35 ملین سال قبل) دباؤ نے ٹکڑے اور تہیں پیدا کیں جو کہ ہمالیہ کی ابتدائیں تھیں۔ ایک زرخیز میدان پیدا ہوئی جو کہ جلد ہی گھنے جنگل سے ڈھپ گئی۔ بلوچی تھیریم اسی گھنے جنگل پہ پلتا تھا۔

بلوچی تھیریم کے زمانے سے انڈین کانٹی ننٹ کا ایک ہزار کلومیٹر ایشیاء کے نیچے غائب ہوگیا۔ اُس وقت بگٹی پہاڑ موجودہ جگہ سے 15 ڈگری جنوب کی طرف تھے، موجودہ زمانے کے ملائیشیا کے عرض بلند پر۔ آج، کانٹی ننٹل پلیٹیں ابھی تک ایک سنٹی میٹر فی سال کی رفتار سے حرکت میں ہیں، جن کے کناروں کے باہم ٹکرانے سے اُس علاقے میں زلزلے آتے ہیں۔

انسانی تاریخ تو فطرت کی تاریخ کا تسلسل ہے۔ نامیاتی ارتقا اور کلچر میں ترقی کے بیچ، ایک مناسبت موجود ہے۔

ملینوں سال تک زمین پر کوئی مرد موجود رہا اور نہ کوئی عورت رہتی تھی۔ انسان کی آمد سے قبل یہاں صرف جانور تھے اور جانوروں سے قبل ایک زمانہ ایسا تھا جب زمین پہ کسی قسم کی زندگی موجود نہ تھی۔ اس لئے کہ بہت عرصہ تک زمین اس قدر گرم ہوا کرتی تھی جس پہ کوئی جاندار رہ ہی نہیں سکتا تھا۔(7)

سائنس نے اب ایسے ترقی یافتہ طریقے دریافت کر لئے ہیں جن سے آثارِ قدیمہ اور چٹانوں سے ملنے والے فاسلز (Fossills)، (ہڈیاں جو پتھر بن چکی ہیں) کی عمر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قدیم انسانی تاریخ کے کوئی تحریری شواہد موجود نہیں ہیں۔ نہ ہی اُس زمانے کے لوگوں

کے نام موجود ہیں، نہ اُن کے انفرادی کارنامے دستیاب ہیں۔ نہ یہ معلوم کہ وہ کونسی زبان بولتے تھے ۔ مذاہب تو خیر بہت بعد میں آئے۔ قدیم انسانی تاریخ اپنے جغرافیائی اور طبعی حالات والے علاقے میں صرف اور صرف پیداوار کرنے والی سماجی قوتوں کی فاسل (Fossil) شدہ نشانیوں میں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔ قدیم کی کھوج میں آرکیالوجی سب سے مددگار سائنس ہے۔ آرکیالوجی معاشی نظام میں تبدیلیوں، اور ذرائع پیداوار میں بہتری آجانے کا مشاہدہ کرتی ہے اور انہیں تاریخ وار مرتب کرنے کا کام کرتی ہے۔

ہم آپ پر ایک خوشگوار جبر ہوا ہے......وہ یوں کہ بارکھان اور ڈیرہ بگٹی میں پانچ کروڑ سال پرانے دفن شدہ ڈائنوسار، وہیل مچھلی اور بلوچی تھیریم کی ہڈیاں نکلی ہیں۔ اِس قدر قدیم بلوچستان سے میرا آپ کا تعلق ہے۔ اب جب اپنے اجداد کی قبرستان پہ بنے جدید بلوچستان کا مطالعہ کرنے نکلیں گے تو یہ باب تو لازماً لکھنا اور پڑھنا پڑے گا۔ اس لئے سہل پرستی چھوڑ کر کونین جیسا تلخ اور الجبرا جیسا مشکل یہ حصہ لکھنا اور پڑھنا ہوگا۔ آسان لفظوں میں بیان کرنا تو کسی بھی دانشور کے لئے خدائی نعمت ہوگی۔ مگر مردہ جانوروں کی ہڈیاں پڑھنا کہاں آسان کام ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ سارے چرند پرند، درند اور انسان سب کے سب نامعلوم مقام سے یکبارگی، یک دم، اور اکٹھے آئے۔ بلکہ ثابت یہ ہوا ہے کہ ابتدا میں بہت ہی سادہ جاندار وجود میں آئے تھے۔ زیادہ پیچیدہ جانور ہمیں بعد کے زمانوں میں دستیاب ہوتے گئے۔ انسان کی آمد کے آثار تو سب سے آخر میں ہمیں ملتے ہیں۔ زمین پر زندگی سمندروں اور کم گہرے تالابوں میں وجود میں آئی۔ زمین پر زندگی زیادہ تر پانی سے بنی ہے۔ کُل زمین پر 4000 ملین سال قبل زندگی ایلجی اور بیکٹریا کی صورت پیدا ہوئی تھی۔ جبکہ آبی حیات بالخصوص جیلی فش 570 ملین سال پہلے نمودار ہوئی ۔ زمینی جھاڑیاں اور کیڑوں کی نشانیاں 410 ملین سال پرانی ہیں۔ 360 ملین سال قبل مسیح پروں والے جانور اور 320 ملین سال قبل مسیح رینگنے والے جانور نمودار ہوئے۔ ڈائنوسار کا ظہور 248 ملین اور پرندوں کا 213 ملین سال ق م میں ہوا۔ 98 ملین سال ق م ڈائنوساروں کا آخری عہد ہے ، پھر یہ معدوم ہوگئے۔ 65 ملین سال ق م میں بڑے ممالیہ جانور سامنے آئے۔ پچاس ملین سال قبل

انسان نما جاندار نمودار ہوا۔ 35 ملین سال قبل بلوچی تھیریم بلوچستان میں پھیل گئے، چوبیس ملین سال قبل موسم کی تبدیلی سے بلوچی تھیریم ختم ہو گئے، خوراک، جنگلات جب خشک ہو گئے۔(8)

بے دُم کا بندر (ایپ) 25 ملین اور انسان نما جانور 5 ملین سال قبل مسیح میں منظرِ عام پہ آئے۔ گھوڑے، ہاتھی، بڑی سینگوں والے جانور اور انسانی نسل 1.8 ملین سال قبل مسیح سے وجود میں آئی ہے۔ مہرگڑھ اور آس پاس 5000 سال قبل مسیح ہاتھیوں کی باقیات ملی ہیں۔ جس کا ایک مطلب یہ ہے کہ آج کا خشک و بنجر بلوچستان ایک زمانے میں گھنا اور سرسبز جنگل ہوا کرتا تھا(9)

کولن تج ایک دلچسپ بات کرتا ہے: ''اِس وقت اِس زمین پہ ہم 30 ملین دیگر جاندار مخلوقات کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ یہ ایک گمان ہے، اس لئے کہ اب تک صرف ایک ملین جتنی مخلوقات کو نام دیئے گئے ہیں۔ مگر ابتدائی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ منطقہ حارہ (Tropical) جنگلات کے سائبان اور جڑوں میں رہائش پذیر ایک معلوم مخلوق پہ تیس ایسی مخلوقات ہیں جن کے متعلق ابھی معلوم نہیں ہے۔ اگر ساری 30 ملین مخلوقات بیان کی جاتیں، اور اگر آپ اُن کے نام لینا شروع کریں ۔۔۔۔ ہر ایک کے لئے ایک سیکنڈ۔۔۔۔ تو آپ کو اُن سب کا نام لیتے لیتے ایک سال گزر جائے گا، وہ بھی اگر آپ اس پورے سال کھانا کھانے یا سونے کے لئے اِن کے نام لینے میں وقفہ نہ کریں تو!!۔(10)

حوالہ جات

1- کارل ساگاں Pale Blue Dot بیلنٹائن بکس۔ نیویارک 1994۔ صفحہ 4

2۔ صدیقی، محمود اور عظمی محمود۔ Discover Balochistan۔ سنگت۔ جنوری 2008۔ صفحہ 72

3- کارل ساگاں۔ Pale Blue Dot صفحہ 99

4۔ صدیقی اور عظمیٰ۔ ڈسکور بلوچستان۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ مارچ 2008۔ صفحہ 69

5۔ ایضاً صفحہ 72

6۔ عرفان۔ حبیب۔ پیپلز ہسٹری آف انڈیا۔ جلد نمبر 1۔ 2004 فکشن ہاؤس۔ صفحہ نمبر 2

7۔ نہرو، جواہر لال۔Letters from A Father to His Daughter چلڈرنز بک ٹرسٹ، نیو دہلی۔1988۔صفحہ 7

8۔ پالمر، سالی۔فوکس برسٹل۔جلد121، دسمبر2002 صفحہ 80

9۔عرفان۔حبیب۔پیپلز ہسٹری آف انڈیا۔جلد نمبر1۔2004 فکشن ہاؤس۔صفحہ نمبر2

10۔کولن تج۔دی ٹائم بیفور ہسٹری۔Scribner نیویارک۔1996۔صفحہ 113

باب دو

بلوچستان...... زندگی کی کوکھ

1۔چار کروڑ ستر لاکھ سال قبل کا بلوچستان

جدید دور کی تحقیقات سے یہ بات سامنے آ گئی ہے کہ بلوچستان کا علاقہ قدیم دور میں خشک اور بنجر نہ تھا۔ بلکہ یہاں کثرت سے بارشیں ہوا کرتی تھیں اور بلوچستان کے پہاڑ اور میدان جنگلات سے بھرے ہوئے تھے جن میں مختلف قسم کے جانوروں کی بہتات تھی (1)۔اس دور کو’’Wet era‘‘ (گیلا دور) کہا جاتا ہے ۔ جیالوجیکل اور آرکیالوجیکل شواہد بتاتے ہیں کہ یہ بارانی عہد ابھی حال میں آٹھ دس ہزار سال قبل ختم ہو گیا۔اور اس کے بعد ’’خشک دور‘‘ شروع ہوا۔

بلوچستان حیوانی زندگی کے ارتقاء کا میدان رہا ہے ۔گو کہ ابھی تک اس ارتقاء کے کچھ گم شدہ مراحل کو دریافت کرنا باقی ہے مگر اب تک تو یہی لگتا ہے کہ یہیں پہ ہے سب کچھ۔اب بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ پر لکھنے والے قلمکار کو صرف بلوچ کی تاریخ لکھنی نہیں پڑے گی کہ فلاں قبیلہ اصلی ہے فلاں کم اصل۔فلاں فرقہ لوکل ہے فلاں نان لوکل ۔ بلکہ اب اُسے پوری کائناتی حیات (بیکٹیریا سے لے کر انسان تک) کی تاریخ بیان کرنی پڑے گی ۔اس لئے کہ گذشتہ دو تین دہائیوں سے جو نئی نئی سائنسی دریافتیں بلوچستان میں ہوئی ہیں انہوں نے سمتیں ہی بدل ڈالی ہیں ۔شاید ایک سیل والے معمولی جاندار سے لے کر اشرف المخلوقات انسان تک سب کچھ بلوچستانی ہیں ۔یہیں وہ پیدا ہوئے اور ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے اکیسویں صدی کے انسان تک آن پہنچے ۔ بلوچستان آبِ حیات ہے، مقامِ حیات ہے۔ساری زندہ مخلوق یہیں کی ہے۔

بارکھان کی وھیل مچھلی

(روڈھوسی ٹس بلوچستانی سس)

میں جب بلوچستان کے دانشوروں سے بلوچی تھیریم اور مہر گڑھ کے زمانے کے درمیان کے عرصے والے بلوچستان کے بارے میں زبردست بحث ومباحثے میں مصروف تھا تو ڈاکٹر غلام محمد کھیتران سے بھی اس کا تذکرہ ہوا۔اس نے غیر متوقع طور پر ایک ایسی بات کہہ دی جس سے میں اچھل پڑا۔اس نے کہا کہ میرے علاقے (بارکھان) میں ایک حاملہ وہیل مچھلی کے فاسلز دریافت ہوئے ہیں جو پانچ کروڑ سال پرانے ہیں۔اس نے بتایا کہ جس امریکی سائنس دان نے یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے اُس سے اُس کی دوستی ہے، ای میل سے رابطہ ہے۔اور جس بین الاقوامی طور پر مستند سائنسی جریدے میں اُس کا آرٹیکل چھپا ہے اس کی فوٹو کاپی بھی اس کے دوست نے انہیں بھیج رکھی ہے۔

اگلے دن ڈاکٹر صاحب نے وہ آرٹیکل مجھے پہنچا دی۔جس تحقیقی انٹرنیشنل جریدے میں وہ مضمون شائع ہوا تھا اس کا نام ’’سائنس‘‘ ہے۔میں نے انٹرنیٹ پہ اسے ڈھونڈا تو وہ رسالہ مجھے مل گیا۔2001 کے 21 ستمبر کے شمارے میں اُس دریافت کی تفصیل بیان تھی۔ یہ تحقیق یونیورسٹی آف مشی گن کے پروفیسر فلپ گنجرِ خ، اُس کے ایک ساتھی لیاد زلماؤٹ اور جیالوجیکل سروے آف پاکستان کے محققوں اور نیو ہیمپشائر یونیورسٹی کے سکالروں نے مل کر کی۔رسالے کے سرورق پہ مشی گن یونیورسٹی کے ایک آرٹسٹ کی اس مچھلی کی بنائی پینٹنگ چھپی ہوئی ہے جس میں یہ نیلگوں سمندر سے خشکی کی طرف قدم رنجہ فرما رہی ہے۔میں نے چارلس ڈارون کو مخاطب کر کے سارا مضمون زور زور سے اُن کی روح کو سنایا۔میں نے تصور میں اس کے سر کو فخر سے بلند ہوتے دیکھا۔

سبق: سائنسی کام کرتے وقت بہت سارے لوگوں سے اِس کا ذکر کرنا چاہیے۔

کیا پتہ کون کس وقت کارآمد مدد دے؟۔

یہ وہیل خشکی کا ممالیہ جانور تھا۔یہ پیروں پر چلتا تھا۔بارکھان میں اِس کی مادہ ملی۔اور یہ خشکی پہ ملی۔یہیں پہ وہ حاملہ ہوتی تھی اور یہیں وہ بچے دیتی تھی۔اس کا خشکی سے سمندر میں جا بسنے کا سارا ارتقائی زمانہ ہمیں اِس دریافت نے بتا دیا ہے۔

یہ ابتدا میں چار ٹانگوں والا جانور تھا جو کہیں جا کر پانچ کروڑ سال قبل مکمل طور پر سمندری

جانور بن گیا۔اور پھر رفتہ رفتہ اس نے ٹانگوں سے نجات حاصل کر لی۔جو فاسلز بارکھان میں ملے اُن میں سے اُس کی ٹانگیں باقاعدہ طور پر موجود ہیں۔ان ٹانگوں کو وہ سمندر سے نکل کر خشکی میں زندگی گزارنے میں بروئے کار لاتا تھا۔اُس کی باقاعدہ انگلیاں تھیں، انگوٹھے تھے۔اب سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ وھیل مچھلی دراصل بھیڑ، گائے، سور، اونٹ، ہرن اور دریائی گھوڑا کے خاندان سے ہیں۔(2)

روڈھوسی ٹس بلوچستانی سس (Rodhocetus Balochistanesis) نامی فاسل شدہ وہیل کے جزوی ڈھانچے ابھی تک دریافت کردہ وہیل میں قدیم ترین ہیں۔47 ملین سال قبل کے یہ جانور مشرقی بلوچستان کے علاقے رکھنی میں لاکھا کچ لوھا میں ''رِکن وت'' کے مقام پر ملے۔(3)

اس دریافت کے بڑے سائنس دان نے بتایا کہ سب سے پہلے ہمیں چھوٹے دانت نظر آئے۔ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ ایک چھوٹا بالغ وھیل ہے مگر پھر ہم نے کھدائی جاری رکھی اور ہمیں پسلیاں ملیں جو ان دانتوں کی نسبت بڑے جانور کی تھیں۔دن کے آخر میں اندازہ ہوا کہ ہم نے ایک مادہ حاملہ وھیل اور اس کے پیٹ میں بچہ دیکھا ہے۔بچے کی پوزیشن پہلے سر پیدا ہونے والی تھی جو کہ زمینی ممالیوں کی خصوصیت ہوتی ہے۔جبکہ ہمارا سمندری جدید وھیل اس سے الٹ پوزیشن میں پیدا ہوتا ہے۔

مذکورہ وہیل نے جب چاہا سمندر میں پیرا کی فرمائی۔اور جب چاہا خشکی پہ آ کر بچے دیئے۔جہاں ننھے بچوں کو نہ ڈوبنے کا خطرہ ہوتا نہ دیگر جانوروں بالخصوص شارک مچھلیوں کی خوراک بننے کا ڈر۔یہ وھیل خشکی پر بہت لمبا فاصلہ طے نہیں کر سکتا تھا۔یہ گویا ساحل کے ساتھ ہی بندھے تھے۔یہ خشکی اور سمندر کے سنگم پہ رہتے تھے اور آگے پیچھے جاتے تھے۔خشکی میں سمندر کی لہروں سے آئی مردہ مچھلیاں اس کی خوراک کا کام دیتی تھیں۔جی ہاں، وہیل مردار خانور جانور ہوا کرتا تھا (Scavenger)۔بلوچستان کے اس وھیل کی دریافت نے سائنس کا بڑا مسئلہ حل کر دیا کہ کس طرح یہ خشکی کا جانور بالآخر سمندری بن گیا۔

ایک ویب سائٹ نے ذکر کیا کہ جب یہ فاسل دریافت ہوا تو مشی گن یونیورسٹی کے ماہر فلپ گنجیرخ ایک، بالغ اور ایک بچے کی ہڈیوں کے گڈمڈ سے ہکا بکا رہ گیا۔واضح رہے کہ اس پورے پراجیکٹ کی فنڈنگ بہت ہی معتبر ادارے نیشنل جیوگرافک سوسائٹی نے کی تھی۔

وہیل سمندری ممالیہ جانور ہیں۔جبکہ زیادہ تر ممالیہ خشکی پر رہتے ہیں اور ابتدائی ممالیوں کا فاسل ریکارڈ زمینی باشندگی کا ہے۔لہٰذا بہت عرصے سے یہ اخذ کیا گیا کہ وہیلوں کی ابتدا میں زمین سے سمندر کی طرف ارتقائی ڈھلنا شامل ہے۔یہ بہت زیادہ علم بھری تبدیلیوں میں سے ایک ہے۔

2۔ساڑھے تین کروڑ سال قبل کا بلوچستان

بلوچی تھیریم

بلوچی تھیریم (Baluchitherium) (بلوچستان کا درندہ) نامی ایک میمالیہ کے فاسلز ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں دریافت ہوئے ہیں۔یہ ایک بے نظیر دریافت ہے۔بلوچستان جب بھی کرے گا نرالا ہی کرے گا۔یعنی اِس کرہِ زمین پر پایا جانے والا سب سے بڑا جانور یہاں رہتا تھا۔یہ 30 ملین سے لے کر 20 ملین سال قبل تک یہاں بلوچستان کے گرم ترین خطے میں دندناتا پھرتا تھا جب ہمارا وطن سرسبز اور گھنے جنگلات سے ہرا بھرا ہوتا تھا۔یہ بلاؤں کا بلا بگٹی علاقے میں سوئی سے شمال میں 1985 میں دریافت ہوا تھا۔ژاں لوپ ویلکم کی قیادت میں فرانس کی ایک یونیورسٹی کے فاسلز ماہرین کی ایک ٹیم نے اس کا پورا ڈھانچہ کھود نکالا۔

فاسل (fossil) اُن جانداروں کے ڈھانچوں کو کہا جاتا ہے جو مرنے کے بعد اپنی جگہ پر پڑے رہنے پر مختلف قسم کی چیزوں سے ڈھک جاتے ہیں۔مثلاً مٹی کے ذرات، پودوں کے باقیات وغیرہ سے۔پھر وہ ان ہی چیزوں کے نیچے دبتے جاتے ہیں۔آہستہ آہستہ پھر وہ اسی زمین کا حصہ بن جاتے ہیں جبکہ اُن کے اوپر کی گرد اپنے ہی وزن سے سخت ہوتی جاتی ہے۔اس طرح وہ کئی سال تک وہاں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ان کی ہڈیاں چونکہ اپنی ساخت برقرار رکھتی ہیں۔اس لیے تہہ در تہہ کھدائی کر کے ان ڈھانچوں کی ہڈیوں کے ذریعے تحقیق کی جا سکتی ہے۔

یہ جانور سینگوں کے بغیر تھا، یہ آٹھ میٹر (28,27 فٹ) لمبا اور ساڑھے پانچ میٹر (18 فٹ) اونچا تھا۔اس کا وزن پتہ ہے کتنا تھا............بیس میٹرک ٹن!!افریقی ہاتھی کے باپ سے بھی بڑا..........تصور سے بھی بڑا۔لمبی گردن اور رومن پلرز (ستون) جیسی لمبی ٹانگیں اسے جنگل چٹ کرنے میں مدد دیتے تھے۔(شکر ہے یہ گوشت خور جانور نہ تھا)۔یہ کافر روزانہ دوٹن خوراک کھاتا تھا۔اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلوچستان میں اس فضول خرچ بد بلا کو کھلانے کے لئے اُس زمانے میں کتنا گھنا اور بڑا جنگل ہوگا؟ ....اب ذرا سا تکلیف کریں کوئٹہ سریاب روڈ پر موجود جیالوجیکل سروے آف پاکستان کے میوزیم کا چکر لگا آئیں۔وہاں اس جانور کی فاسل شدہ ہڈیوں کو زمین پر آپس میں فٹ کر کے رکھا ہوا ہے۔لگتا ہے جانور آرام فرما رہا ہے۔اپنے بچوں کو ضرور دکھائیں۔اور اس میوزیم کا چکر لگا کر بچوں کو واپس لائیں، انہیں کمپیوٹر پر بٹھا دیں اور انٹرنیٹ پر Baluchitherium لکھ کر Enter کا بٹن دبا دیں۔اُس کے بعد تو آپ بھی بلوچستان سے محبت کی دنیا میں داخل ہو جائیں گے اور آپ کے بچے بھی جہالت سے ملینوں سال دور ہو جائیں گے۔

یہ جانور خاص جغرافیائی حالات میں بڑھوتری پا گیا تھا۔۔۔یہ بڑا جانور دو کروڑ اسی لاکھ سال پرانا ہے۔یعنی ہمارا ڈیرہ بگٹی تین کروڑ سال قبل گھنے اور سرسبز بارانی جنگلات کی سرزمین تھی۔جنگلات، نمی، اور پانی کی فراوانی والے ایسے موزوں حالات جس میں اِن جہازی سائز کے گوحوں کا مقابلہ کرنے والا کوئی درندہ ہی موجود نہ رہا۔لہٰذا زبردست انداز میں ان رینگنے والے جانوروں (Reptiles) کی نشو ونما ہوتی رہی۔

خیال کی جاتا ہے کہ تین کروڑ پچاس لاکھ سال پہلے (جب ابھی ابھی ہمالیہ نے ابھرنا شروع کیا تھا)، یہ جانور انڈین اور بقیہ ایشیا کے درمیان زمینی پلوں کو استعمال کرتے ہوئے یہاں پھیل گئے۔یہ سارا علاقہ فاسلز سے بھرا پڑا ہے۔

بگٹی علاقہ قدیم ترین Mastodon کے فاسلز کے لیے مشہور ہے جو کہ جدید ہاتھیوں کے معدوم شدہ رشتے دار ہیں۔

فرانسیسی ماہرِ فاسلز ژاں لوپ ویلکم کے بقول ''یہ ایک پورا ریوڑ تھا۔ان کے فاسلز آج ایک خشک شدہ مگر اُس زمانے میں ایک گہرے وسیع دریا کے bed میں ملے۔اچھا یہ وہ زمانہ ہے کہ ڈائنو ساروں کو معدوم ہوئے عرصہ بیت گیا تھا۔لہٰذا یہ دیو جتنا بڑا جانور بغیر کسی مقابلہ اور ڈر کے مزے مزے سے درختوں کی ٹہنیوں کے بھی آخری حصے کا نرم و نازک علاقہ چرتے رہے تھے۔ایسی بد بلا ڈراؤنے دیو کو درندوں سے کیا ڈر ہوگا؟۔پھر دوسری بات یہ ہے کہ وہ اکیلا نہیں بلکہ ریوڑ کی صورت اکٹھے رہتے تھے۔

اب 28 ملین (دو کروڑ اسّی) برس بعد پیرس میں نیچرل ہسٹری میوزیم اور یونیورسٹی آف مونٹ پلیئیر کے سائنس ڈیپارٹمنٹ کے ماہرینِ فاسلز (palaeontologists) اسی وادی میں اتر گئے، جو کہ اب ریتلی اور بنجر ہے۔وہ سائنس دان اس بہت بڑے ڈھانچے کو آخری صورت دینے لگے جو کہ انہوں نے اسی ریوڑ کی فاسل شدہ ہڈیوں کو ترتیب سے رکھ کر بنایا تھا۔انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ فٹے اور پیمائشیں رکھیں۔ٹیم لیڈر ژاں لوپ ویلکم پچھلی ٹانگوں کے درمیان جھکتا ہے۔اور اپنا ہاتھ ایک بہت بڑی کلائی ہڈی کے ساتھ رکھتا ہے تا کہ سائز معلوم کر سکے۔ٹیم نے انہیں جھاڑ پونچھ لیا، اِن ہڈیوں کے گرد سفید پلاسٹر کا خاکہ کھینچا۔اُس مرتب شدہ تصویر میں بچوں جیسی بات ہے جو کہ ایک مہین، بغیر سینگوں والے rhino کی طرح ہے۔یہ پانچ میٹر سے زیادہ بلند ہے۔اور ناک سے لے کر دم تک نو میٹر لمبا تھا اور اس کا وزن بیس ہزار کلو میٹر رہا ہوگا جو کہ ہاتھی کے وزن سے چار گنا زیادہ ہے۔

ان زمینی دیو ہیکل ممالیوں کے فاسلز جنہیں ''بلوچی تھیریم'' کہا جاتا ہے سب سے پہلے 1908 میں دریافت ہوئے، جب ایک برطانوی ماہر فاسلز ڈاکٹر کلائیو فورسٹر، کوپر ایک مہم پر بگٹی علاقے گیا تھا۔

ہزاروں برس بعد بالآخر پانی والا علاقہ محدود ہوتا گیا، موسم خشک ہوتا گیا، سرد تر ہوتا گیا اور نئی مخلوق اور جاندار نمو دار ہوتے گئے۔اس نئے ماحول میں رینگنے والے جانوروں (Reptiles) کی تعداد اور قسمیں کم ہوتی گئیں سب سے زیادہ موزوں (Fitness) حالات و

اوصاف دشمنی میں بدل گئے۔ Survival of Fittest (جو سب سے زیادہ فِٹ ہوگا وہی زندہ رہے گا) کا ڈارونی قانون بڑے بڑے ناموروں کی موت کا سبب بنا، بس حقیر گوح رہ گئے جو اومر بن کر ماہناز کے گریبان کی چیر پھاڑ کا استعاراتی کام کرتے ہیں یا چرواہوں کے ریوڑ میں بکری کے دودھ بھرے تھنوں کا دودھ پی کر خالی کر دیتے ہیں۔۔۔اور یہ پکی بات ہے کہ یہ بھی ہزاروں سال تک زندہ نہ رہ سکیں گے۔ابھی تو بس یہ اپنی نسل باقی رکھے ہوئے ہیں۔

اِن گوحوں' باغاروں اور چھپکلیوں سے تو خرگوش اچھے ہیں۔ اِن کی مادہ ہر سال درجنوں بچے جنتی ہے مگر آبادی وہیں کی وہیں ہے۔ان بچوں سے ایک دو ہی بچ سکتے ہیں۔ باقی طبعی موت کے مقدر کے حوالے ہوجاتے ہیں۔

مگر انسان کو دیکھئے۔عورت اگر تین سال بعد نہ بھی سہی، تب بھی سالانہ ایک دو بچوں سے زیادہ بچے نہیں جنتی۔اور اگر کبھی تین سے زیادہ جڑواں بچے دنیا کے کسی کونے میں پیدا ہوں تو وہ گویا ایک عالمی خبر بن جاتی ہے۔لوگ حیرت سے اس پر تبصرے بحثیں کرتے ہیں۔اُن بچوں کو لاحق خطرات سے نمٹنے کے لئے ماں باپ کو چندے تحائف بھیجتے ہیں۔مگر تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ اُن میں سے اکثر بچے ایک ماہ کی عمر ہی کے دوران مر جاتے ہیں۔ بہت کوٹہ سسٹم مقرر ہے انسان کی پیدائش پر۔ایک عورت عمر بھر (اوسطاً) 8،10 بچوں سے زیادہ پیدا نہیں کر سکتی۔مگر پھر بھی ہماری انسانی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔یعنی ہم خرگوش کے مقابلے میں زندہ رہنے (Survival) کے لئے زیادہ فِٹ ہیں۔فطرت کی تاریخ میں نئی نئی مخلوقات پیدا ہوتی رہیں جو پچھلی سے زیادہ فِٹ اور زندہ رہنے کے لئے مطابقت پذیری رکھتی تھیں، خوراک اور پناہ گاہیں تلاش کرتی تھیں اور اس طرح بڑھتی رہتی تھیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگلی (پہاڑی) دنبہ ایک سرد پہاڑی ماحول میں زندہ رہ سکتی ہے اس لئے کہ اس نے چمڑے کے نیچے چربی اور کھال کے اوپر پشم کا ایک کوٹ پہن رکھا ہوتا ہے۔ انسان بے چارے کے پاس یہ پشمینہ کوٹ موجود نہ تھا۔اُس نے بے لباسی کے زمانے میں بھی اور اس کے بعد بھی انہی بھیڑوں کے پشم کے اَن سلے، اور بعد میں سلے ہوئے کوٹ اور سویٹر بنائے اور خود کو کوئٹہ سوراب اور قلات و ہربوئی میں زندہ رکھنے کے قابل بنایا۔ انگریز کے وقت تک بلوچ

پوستینیں پہنا کرتے تھے۔۔۔غریب، غریب پوستین اور امیر، امیر پوستین پہنتا تھا۔ جانوروں نے پنجوں کے ذریعے سرد علاقوں میں زمین کھود کر پناہ جاہ بنائی تو انسان نے پتھر' کانسی یا لوہے کی مدد سے اِگلو والے برفانی غار کھودے یا پھر مٹی گارے کے کمرے بنائے اور بعد میں سیمنٹ سریہ کے مکان بمع آتش دان وانگھیٹی تعمیر کئے۔ جانور (درندے) زندہ رہنے کے لئے دوسرے جانوروں کا شکار کرتے ہیں تو انسان نے پتھر، نوکدار پتھر، پھر تیر و تیر کمان اور پھر شاٹ گن بنا کر شکار سے خود کو زندہ رکھنا شروع کیا۔

مندرجہ بالا دو دریافتوں نے محققوں اور دانشوروں کے لئے دو سوال پیدا کئے ہیں۔ایک مسئلہ یہ ہے کہ ایک کروڑ ستر لاکھ سال قبل کا دریافت شدہ ''رھوڈوسی ٹس بلوچستانی سس'' سے پہلے کا بلوچستان کیسا تھا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس وھیل اور بلوچی تھیریم کے درمیان جو ڈیڑھ کروڑ سال کا عرصہ گم ہے، وہ کیسا تھا۔

حوالہ جات

1- شیخ، نوید اسلم۔ پاکستان کے آثارِ قدیمہ۔2008۔ بک ہوم لاہور۔صفحہ 63

2- بران، ڈیوڈ۔ Ancient walking whales shed light on Ancestry of Ocean Giants

http://news nationalgeographic.com/news/pf/37243652.html

3۔ گنگرِ خ، فلپ اور دیگر۔Origin of Whales from early artiodactyls

ماہنامہ ''سائنس''۔جلد 293۔ستمبر 2001۔صفحہ 2239-2242

باب سوم

اشرف المخلوقات......انسان

''انسان تو کائنات کا عجوبہ ہے، اُس کا افتخار ہے۔''

ڈارون

سائنس حقائق کی تلاش میں کبھی اپنے آپ کی بھی نفی کرتے ہوئے، اور کہیں اپنی پچھلی بات کی تصدیق کرتے ہوئے آگے بڑھتی جاتی ہے، نئے حقائق کھوجتی جاتی ہے اور نئے ادراک کے اعلانات کرتی جاتی ہے۔ ماما عبداللہ جان کے بقول ''سچ اپنی حتمی شکل میں سائنس کہلاتا ہے''۔ سائنس میں فلسفہ کے ہائپوتھیسز یا تھیوری پر تحقیق کرنے کی صلاحیت تو موجود ہے مگر اسے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کی اُس وقت تک صلاحیت موجود نہیں ہے جب تک کہ یہ ''ایسے'' یا ''ویسے'' ثابت نہ ہو جائے۔ لہٰذا ''ثابت شدہ سچائی کو سائنس کہا جاتا ہے''۔

سائنس مروجہ عقیدوں، روایتوں، پیشن گوئیوں، خوابوں اور بشارتوں پر تحقیق تو خوب کرتی ہے اور انہیں حق یا باطل تو قرار دیتی ہے مگر خود کو اُن کی مطابقت میں ڈھالنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی۔ اس کے برعکس یہ عقیدے، روایتیں، پیشن گوئیاں، خواب اور بشارتیں ہیں جو اپنی توضیح و تشریح کے لئے سائنس کے پیچھے بھاگتی رہتی ہیں۔ دنیا بھر کی روایات ہر وقت اِس جستجو میں رہتی ہیں کہ ''دیکھا؟ سائنسی فلاں دریافت نے ہماری فلاں روایت کو برحق ثابت کر دیا ہے''۔

زندگی، بالخصوص انسانی زندگی کے وجود میں آنے کے بے شمار نظریات موجود ہیں۔ اس

سلسلے میں سائنس کی اپنی تحقیق اور دریافتیں ہیں۔مگر اُس طرف جانے سے قبل ذرا قدیم پارس میں ایک لطف انداز روایت دیکھئے:

''مشہور ہے کہ وقت کا دیوتا دنیا پیدا کرنے کے بعد ہر طرف ہم آہنگی دیکھتا ہے۔مگر محسوس کرتا ہے کہ کوئی بہت اہم چیز غائب ہے۔۔۔۔ایک ساتھی' جس سے وہ یہ ساری خوبصورتی بیان کر سکے۔ایک ہزار برس تک وہ ایک بیٹے کے لئے دعا کرتا ہے۔حالانکہ وہ خود سب چیزوں پر قدرت رکھتا ہے، تنہا سب سے بڑا پرماتما ہے۔کہانی یہ نہیں بتاتی کہ وہ کس سے دعا کرتا ہے۔بہر حال وہ دعا کرتا ہے اور بالآخر حاملہ ہو جاتا ہے۔

جب اسے احساس ہوتا ہے کہ اس کے دل کی مراد پوری ہوگئی ہے، تو وقت کا دیوتا اچانک پشیمان ہو جاتا ہے کہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگئی۔وہ اچانک محسوس کرتا ہے کہ چیزوں کا توازن کس قدر نازک ہے۔مگر اب بہت دیر ہو چکی اور بچہ پہلے ہی راستے میں ہے۔وہ اپنے غم و اندوہ میں یہی کچھ کر سکتا ہے کہ اپنے پیٹ میں موجود بچے کو دو میں تقسیم کرے۔

روایت بتاتی ہے کہ دیوتا کے پیٹ سے اچھائی (اُرمزد) اور بدی (اہرمن) پیدا ہوئے ....دو جڑواں بھائی۔

پریشان باپ ہر چیز کا انتظام کرتا ہے تا کہ اُرمزد پیٹ سے پہلے برآمد ہوا۔اس طرح اہرامن پہلے پیدا ہو کر دنیا کو ہیجان میں نہیں پھینک سکے گا۔البتہ بدی چونکہ چالاک ہے' وہ پیدائش کے وقت اُرمزد کو دھکا دیتا ہے اور اس طرح خود پہلے پیدا ہوتا ہے۔

وقت کا دیوتا ارمزد کو اتحادی دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔چنانچہ وہ انسان پیدا کرتا ہے تا کہ وہ اُرمزد کی طرف سے لڑیں اور اہرمن کو ہر چیز پر قبضہ کرنے سے روک دیں''۔

پارس کی اس روایت میں انسانی نسل بھلائی کے اتحادی کے بطور پیدا ہوئی اور ان کی روایت کے مطابق آخر میں بھلائی فتح پاتی ہے''۔(1)............بلوچ اسی انسانی نسل سے ہیں۔

انسان اور دیگر جانوروں میں بہت مماثلت موجود رہی ہے۔کچھ باتیں ایسی ضرور ہیں جن سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ انسان خاکی ہے، فطری ہے نہ کہ، مافوق الفطرت۔ارسطو' ہپوکریٹس

اور دیگر قدیم نیچرلسٹوں اور فزیشنوں کی تحریروں میں ہمیشہ ممالیہ جانوروں اور انسانوں کے بیچ یکساں اور غیر یکساں باتوں کا بیان موجود ہے۔جس میں وہ جسم کی ساخت، اور اس کے کام کو بیان کرتے تھے۔ارسطو وہ پہلا سائنس دان تھا جس نے انسانی جسم کا بہت تفصیلی مطالعہ کیا اور انسان کا مقام جانداروں کی دنیا میں متعین کیا۔اُس نے انسانوں اور جانوروں کے بیچ سیدھا کھڑا ہونے اور سیدھا ہو کر چلنے کی اہمیت واضح کی، انسان کے بڑے دماغ کا تذکرہ کیا، بات کرنے اور شعور رکھنے کی اُس کی خاصیت بتائی۔سائنس کی تاریخ میں ایک نیا لفظ Anthropoids رواج پانے لگا جس کا مطلب ہے''انسان جیسے جانور''۔

سترھویں صدی میں پہلی بار یورپ نے چمپنزی نامی جانور دیکھا۔اور حیرت سے اس کا مطالعہ شروع ہوا۔

اٹھارویں صدی میں سویڈن کے سکالر کارل لنّائیس نے جانداروں کی دنیا میں انسان کو شامل کر دیا اور اسے انسان جیسے جانور، ایپ سے آگے Homo sapiens کی صف میں شامل کر دیا۔

انیسویں صدی میں چرنی شیوسکی اور لاوروف نے تو اِس سلسلے میں بہت بڑے تجربات اور انکشافات کئے۔اُن کے بعد پھر وہ بڑا انسان آیا جس کے نظریات نے اس شعبے کی کایا پلٹ دی...... یہ تھا چارلس ڈارون۔

1809 میں انگلینڈ میں پیدا ہونے والا چارلس ڈارون چھوٹی عمر سے ہی زندہ جانداروں کے بارے میں دلچسپی لیتا تھا۔وہ فارغ وقت میں اپنے گھر کے آس پاس کھیتوں میں پودے اور کیڑے اکٹھا کرتا تھا، یا پھر نیچر کے بارے میں کتابیں پڑھا کرتا تھا۔

اس میڈیکل سٹوڈنٹ کو یہ شعبہ اچھا نہ لگا اور اس نے کورس پورا ہونے سے قبل ہی یہ پڑھائی چھوڑ دی۔وہ دینیات پڑھنے کیمبرج یونیورسٹی چلا گیا۔چار سال بعد ڈارون نے گریجویشن کر لی اور سند لینے کا انتظار کئے بغیر ایک نیچرلسٹ کے بطور ایک بحری جہاز پہ سوار ہو گیا۔وہ ''بیگل'' نامی اِس جہاز پر پانچ سال تک دنیا کا چکر لگاتا رہا۔اور جہاں بھی جاتا پودے، جانور اور فاسلز اکٹھے

کرتا اوراُن پرتفصیلی نوٹ لکھتا۔انہی شواہد سے تو اُس نے اپنی ''تھیوری آف نیچرل سلیکشن'' کا نظریہ پیش کرتا تھا۔

ڈارون نے ایک کتاب'' Origin Of Species by Means Of Natural Selection''لکھی۔اِس میں اُس نے ثابت کیا کہ انسان 80لاکھ سال پہلے درختوں پر بودوباش کرنے والے ایپ کی طرح کے جاندار سے شروع ہوا' ارتقائی منازل سے گزرتے گزرتے آج کے عقلمند اور حیران کُن کارہائے نمایاں سرانجام دینے والے انسان تک پہنچ پایا ہے۔

اُس نے لکھا کہ''انسان کا نزول ایک بال دار،دُم دار چوپائے سے ہوا ہے جو غالبًا اپنی عادات واطوار کے لحاظ سے درختوں پر رہا کرتا تھا۔انسان میں تمام شاہانہ اوصاف موجود ہونے کے باوجود............جسمانی فریم پر ایک ایسی انمٹ مُہر ثبت ہے کہ جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتدا پستی میں ہوئی ہے''۔ڈارون کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ کارآمد مقاصد کے لئے صدیوں تک آتی ہوئی تبدیلیوں نے بالآخر مستقل صورت اختیار کی۔اور یہ موروثی خصوصیات کے بطور والدین سے اولاد کو منتقل ہونے لگیں۔

لاسال کو لکھے گئے ایک خط میں مارکس نے اس کتاب کے بارے میں لکھا:''ڈارون کی کتاب بہت اہم ہے اور یہ مجھے تاریخ میں طبقاتی کشمکش کی خاطر ایک نیچرل سائنسی بنیاد فراہم کرتی ہے''۔(2)

ڈارون کی ایک اور مشہور سائنسی تصنیف Descent of Man and Selection in Relation to Sex آئی جس میں وہ اور بہت سے ثبوت لایا کہ انسان جانوروں کی مخلوق میں سے آیا۔(ڈارون کا 1882 میں انتقال ہوگیا)۔

اور جب یہ بات ثابت ہو چکی تو سائنس اس بات کے پیچھے پڑ گئی کہ بہت ہی زیادہ پرانے ایپ جیسی مخلوقات سے جدید انسان Homo Sapiens sapiens (25 ہزار سال قبل) تو بن گیا مگر درمیان میں کیا کیا مخلوقات بنتی گئیں۔یہ گواہی زیادہ تر اُن فاسلز سے آئی جو کہ اُن نامیاتی مادہ کی چھوڑی ہوئی نشانیاں ہیں جن کی ابتدائی صورت یا شکل اب چٹانوں میں محفوظ

ہے۔

ذرا اِس لطیف احساس پہ بھی غور کریں کہ فنونِ لطیفہ کی داغ بیل اُسی وقت تو پڑی تھی جب اس نوعِ حیوانی نے (جسے''بشر نما''یا Anthropoid کہتے ہیں) خطرات کی مدافعت اور اپنی حفاظت اور زندگی کی روزمرہ ضروریات کے لئے درختوں کی ٹہنیاں اور پتھر کے ٹکڑے تراش کر اپنے لئے آلات بنانا سیکھا......آرٹسٹ حیوان!!

بیچ کی سب سے بڑی خالی کڑی یعنی''Missing Link'' کے بطور Australopithecines نامی نوع کے ایک گروپ کا مشرقی افریقہ میں دریافت ہونا تھا جو 3.8 ملین سال قدیم ہیں۔یہ اپنے دو پیروں پر سیدھا چل سکنے والے اصلی انسان تھے۔

1۔کوئلہ شدہ جنگلات

بلوچستان میں جا بجا پھیلی ہوئی کوئلہ کی کانیں دیکھیں جو میلوں تک بغیر وقفے تک جاتی ہیں۔کوئلہ کیا ہے؟ کوئلہ تو کوئلہ شدہ جنگل ہے۔میلوں تک کھودتے ہی چلے جایئے جنگل کا اختتام نہیں ہے۔ابھی' صرف گیارہ ہزار سال قبل کے مہر گڑھ سولائزیشن تک' بلوچستان جنگلات سے بھرا وطن تھا جہاں خوب بارشیں ہوتی تھیں۔ ہاتھی اور بھینسیں سیر شکمی کے ساتھ ہمارے فراواں جنگلوں میں 'ریوڑوں کی صورت گھومتی تھیں۔(ڈیرہ بگٹی کے علاقے میں بلوچی تھیریم جیسے جانوروں کے ریوڑوں کی موجودگی کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں)۔

یہیں،جنگلوں پر تو انسان کا بسیرا تھا۔اس قدر گھنے جنگل کہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر جاتے ہوئے زمین پر اترنے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔شاخ در شاخ میلوں تک جایا جا سکتا تھا اور سالوں تک یہیں بسیرا کیا جا سکتا تھا۔انسان بلّی کی سی پھرتی سے اچھلتا اور شاخوں پر سے ہوتا ہوا میوہ زاروں کے پار نکل جاتا۔اس دوران وہ بھنچے ہوئے دانتوں کے ساتھ کشاکش والی کوئی آوازیں گنگناتا رہتا اور اس کی نظریں ساکت رہتی جیسے کچھ بھی نہ دیکھ رہی ہو اور وہ بالکل بلّی کی سی جبلت سے اپنا توازن قائم رکھتا۔(3)۔اس کی سرگرم تیز حرکات اُس وحشی جانور کی سی تھیں جو

ساکت بیٹھا ہوا بھی ہر لحظہ چھلانگ مارنے کو چوکس نظر آتا ہے۔ وہ ہمہ وقت دوڑتا تھا (لفظ ''دوڑنا'' یہاں جو مفہوم رکھتا ہے وہ زمینی سطح کے حوالے سے نہیں، بلکہ مختلف بلندیوں پر بے قاعدہ سہاروں کی ایک دنیا کے حوالے سے ہے جن کے درمیان محض ہوا ہو)۔ ہر لحظہ یہ لگتا کہ اس کے قدم اکھڑ جائیں گے اور وہ گر جائے گا۔ مگر ایسا کہاں ہوتا تھا۔ وہ جست لگاتا، کسی ایک نشیبی شاخ پر چھوٹے چھوٹے تیز قدموں سے چلتا اور آگے کی طرف جھک کر کسی اونچی شاخ پر جھول جاتا۔ کیا توازن تھی!! بلاشبہ اس کے توازنی اعضا بہت مستعد اور ترقی یافتہ ہوتے تھے۔ اور ہاتھ پاؤں ساخت کے اعتبار سے شجری مخلوق کی طرح ہوتے تھے۔ وہ اپنے زخموں اور کھرونچوں کی خود دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ شکار اور دوسرے جانوروں سے لڑائی بھی یہیں درختوں پر کرتا تھا۔ انہیں مار کر ان کی کھال سے ٹوپی، پوستین بناتا۔ جسم کو گرم رکھنے کے لئے انسان کے اپنے جسم پر لمبے بال نہ تھے تو اس نے اس کے لئے ریچھ کو مارا اور اس کی کھال نکال کر اپنی کمی پوری کر دی۔ وہ رسی اور کنڈی کی مدد سے زمین پر گرے اپنے شکار کو اٹھا لاتا۔ وہ جنگل کی ساری مخلوق کی آوازوں کی نقل کرتا۔

عدم تحفظ، لاعلمی اور وسائل کی قلت نے قدیم انسان کو جنگل کا قانون دے دیا۔ یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ طاقتور سے طاقتور بنتے رہنے کے جنگل کے اس قانون نے حضرتِ انسان کو ملینیوں سالوں سے اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ اس غیر انسانی قانون کو ختم کرنے کے لئے بے شمار پیغمبر، ولی، مصلح اور انقلابی جان لیوا محنت کرتے رہے ہیں۔ مگر ابھی تک یہ سخت جان قانون جاری ہے۔ جنگل گیا مگر جنگل کا قانون باقی ہے۔ سب سے ترقی یافتہ شہروں میں بھی جنگل کا تاریک قانون حکمران ہے۔

ہم جنگل تہذیب کے اپنے ان اجداد کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ''درختوں پر جیے، انہوں نے ہمیشہ زمین سے پیار کیا اور بالآخر آسمان پر چلے گئے''۔

خواہ جس وجہ سے بھی جنگل اپنا گھنا پن ترک کر گئے، اور ہمارے یہ اجداد اپنی بقا کی خاطر ان گنجے جنگلوں کو چھوڑنے پر مجبور ہوئے مگر اُس کے بعد انسانوں کو جنگلوں سے عداوت سی ہو گئی اور اُسے کلہاڑے سے عشق سا ہو گیا۔ ایسا لگتا ہے کہ پھر دنیا میں درختوں کا کوئی حق نہیں رہا۔

آئیے ہم گلزار کی نظم دیکھیں کہ جنگل ہم سے کیسے مخاطب ہوتا ہے:

میں جنگل سے گزرتا ہوں تو لگتا ہے مرے،
پُرکھے کھڑے ہیں
میں ایک نوزائیدہ بچہ
یہ پیڑوں کے قبیلے
اٹھا کے ہاتھ میں مجھ کو جھلاتے ہیں
کوئی اک جھنجھنا پھولوں کا ہاتھوں سے بجاتا ہے
کوئی آنکھوں پہ پچکاتا ہے، خوشبوؤں کی پچکاری
بہت بوڑھا سا دڑھیل ایک برگد، گود میں
لے کر مجھے حیران کرتا ہے
سناتا ہے
تم اب چلنے لگے ہو!
ہمارے جیسے تھے تم بھی، جڑیں مٹی میں رہتی تھیں
بڑی طاقت لگاتے تھے، تم اپنے بیج میں سورج
پکڑنے کی
زمیں پہ آئے تھے پہلے
تمہیں پھر رینگتے دیکھا......
ہماری شاخوں پہ چڑھتے تھے، چڑھ کر کود
جاتے تھے
پھدکتے تھے
مگر دو پاؤں پر جب تم کھڑے ہو کر دوڑے،

پھر نہیں لوٹے

پہاڑوں، پتھروں کے ہوگئے تم!

مگر پھر بھی......

تمہارے تن میں پانی ہے

تمہارے تن میں مٹی ہے

ہمیں سے ہو......

ہمیں میں پھر سے بوئے جاؤ گے،

تم پھر سے لوٹو گے!

2۔ ہاتھ مُکّہ بنا

قدیم پتھر کے زمانے (Paleolithic Period) میں انسان زندہ رہنے کے لئے مکمل طور پر شکار اور ماہی گیری پر انحصار کرتا تھا، نیز وہ بیری چُنتا تھا، جڑیں اور کیڑے گھونگھے اکٹھے کرتا تھا۔ فطرت جو کچھ اُس کے لئے بناتی تھی وہ اسی پر گزارہ کرتا تھا۔ اسے ''چُننے کا زمانہ'' کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

مگر انسان کے ''چُننے'' میں اور جانوروں کے چننے میں ایک فرق تھا۔ انسان محض گرے ہوئے جنگلی پھل (بیر، کُنر، کونر، ڈیلھو، پتریک) ہی جمع نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے یہ اہلیت بھی حاصل کر لی کہ درخت کی ٹہنیوں پر پتھر مار کر پھل گرا دے اور پھر چُن لے۔ انسان کے علاوہ صرف ایک جاندار ایسا تھا جو پتھر مار کر پھل گرا سکتا تھا...... وہ تھا ایپ، چمپنزی۔ آپ چاہیں تو اسے اِن دونوں جانداروں کے دماغ کی صلاحیت قرار دیں مگر سچی بات یہ ہے کہ پتھر مارنے اور چُننے کے اِس عمل میں ہاتھ اور انگلیوں کی ساخت کا رول زیادہ اہم ہے۔ بیل اور بکری اگر دماغ استعمال کرنے کے قابل ہوتے بھی تو وہ نہ تو اپنے کھروں میں پتھر پکڑ سکتے تھے اور نہ ایک خاص انداز میں اوپر پھینک نہیں سکتے تھے اس لئے کہ سارا کام تو انگلیوں کا ہوتا ہے۔ اور پھر آنکھیں، دماغ، اعصابی نظام اور

ہاتھ کی انگلیوں کے درمیان ایک نازک اور باریک ہم آہنگی چاہیے تھی۔............ اور یہ سب سہولتیں انسان کے علاوہ کسی جانور کے نظام میں مہیا نہیں ہیں۔

اور جب انسان نے ایک بار یہ صلاحیت حاصل کر لی تو اسے شہہ ملا کہ اس نازک و باریک ہم آہنگی کو برتتا ہی چلا جائے۔ اُس نے انتخاب کرنا شروع کیا کہ پتھر کیسا ہو، ٹہنی پہ مارنے کا زاویہ کیسا ہو، ایک پتھر ایک ہی وار میں دو تین ڈالیوں پر کیسے لگے............ یہ سب تجربے کرتے کرتے اب اُس نے پتھر کی ساخت میں تبدیلیوں پر کام کرنا شروع کر دیا۔

رفتہ رفتہ ہاتھ والا آدمی ہاتھ کو اب مزید پاؤں کی طرح نہیں' بلکہ زیادہ سے زیادہ ہاتھ کی طرح استعمال کرنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کو چلنے میں استعمال کرنے کی اپنی عادت رفتہ رفتہ ترک کر لی اور زیادہ سے زیادہ سیدھا حالت کو اپنایا (1)۔ اب تو ہاتھ، ضرورت کے وقت بھی پاؤں کے بطور استعمال ہونے سے انکاری ہوتے ہیں۔ اور ہاتھ کے لئے بھلا پتھر کے علاوہ استعمال کے لئے کوئی اور چیز کیا تھی۔ سو یہیں سے انسان اور پتھر کی یاری بنی۔ پتھر ہمارا اوزار بنا' گیارہ لاکھ سال پہلے۔

جنگل نے اپنی تباہی اور اپنے رہائشی انسان کے درخت ترک کرنے کا بدلہ انسانوں سے یوں لیا کہ اُس کی شکل بگاڑ کر رکھ دی۔ وہ' جو کل تک نیم چوپایہ اور نیم دوپایہ چال چلتا تھا اب مکمل طور پر دوپایہ بن گیا۔ (مگر خدا کے لئے جلد باز نہ بنیے کہ فطرت جلد باز نہیں ہوتی۔ نیم چوپایگی سے مکمل دوپایگی میں ہمارے اجداد کو ہزاروں، لاکھوں برس کا طویل عرصہ اور پراسیس لگا)۔ انسان پہلی بار لبریشن کے تصور سے آشنا ہوا: ہینڈ لبریشن۔ اور اگر اجازت ہو تو میں کہہ دوں کہ ہینڈ لبریشن تو دراصل دماغ لبریشن تھی۔

اور اِس ہاتھ نے خود آزادی پا کر انسان ذات کو آزاد کر دیا۔ ہم اب بخوبی جانتے ہیں کہ ہر جاندار اِس بات کی نشانی چھوڑتا ہے کہ وہ کیا تھا۔ مگر انسان اِس بات کی نشانی چھوڑتا ہے کہ اُس نے تخلیق کیا کیا تھا۔ یہ کرامت اُس کے ''ہاتھ'' کی ہے۔

انسان نے پتھر کے علاوہ ایک اور ریڈی میڈ اوزار بھی استعمال کرنا شروع کیا' ڈنڈا

۔اُسے جو بھی پڑی ہوئی سوکھی ٹہنی ملی اسے ہاتھ میں لیا اور اُس کا دوسرا سرا پھلدار درخت پر ایک یا زیادہ بار (ڈنڈے کی طوالت کے مطابق) مارتا رہا اور بیر گرا کر چُننے لگا۔ اور اگر چاہا تو اسے پتھر کی طرح ہی پھل بھری ڈالی پر پھینک دیا۔ چنانچہ اس تجربے نے اسے لکڑی، ڈنڈا، عصا کو بہتر بناتے رہنے پر اکسایا۔

نوکدار لکڑی'نوکدار پتھر اور بڑے بڑے مردہ جانوروں کی پڑی ہوئی بڑی بڑی نوکدار ہڈی سے انسان نے زمین کھود کر کیلٹر، بڈل جیسی بوٹیوں درختوں کی جڑیں کھود نکالنے اور کھانے کے تجربات کیے۔ جڑیں کھودنے کے یہ تجربے بغیر اوزار کے تو اور جانور بھی کر سکتے تھے مگر اوزار استعمال کرنا صرف حضرتِ انسان کی فضیلت ٹھہری۔ قدیم انسان کے زیرِ استعمال لکڑی، ڈنڈا، اور عصا تو آثارِ قدیمہ میں گل سڑ گئے مگر مہر گڑھ کی نچلی سطحوں میں نوکدار بنائے گئے ایسے بے شمار پتھر اور ہڈیاں ملی ہیں جو اس مقصد کے لئے بنائی گئی تھیں۔

چِنوخ (چُننے والے) کی حیثیت سے انسان جانوروں کی کھالوں کو صرف لباس یا کوٹ کے بطور استعمال کرتا رہا۔ انہیں پہننے کے قابل بنانے کے لئے بھی اچھی خاصی محنت کی ضرورت ہوتی تھی۔ ایک زمانے تک تو انسان صرف چمڑا رگڑنے کے لئے اوزار بناتا رہا اس لئے کہ کھال کے کسی پیچیدہ استعمال کا رواج نہیں آیا تھا۔

ہاتھ میں کسی ڈنڈے یا پتھر کا مطلب یہ ہوا کہ ہاتھ زیادہ لمبا، زیادہ مضبوط اور زیادہ ہنر مند ہوتا گیا۔ اب اِس پتھر یا ڈنڈے کو اوزار ہی کہا جا سکتا ہے۔ انسان اوزار پہ اوزار بناتا اور استعمال کرتا گیا اور یوں روز بروز جانوروں سے برتر اور افضل ہوتا گیا......سیکڑوں ہزاروں سال کی محنت سے انسان نے اپنے ہاتھ بہت جامع بنا لیے ہیں۔ اوزار حیوان و انسان کے بیچ امتیاز کا معیار ٹھہرے۔

دوسرے لفظوں میں ہمارا ہاتھ صرف محنت کا عضو نہیں بلکہ یہ محنت کی پیداوار بھی ہے۔ محنت نے ہاتھ کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔۔۔محنت نے بعد میں بھی اس کے عضلات، Ligaments اور بہت عرصہ بعد اس کی ہڈیوں کو بھی خصوصی بنا دیا۔ اٹھارویں صدی کے مفکر راد شچیف نے تو یہاں

تک کہہ دیا تھا کہ ''ہاتھ منطق کی طرف، استدلال کی طرف انسان کے راہنما تھے''۔

پہلے پہل محنت، اور اُس کے بعد بات...... یہ دو سب سے زیادہ لازمی محرکہ اوصاف تھے جن کے زیرِ اثر رفتہ رفتہ انسان کا دماغ بن گیا......دماغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ، اس کے سب سے فوری آلات یعنی حسیات اور حواس کی ترقی ہوتی رہی۔ بالکل جس طرح بات کی ارتقائی ترقی کے ساتھ ساتھ سننے کے اعضا کی شستگی ہوتی رہی، اسی طرح مجموعی طور پر دماغ کی ترقی سارے حواس کی شستگی کرتی رہی۔(5)

دماغ اور اس کے حاشیہ بردار حواس (شعور کی بڑھتی ہوئی وضاحت، تجریدیت اور فیصلہ کی قوت) کی ترقی اور اُس کی محنت اور بات پر ردِ عمل' دوسری طرف محنت اور بات دونوں کو مزید ترقی دینے کا باعث بنتے رہے۔ یہ ترقی اپنے اختتام تک کبھی نہ پہنچی۔ انسان بالآخر ممتاز تر ہوتا گیا، مجموعی طور پر مزید مضبوط ہوتا گیا اور ترقی کرتا گیا۔ (یہ سلسلہ ابد تک جاری رہے گا۔ مگر ابد؟ ابد کب ہوگا، ہوگا بھی کہ نہیں؟۔ کون جانے؟ میٹر (matter) تو زیادہ سے زیادہ شکلیں ہی بدلے گا۔ معدوم ہونے کی صلاحیت اُس کے پاس کہاں ہے۔!!)

ہم نے جانوروں اور انسانوں میں جو فرق بتانے کی کوشش کی، وہ ایک لفظ پر مشتمل ہے:
محنت............اور محنت تو اوزار بنانے سے شروع ہوتی ہے۔

ہاتھوں، بات کرنے کے اعضاء اور ترقی یافتہ دماغ کے مل کر کام کرنے سے نہ صرف انفرادی انسان میں ترقی و ارتقا تیزی سے جاری ہوا بلکہ انسان' سماج کے اندر زیادہ سے زیادہ پیچیدہ کام کرنے کے قابل ہوا......انسان بلند سے بلند تر مقاصد حاصل کرنے کے قابل ہوا۔

بلوچی تھیریم کی دریافت کے بعد بہت عرصہ تک کیا ارتقا ہوا اس بارے میں بلوچستان ابھی تک خاموش ہے۔ اس دور کی کوئی دریافت ابھی تک سامنے نہ آئی۔ البتہ پچھلی صدی کی اسّی کی دہائی میں بلوچستان کے شمال مشرق میں موسیٰ خیل کے علاقے میں موجود قدرتی غاریں سائنس دانوں کی توجہ حاصل کر گئیں۔ اِن قدرتی غاروں کی دیواروں اور چھتوں پر بنی پینٹنگز نے آرکیالوجی کے ماہروں کو بالخصوص حیران کر دیا۔ ان میں شکار اور دیگر انسانی سرگرمیوں کو دکھایا گیا۔ اُس دور کا

انسان مصور تھا' سنگتراش اور مجسمہ ساز تھا۔ یہاں ہر طرف انسانوں اور جانوروں کی بنی ہوئی تصویریں موجود ہیں۔ جانوروں کی ہڈیوں کے فاسلز ہیں۔فرش پر آگ کی نشانیاں ملیں۔ ماہرین اِن لوگوں کو نی اینڈ تھال اور کرومیگنان قرار دیتے ہیں جن کا عہد 40ہزار سے لے کر اٹھارہ ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔(6)

ذرا بلوچستان سے باہر نکلیے تو معلوم ہوگا کہ چودہ لاکھ سال قبل کینیا میں ملنے والے انسان کو آگ استعمال کرنے اور اس پر کنٹرول کا فن آتا تھا۔ وہ پتھر کو بطور اوزار استعمال کرتا تھا۔ پھر کلہاڑی بنی جس میں پتھر دونوں طرف سے تراشا ہوا تھا۔ یہ کلہاڑی دستے کے بغیر سیدھا' ہاتھ میں پکڑی جاتی تھی۔ یہی چودہ لاکھ سال کا اوزار، ایتھوپیا میں دریافت ہوا تھا۔(یہ گیارہ ہزار سال قبل کے مہر گڑھ میں بھی دریافت ہوا ہے)۔

تیر کمان کی ایجاد ایک اور انقلابی ارتقائی قدم تھا جس کی وجہ سے جنگلی جانوروں کا گوشت ہماری غذا کا باقاعدہ جزو بن گیا اور شکار کا رواج عام ہوگیا۔..........شکار نے انسان کو سب سے زیادہ فاضل وقت مہیا کیا ۔ٹائم بچانے والا اوزار۔ شکار کے ساتھ ایک دوسری اہم بات بھی آ گئی۔اب گوشت کا بطور خوراک استعمال زیادہ سے زیادہ ہونے لگا۔ میں اگر ناول لکھ سکتا تو ایک ناول انسانی ارتقا کے اِس پڑاؤ تک ضرور لکھتا، اور اُس کا عنوان رکھتا: ''بڈّل (جڑ) خور سے گوشت خور تک''۔

گوشت تو بہت مقوی خوراک تھا۔ آدھا گھنٹہ گوشت کھانے سے آدمی دن بھر کے لئے شکم سیر ہو جاتا۔ اس لئے اب اُسے دوسری ایجادات کے لئے کافی وقت ملنے لگا۔۔۔۔الغرض وہ ہاتھ جو برچھی پھینکنے اور کمان کی تانت کھینچنے کے قابل ہوا وہ اب کوئی معمولی ہاتھ تو نہ رہا۔ وہ تو ایک دیو کا ہاتھ بن چکا تھا۔(مگر دیو تو محض ایک مائتھالوجیکل مظہر ہے، آزمانکی۔ اصل وجود تو انسان اور اُس کے ہاتھ کا ہے)۔

ایک اور بات سوچیں۔ جب سے بنی نوعِ انسان وجود میں آیا ہے وہ 99.9 فیصد وقت تک شکاری اور نقل اتارنے والا رہا، سٹیپی اور سبزہ زاروں جنگلوں پر حیرت زدہ۔(7)

اسی دور میں لوگ گاؤں میں بسنے لگے۔یعنی خاندان، اور اس کے بعد گاؤں وجود میں آیا۔ روزی کی جدوجہد نے انسان کو اشتراکِ عمل اور ارتقا پر مجبور کیا۔مشترکہ دشمن سے مدافعت کرنے یا اِس پر حملہ کرنے کے لئے تنہا لڑنے کے بجائے متحد ہو کر لڑنا زیادہ موثر تھا۔ ذرائع زندگی کی پیداوار پر انسان کو کسی حد تک قدرت حاصل ہوگئی۔

پتھر کا زمانہ تو انسانی ارتقاء میں ایک انقلاب تھا۔ ہمارا مہر گڑھ اِسی پتھر کے انقلابی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔اس عہد کی شروعات مٹی کے برتن بنانے سے ہوئی ......ٹوکریوں یا لکڑیوں کے برتنوں کو آگ سے بچانے کے لئے ان پر مٹی کا لیپ چڑھایا جانے لگا۔اس طرح جلد ہی یہ اندازہ ہوگیا کہ اندر کا برتن نکال لینے پر بھی مٹی کے سانچے سے کام چل سکتا ہے......مہر گڑھ دور کی نمایاں خصوصیت جانور پالنا، ان کی نسل بڑھانا اور پودوں کی کاشت کرنا ہے۔

چنانچہ یہاں خصوصی جانور پالے جانے لگے۔ کارآمد جانور۔ ایسے جانور جو دودھ دیتے تھے اور جن کا گوشت کھایا جاتا تھا۔

اس دوران عورتیں جنگلی اناج جمع کرتی تھیں۔اُن کا علم فصل اگنے کی سائنس میں بڑھتا گیا۔انہیں معلوم ہوگیا کہ ایک نیا پودا بیج کے ذریعے اگتا ہے۔تب عورت نے بیج کو زمین میں دفن کردیا۔ تجربہ کامیاب ہوا۔ یوں حضرتِ انسان کو خوراک کے لئے ایک اور چیز ملی: اناج۔ آج سے گیارہ ہزار سال قبل بلوچستان کا مہر گڑھ اناج اگاتا تھا۔

گورڈن چائلڈ نے اپنی کتاب'' تاریخ میں کیا ہوا؟'' میں آثار قدیمہ کی شہادتوں کی بنیاد پر ان تمام کاموں کی تفصیل دی ہے جن کی ابتدا کا کریڈٹ عورت کو جاتا ہے۔ وہ مندرجہ ذیل کام کرتی تھی: زمین جوتنا، اناج پیسنا، خوراک تیار کرنا، دھاگہ بنا کر لباس تیار کرنا، برتن اور زیورات بنانا، آگ کو محفوظ رکھنا، باغبانی کرنا۔ خاص طور پر زراعت کی ابتدا اُس نے کی۔ یونان سے لے کر چین تک دیومالائی قصوں کہانیوں میں بھی برتنوں، آگ اور زراعت کی دریافت کو عورت سے منسلک کیا گیا ہے۔ دنیا کے مختلف خطوں میں آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران عورتوں کی قبروں سے ملنے والی اشیاء مثلاً درانتی، آٹا پیسنے کا پتھر، چمچے تکلا وغیرہ ان دیومالائی قصوں کو خاصی حد تک سچا ثابت کرتے

ہیں۔ زرعی معاشروں میں عورت زراعت کی ابتداء کرنے کی وجہ سے زرخیزی کی علامت بن کر اُبھری۔جس طرح زمین پیداوار کے ذریعے انسان کو غذا فراہم کرتی ہے اسی طرح عورت کا افزائش نسل میں خاص کردار قدیم معاشرے میں عورت کے تقدس کی علامت بن گیا۔('دھرتی ماں' یا 'زمین ماں جیسی ہوتی ہے'' کا تصورعورت اور زمین کو مماثل قرار دینے سے پیدا ہوا تھا)۔

قدیم معاشروں میں جب کبھی قحط یا خشک سالی ہوتی تھی تو عورتیں ہی مختلف رسومات ادا کرتی تھیں اور ان میں مردوں کی شمولیت ممنوع ہوتی تھی۔ابتدائی زراعتی زمانہ میں عورت کی اسی اہمیت کی وجہ سے مادرانہ معاشرہ قائم رہا جب کہ مرد مختلف قبیلوں سے بیاہ کر لائے جاتے تھے۔عظیم فلسفی فریڈرک اینگلز نے اپنی کتاب''خاندان،ذاتی ملکیت اور ریاست کا آغاز'' میں ان تمام مفروضوں کو سختی سے مسترد کیا ہے کہ عورت ازل سے ہی مرد کی غلام رہی ہے۔آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران دریافت ہونے والی تمام مورتیاں قدیم دَور میں عورت کی حکمران اور افضل سماجی مقام کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔

اب تک ہم نے دیکھا کہ ہڈی (کم) اور پتھر (زیادہ) انسانی تجربے اور ریسرچ کے مرکز رہے۔چقماق کے پتھر، پتھر کے ٹکڑے کے کاش جیسی کئی ورائیٹیاں بنتی گئیں۔ایک دوسرے کو بتا بتا کر اور سکھا سکھا کر انسان اوزاروں کو کام کے مطابق مخصوص بناتا گیا۔ایسے مناسب پتھر کہاں ملیں گے، کیسے انہیں بہتر بنایا جا سکتا ہے اور کیسے انہیں بہتر استعمال کیا جا سکتا ہے۔اسی سائنسی انداز نے تو عام پڑے ہوئے بیکار پتھر کو تیشہ، آری، سوراخ کرنے والا آلہ، چاقو یا چھیلنے والا اوزار بنایا۔

اب ایک اور بات دیکھیے۔جب ہم چار سے دو پیروں والے انسان بنے تو ہمیں اپنے دونوں پیروں کی قدر کا زیادہ اندازہ ہونے لگا اور ہم اُن کی دیکھ بھال کرنے لگے۔بلوچی ضرب المثل میں چرواہے نے کہا''بگی ایں بھوری ایں میھی مس گند غاں تہ دور بیغئے پرمناں دِہ شفاذی آں گُشتہ''۔(پیاری بھوری بھینس!میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں درد ہو رہا ہے مگر مجھے بھی پیر کے ننگے پن نے بہت اذیت پہنچائی)۔بھئی حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔انسان بھائی نے اپنے لئے کسی طرح کے جوتے بنانے کے لئے زندہ بھینس کی کھال کاٹ دی۔جی ہاں یہ بلوچی ضرب المثل قدیم

ترین ہے۔کانٹوں اور نوکیلے پتھروں سے پاؤں کے بچاؤ کے لئے یہی کیا انسان نے۔یہ باٹا اور انگلش بوٹ ہاؤس تو بس کل پرسوں کے بنے ہوئے ہیں۔

3۔آگ کا استعمال اور بلوچستان

کھنڈرات نے بتادیا کہ مہر گڑھ والے لوگ شروع ہی سے آگ استعمال کرتے تھے۔
یہ سوال موجود ہے ہی کہ اُن سے پہلے قرب و جوار میں کونسی ایسی آبادی تھی جو آگ کے بارے میں جان چکی تھی اور اپنے اردگرد کی جکڑ بندیوں سے انسان کو آزاد کرنے کا پہلا عظیم قدم اٹھا چکی تھی۔ مگر آگ پیدا کرنے کے بعد اُسے جلتے رہنے کے وہ طریقے آج تک قائم ہیں۔اس لئے کہ ابھی حال تک بلوچستان بھر کے گاؤں میں جہاں ماچس وغیرہ موجود نہیں تھی، باقاعدہ راکھ کے نیچے موجود چنگاریوں کو محفوظ رکھا جاتا تھا۔گاؤں والے اس آگ کو کبھی بجھنے نہ دیتے۔کمال ہے کہ جب آپ گریک مائیتھالوجی کا مطالعہ کریں تو آپ کو آبادی اور گھر کی دیوی ہستیا(Hestia) کا نام ملے گا۔ وہاں ہر گاؤں میں ہستیا کے نام کی آگ روشن تھی اور اُسے بجھنے نہ دیا جاتا تھا۔بلوچ' لگتا ہے یونان کے دیوتاؤں کی قوم ہے۔(پتہ نہیں ہم''ہستی'' دولت کو کیوں کہتے ہیں' اور''ہستمند'' دولتمند کو کیوں کہتے ہیں!!......ہست،ہستی،ہستیا!!)

بلوچستان میں بھاگ ناڑی سے لے کر میرے گاؤں ماوند تک میں دن رات موجود آگ ایک جگہ پہ موجود ہوا کرتی تھی۔اور آس پاس کے گھروں کو جب بھی ضرورت پڑتی وہ''ہستیا'' کی اِس آگ پہ پیش اور کھجور کے تنکے ڈال ڈال کر اور پھونکیں مار مار کر اُس چنگاری کو شعلوں میں بدل دیتے تھے اور لکڑی یا پیش اُس سے جلا کر اپنے چولہے کو گرم و روشن کرنے لے جاتے تھے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ تیل اور گیس کا رِسنا اور آسمانی بجلی سے اُس کا آگ پکڑنا''دائمی مشعل'' کی ابتدا ہے جو کہ قدیم فارس کے آگ پوجنے والے مذاہب کا مرکز ہے(8)۔آگ خوف تھی، دہشت تھی، نقصان دِہ تھی، جلا کر مار دیتی تھی، اس لیے یہ مذہبی دیوی بنی۔آگ کو انسان نے ایجاد تو نہیں کیا لیکن جس دن سے اُس نے آگ کا استعمال سیکھا اُس روز انسان واضح طور پر

جانوروں سے بلند اور الگ ہوگیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ آگ کے استعمال سے اُس نے اُس آگ سے دوسرے جانوروں کو ڈرانا شروع کر دیا جس آگ سے وہ ابھی تک خود ڈرتا تھا۔

ہم اِس بات کے لیے کوئی اور ثبوت کیا لائیں کہ کس طرح رگڑ رگڑ سے آگ پیدا کی جاتی تھی۔ اس لئے کہ آج بھی، اکیسویں صدی کے اندر پوڑ (چلم) پینے والے ہمارے قبائلی اپنے تمباکو والی پوٹلی میں چقماق والے پتھر کا ٹکڑا (آژگیڑ) اور ایک چاروں انگلیوں پر فٹ آنے والا لوہے والا کلپ (چقمق) ڈالتے ہیں اور ساتھ میں شورہ سے بھگو کر خشک کیا ہوا پیٹش کا باریک ریشہ (پُڑ) ہوتا ہے۔ اور جب بھی دو کش لگانے کی طلب ہوئی جیب سے پوٹلی نکالی۔ چلم میں تمباکو بھرا۔ اور پھر چقماق والے پتھر پر پُڑ رکھ کر اسے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ لیا، دائیں ہاتھ میں لوہا پہن کر اسے اوپر نیچے پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر چنگاریاں نکلوائیں۔ ایک آدھ چنگاری پُڑ پر لگ جاتی ہے اور وہ آگ پکڑ لیتی ہے جسے اٹھا کر چلم میں تمباکو پر ڈالیں اور سُوٹا دیدیں۔............ جی ہاں، یہ آج کا، اکیسویں صدی کا روزمرہ ہے ہمارے قبائل میں۔

مہرگڑھ میں آگ پر ہر طریقے سے انسان کی حاکمیت قائم رہی۔ آگ کیا ہے؟۔ آگ حرارت ہے۔ آگ خوراک کو انسانی شکل عطا کرتی ہے، آگ روشنی ہے۔ آگ درندوں سے حفاظت کرتی ہے۔ بالخصوص لگڑ بھگڑ (اپتار) آگ کی موجودگی میں کبھی کسی تنہا مسافر پر حملہ کرنے کی جرات نہیں کرتا۔ آگ ہی کی بدولت اب انسان موسموں کے فرق کا محتاج نہ رہا۔ وہ اب جہاں چاہے جا سکتا ہے۔ اگنی دیوی نے سورج دیوتا کی غلامی کو بھی کم کر دیا۔ بہت سے کاموں کے لئے اب انسان نے صبح کی روشنی ہونے کا انتظار کرنا چھوڑ دیا۔

پھر، آگ اور گوشت کی جوڑی انسانی ارتقا کے لیے فیصلہ کن جوڑی رہی ہے۔ گوشت والی خوراک دو فیصلہ کن اہمیت کی نئی ایڈوانسوں تک لے گئی: آگ کا سُدھانا اور جانوروں کا سدھانا ۔ آگ نے ہاضمے کے پراسیس کو مزید مختصر کر دیا اس لئے کہ اس نے منہ تک خوراک کو پہلے ہی نیم ہضم شدہ انداز میں پہنچا دیا۔ جانور سُدھانے سے اُس کے ہاتھ خوراک کا ایک نیا' باقاعدہ سپلائی والا سرچشمہ آ گیا۔ جانور سدھانے سے نہ صرف گوشت مستقل طور پر میسر آیا بلکہ دودھ اور دودھ سے

بنی اشیاء کے بطور خوراک کا ایک اور اہم اور مقوی سرچشمہ میسر آیا۔ آگ اور جانوروں کے سدھانے نے انسان کو آزاد ہو جانے کے نئے ذرائع بخش دیئے۔

آگ کا بادشاہ بننے کے فوائد کی اصطلاحیں اور سائنس بہت دیر بعد سمجھی اور لکھی گئی۔ مگر آگ تو بہت بڑی طبعی طاقت ہے۔ اس سے انسان کیمیائی تبدیلی کا حاکم بنا۔ فطرت کی مخلوق انسان' فطرت کی دیگر مخلوقات و موجودات پر بادشاہی کرتے کرتے آگ جیسی عظیم قوت پر فتح پا گیا تو سمجھیے کُل کائنات کو قبضہِ قدرت میں لینے کا دریچہ کھل گیا۔ پہلی چنگاری نکلی، انسان کے دماغ میں فکر کی ہلچل مچی۔ اِس چنگاری نے شعلہ بنایا انسانی استعجاب نے کھوج کی شکل دھار لی۔ سوکھی جھاڑی شعلوں میں بدلی تو روشنی اور حرارت دیکھ کر شعلہ ایک الگ سائنس بنا اور حرارت الگ۔ اور پھر پوری ٹہنی نے اپنی شکل بدل کر راکھ کر لی تو پھر تو مادے کی مختلف شکلیں سامنے آئیں۔ یعنی ایک ٹہنی کے جلنے نے ٹھوس (ٹہنی) کو گیس (دھواں) اور مادے کی دو دیگر شکلوں اور اجزا یعنی راکھ اور حرارت (انرجی) میں ڈھال دیا۔ بھئی پوری انسانی نسل گذشتہ دس ہزار سال سے اسی ٹہنی کے جل جانے کے عمل پر مبنی اکیسیویں صدی والی سولائزیشن بنا دی گئی ہے۔ آگ کو بجھنے نہ دینے، اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک ٹرانسپورٹ کرتے رہنے' اور اسے استعمال کرتے رہنے' سے انسان جانوروں کی دنیا کا محض ایک ممبر ہونے کے بجائے اس کے قبیلے سے حتمی طور پر نکل گیا۔ اب وہ انسان بن گیا اور خود کو مخلوقات کا اشرف بنانے کی عملی صورتیں کرنے لگا۔............ آگ کی دریافت انقلاب تھی۔

دائمی شعلہ جو آج ہر ملک کے دارالحکومت میں آپ کو نظر آئے گا، تاریخی حوالے رکھتا ہے۔ اولمپک کھیلوں میں یونان کے اولمپکس مشعل پر غور ضروری ہے۔ انسان کو آگ کا استعمال سکھانے والے یونانی دیوتا ''پرومی تھی اُس'' کا نام آتے ہی دلوں میں اس افسانوی کردار کے بارے میں احترام کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جی ہاں، انسان نے آگ کا استعمال سیکھا تو دیوتا بہت ناراض ہو گئے۔ اُن کی حکمرانی جو محدود ہو گئی۔ اور آج تک روشنی اور انرجی کی مد میں تحقیق و دریافت جاری ہے۔ آج تک دیوتا اپنی اتھارٹی کی محدود سے محدود تر ہوتی ہوئی سرحدیں بے بسی سے دیکھ رہے ہیں۔ انسان کا پھر بھی خیال ہے کہ دیوتا اُس سے جلے بھُنے نہیں بیٹھے بلکہ اُس کی

دعاؤں کو قبول کرنے بیٹھے ہوئے ہیں۔انسان دیا ہو کر ہواؤں سے ضمانت ملنے کا آس لئے بیٹھا ہے! عجب سادہ ہے انسان!!

جلنے کے حیرت انگریز پراسیس اور حرارت کی تجسس بھری طاقت پہ قابو کے لئے اس نے اوزار بنائے۔اوزار............اوزار............اوزار۔لگتا ہے انسان پیدا ہی اوزار بنانے اور استعمال کرنے کے لئے ہے۔ چاکر کے دور کا قصہ تو یاد ہے جب حاکم نے نہتے آدمی کے خلاف دندناتا ہوا ہاتھی چھوڑ دیا تھا۔اُس نہتے شخص نے خود کو اُس دیو سے صرف اور صرف اوزار کے ذریعے نہ صرف بچالیا بلکہ اُسے بھاگنے پر مجبور کیا۔کونسا اوزار؟ نہتا اور اوزار؟ ۔جی ہاں' نہتے انسان نے فطرت کی دیگر چیزوں سے اوزار کا کام کیا۔بھئی اچانک ایک کتے کا پلّا اوزار بنا،اُس چیختے چلاتے پلّے کو ہاتھی کے سونڈ پر دے مارا، ہاتھی گھبرا گیا اور دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

چاکرِ ترکوں اور لاشاریوں سے شکست کھا کر سبی چھوڑ کر مشرق کو جارہا ہے۔ترک' ہاتھیوں کے لشکر کے ساتھ، اُس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ بھاگتے ہوئے رِند اپنی فیملیوں کے ساتھ اونٹوں کے قافلے میں، حالیہ مری علاقے میں چاکر دریا کے ساتھ ساتھ جارہے ہیں جب انہیں پیچھے سے ہاتھیوں کی ترک فوج آتی نظر آتی ہے۔دانش کی مالکن حانی فوراً ننھے شتر بچوں پر لکڑیاں لادنے کا حکم دیتی ہے۔اس کام کی تکمیل پر لکڑی لدے اِن نوجوان شتر بچوں کا رخ ہاتھیوں کی ترک فوج کی طرف کر دیتی ہے اور لکڑیوں کو آگ لگا دیتی ہے۔شعلہ بردار بدکے ہوئے شتر بچے ہاتھیوں کی فوج کی طرف سرپٹ بھاگتے جاتے ہیں۔ ہاتھی ڈر جاتے ہیں، بدک جاتے، پسپا ہوتے ہیں۔اپنی ہی فوج کو پیروں تلے کچلتے جاتے ہیں۔ترک فوج ہاری،اور چاکر جیت گیا............پرومی تھی اُس والی آگ جیت گئی............اوزار جیت گئے۔

4۔حیوان.....ناطق بنا،انسان بنا!

ہم بہت عرصے تک فارسی کے نامور شاعر ابوالقاسم فردوسی کے اِن اشعار کو بلوچوں کا مخزن و منبع وابتدا سمجھتے تھے:

سپا ہے زگردانِ کوچ و بلوچ
سگا لیدہ جنگند مانندِ غوچ
کسے در جہاں پُشت ایشاں نہ دید
زآہن یک انگشت نامہ پدید
سپید ارِشاں اَشکش تیز ہُش
کہ بارائے دل بودو بامغز ہُش
درفشش بیاوردہ پیکر پلنگ
ہمی از درفشش بیا رندجنگ

آفاقیت کبھی کبھی ہماری نزدیک بنی پہ قہقہے لگا کر ہنستی ہے۔مثلاً دیکھیے کہ آج تک ہم بلوچ،اس بحث میں مبتلا رہے ہیں کہ ہماری زبان کی ساخت و پرداخت کیا ہے۔ پہلوی، سنسکرت، دراوڑ............وغیرہ۔دوسری زبانوں سے ہمارے رشتے ناطے کیا ہیں؟ اور ہم تاریخ میں کس جگہ کھڑے ہیں؟۔

یہ بلاشبہ سائنسی اور جائز بحث تھی' اور ہے۔مگر اس میں ایک اونٹ جتنا بڑا مضائقہ ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ ہماری دسترس میں محض پانچ سو برس کا بلوچی ادب رہا ہے اس لئے ہم چاکر رند کے عہد کو اپنی اس لسانی بحث کا نقطۂ آغاز گردانتے چلے آرہے ہیں۔اُدھر مہر گڑھ تہذیب کھڑی ہم پہ مسکرا رہی تھی۔ جی ہاں۔ہم پانچ سو سال کے بجائے گیارہ ہزار سال پرانے لوگ ہیں۔مبالغہ آمیز تکبر نہ گنا جائے تو میں کہہ دوں کہ سارے وسطی اور جنوبی ایشیاء کے انسانوں،اُن کی تہذیبوں اور زبانوں کا منبع ہم ہیں۔

اِدھر ہی سے تو الفاظ پھوٹنے لگے تھے،معانی بننے لگے۔ جتنے ابتدائی انسان ہوں گے، اُن میں زبانیں بھی بے شمار ہونگی۔مگر جوں جوں سماج ترقی کرتا گیا اور انسانوں میں باہمی روابط بڑھتے گئے ،معیاری اور واحد زبان وضع کرنے کا عمل بڑھتا گیا۔پتھر کے زمانے تک تو زبانوں کی تعداد میں اچھی خاصی کمی آئی۔اور اس کے بعد تو اس عمل میں بہت تیزی آئی۔

مہرگڑھ تہذیب میں انسان جنگل کی زندگی اور شکار سے ارتقاء کرتے ہوئے زراعت میں داخل ہو چکا تھا۔ جہاں موسم سے متعلق الفاظ کی ساخت اور ضرورت بڑھ گئی تھی ۔شب و روز کے مختلف پہرا اہم بن گئے ۔ جہاں' وہ خواہ جس طرح بھی اِن پہروں کو ناپتے ہوں گے لیکن طلوعِ آفتاب، دوپہر، غروبِ آفتاب اور نیم شب کے لئے الفاظ تو مخصوص ہو چکے ہوں گے۔اور آسمان پہ رنگوں کی تبدیلی سے بارش کے اندازے والے ماہرین وجود میں آ گئے تھے ۔پھر ستاروں کی حرکت اور مقام ایک الگ سائنس بن گئے ۔اور اگر چار آدمی بھی اُس تہذیب سے زندہ رہے تو انہوں نے پَور (Pleiades)، تیر بند (Orion)، عقرب (Scorpio) اور تخت (Ursa Major) نامی ستاروں کے مروج ناموں کو تسلسل ضرور بخشی ہوگی ۔مہرگڑھ تہذیب اور اس سے وابستہ انسان کبھی تباہ و ختم ہوئے ہی نہیں ۔تو اُن کی (گیارہ ہزار، منفی، پندرہ سو = نو ہزار پانچ سو برس) قدیم زبان بھلا کہاں گم ہوئی ہوگی !!! ۔قدیم زبانیں مکمل طور پر کہاں مرتی ہیں !۔

مہرگڑھ زبان کے وہ عناصر جو ماضی کی دھند میں دھندلائے نہ جاسکے، اور پیداواری رشتوں میں تبدیلی کا ساتھ دیتے رہے۔ وہ بلاشبہ عہدی تقاضوں کی تکمیل کی خاطر نئی نئی صورتیں اختیار کرتے چلے گئے ۔اُن میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔اُن کی صوتی ادائیگی بھی ڈھلتی چلی گئی ہوگی ۔اِن اضافوں، ٹرانسفارمیشنوں نے انہیں کیا سے کیا بنا ڈالا ہوگا۔ بلاشبہ مہرگڑھ زبان کے اکثر الفاظ اب تک آج کی مروج زبان کی گہرائی میں کہیں پڑے ہوئے ہیں ۔نئی زبانیں قدیم زبانوں ہی کے کھنڈرات پر بنتی ہیں۔ ہم کسی بھی زبان کو غور سے دیکھیں تو اس میں اس کی پچھلی زبانوں کے الفاظ اور نام (انسانوں اور جگہوں کے نام) زندہ انداز میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم اُن سابقہ زبانوں ہی سے ہل چلانے کے اوزار اور اصطلاحات، جھُگی جھونپڑی کے اجزا، اماں، ابا، جانوروں گھوڑوں کے الفاظ، دیوی دیوتاؤں اور جنوں بھوتوں کے الفاظ لیتے رہے۔......لہذا جب تک درۂِ بولان اپنے سینے میں بند، بلوچی کی گیارہ ہزار سال قبل والی جڑوں کا ہمیں درشن نہیں کراتا، اس وقت تک ہمیں معلومات کی اِسی تنخواہ (چاکری عہد) پر ہی گزارہ کرنا پڑے گا۔

جہاں تک بلوچی زبان کی تحریری شکل میں آنے کی بات ہے تو یہ واضح ہے کہ قدیم

زبانوں کی تو بات ہی چھوڑیے' نئی زبانیں بھی تحریری شکل اختیار کرنے سے سینکڑوں ہزاروں برس قبل، وجود میں آ چکی ہوتی ہیں۔

ویسے بھی جب مہرگڑھ، نوشہرو بنا تھا، اور بعد میں نوشہرو پیرک منتقل ہو گیا اور پیرک موئن جوڈرو اور ہڑپہ نقل مکانی کر گیا اور پھر جب بلوچ حالیہ زمانوں میں بحیرۂ بلوچ کے آر پار کئی خطوں میں آن بسے تو اُن کی معاشی و سیاسی زندگی افغانستان سے لے کر چین تک سارے نئے رابطوں سے متاثر ہوتی رہی ۔ بلوچی زبان و ثقافت کئی گنا امیر ہوتی رہی ۔ یوں' آج ہمارا واسطہ ایک زندہ، متحرک اور کمال درجے کی ترقی یافتہ زبان، بلوچی سے ہے ۔جس میں اگر ایک طرف مہرگڑھ کی قدامت کا ذائقہ موجود ہے تو دوسری طرف کراچی کی سرمایہ دارانہ صنعت اور ترکمن و افغان سوشلزم کے الفاظ و تراکیب کا حسن باہم شیر و شکر، جلوہ گر ہیں۔

اب چونکہ اُس ماں زبان کے بارے میں ہم ابھی کچھ نہیں جانتے لہٰذا نزدیک بینی کے مرض میں مبتلا ہیں ۔اور محض آٹھ نو سو برسوں والے حالیہ عہد میں زبانوں کی تقسیم و درجہ بندی کرنے کے قابل رہ گئے ہیں۔ مہرگڑھ کی زبان ابھی دریافت و عدم دریافت کے چلمن کے پیچھے رقصاں ہے۔اس لئے ہم آج کی بلوچی زبان کو اُکھڑی جڑوں والی زبان قرار دے کر اس پر بات کرنے پر مجبور ہیں۔

ایک بہت ہی دلچسپ بحث یہاں کی زبانوں کے بارے میں چلتی رہی۔ مہرگڑھ، پیرک اور نوشہرو کی دریافت سے قبل ہماری ہر بات کو آریا قافلے کے آخری اونٹ کے ساتھ باندھ دیا جاتا رہا ہے۔ بلاشبہ آریا لوگ آ کر ہم میں مدغم ہوئے اور وہ ہم سے اور ہم اُن سے بنے ۔اِس طرح آریاؤں کی زبان ''سنسکرت'' (معنی = تراشیدہ، شستہ اور صاف کیا ہوا) کو ہم سب کی زبانوں کی دادی بنا دیا گیا۔لہٰذا یہاں کی ہماری زبانوں کے لئے ''پراکرت'' (خوردو، جنگلی، فطری، ناتراشیدہ) لفظ استعمال کرنے لگے ۔مگر جس طرح آریا اپنے تمام تر ویلیو سسٹم کے ساتھ ہم سے گھل مل گئے اسی طرح ہماری زبانیں بھی باہم یوں جذب و انجذاب کے عمل میں گئیں کہ اب ایک ہی زبان بن گئی۔

ماہرین ابھی تک یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ مہرگڑھ کونسی زبان بولتا تھا۔ مگر اُن کی کھوج

کے مطابق انڈو ایرین زبان بولنے والے لوگ 1500 قبل مسیح میں پیرک میں آباد ہو گئے تھے۔ اور وہیں سے یہ لوگ پنجاب چلے گئے۔ سینکڑوں سالوں پر مبنی اس نقل و حرکت میں لوگ باہم شیر و شکر ہوتے رہے۔ (10)

حوالہ جات

1۔ پاؤلو کوئہلو۔ دی ڈیول اینڈ مس پریم۔ 2001۔ ہارپر کولنز پبلشرز۔ صفحہ 71

2۔ مارکس اینگلز۔ Selected Correspondence۔ ماسکو۔ 1965۔ نمبر 51۔ صفحہ 123

3۔ کلونیو، اتالو / راشد مفتی۔ درخت نشین۔ آج پبلیکیشنز کراچی، 2006۔ صفحہ 46

4۔ اینگلز، فریڈرک۔ دی اوریجن آف دی فیملی' پرائیویٹ پراپرٹی' اینڈ سٹیٹ۔ انٹرنیشنل پبلشرز نیویارک۔ 1973۔ صفحہ 251

5۔ اینگلز، فریڈرک۔ دی اوریجن آف دی فیملی پرائیویٹ پراپرٹی اینڈ سٹیٹ۔ انٹرنیشنل پبلشرز نیویارک۔ 1973۔ صفحہ 255

6۔ بلوچ۔ محمد رضا۔ بلوچستان، قومی ورثوں کی تباہی۔ 2009۔ قلات پبلشرز کوئٹہ۔ صفحہ 29

7- کارل ساگان۔ Pale Blue Dot1994 بیلنٹائن بکس۔ نیویارک۔ صفحہ XIV

8۔ کارل ساگاں۔ Billions & Billions۔ 1997۔ The Random House Publishing۔ نیویارک۔ صفحہ 118

9۔ کولن تج۔ دی ٹائم بیفور ہسٹری۔ Scribner نیویارک۔ 1996۔ صفحہ 244

10- عرفان حبیب۔ دی انڈس سولائزیشن۔ 2004۔ فکشن ہاؤس لاہور۔ صفحہ 99

باب چہار

مہر کا گڑھ ' بلوچستان

انسان جہاں جہاں زندگی گزارتا ہے وہاں اپنی نشانیاں ضرور چھوڑ جاتا ہے۔ اور جس دن انسان نشانیاں چھوڑے بغیر مر جائے، یا بعد کے انسان اُن نشانیوں کی تلاش ترک کر دیں، اُس دن انسانی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ ہمارے اجداد مہرگڑھ میں اپنی زندگانی کی نشانیاں چھوڑ گئے اور بعد کے انسان نے اُن نشانیوں کو تلاش کر لیا۔

ہماری اِس قدیم تہذیب کو 1974 میں فرانسیسی ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر جین فرانسو لیس اور اُن کے سائنسی رفقا نے دریافت کیا۔

اس بحث میں کوئی جان نہیں کہ مہرگڑھ کے لوگ بلوچ تھے یا نہیں۔ (اہرامِ مصر والی تہذیب کو پوری دنیا ''مصری تہذیب'' کہتی ہے)۔ اصل اور مزیدار بات یہ ہے کہ بلوچ نہ صرف مہرگڑھ تہذیب کے آل اولاد ہیں بلکہ اس تہذیب کے رکھوالے بھی ہیں۔ واضح رہے کہ مہرگڑھ سولائزیشن مصر اور میسوپوٹامیہ دونوں تہذیبوں سے پہلے کی ہے۔ مہرگڑھ 9000 ق م سے لے کر 2000 ق۔م تک آباد رہا۔

یہ بھی بے کار بحث ہوگی کہ آیا ہم اس تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں یا بس وہ یونہی بے بروثمر فنا ہوگئی۔ یہ تہذیب کبھی تباہ اور ختم نہ ہوئی۔ چنانچہ ہم بنیادی طور پر تو اُنہی لوگوں کی آل اولاد ہیں۔ اس لیے کہ ہم نے اپنے اِن اجداد سے موروثی طور پر صرف اپنا خدوخال، اطوار و عادات ہی نہیں لیے بلکہ ہم نے تو رہن سہن، زبان وثقافت کا بیج بھی وہیں سے پایا ہے اور اُسی سے نشوونما پا کر اکیسویں صدی تک کا تسلسل پایا۔

آیئے دیکھیں کہ اس کی اہمیت ہمارے iiے کیا ہے؟ اور اِس سلسلے میں ہمارا ترجمان عطا شاد کے علاوہ کون ہوسکتا ہے:

گِل کدہ

یہ زندگی بھی مسافتوں کا عجیب سا ایک سلسلہ ہے
یہ ایک بے انت فاصلہ ہے
رواں دواں پھر بھی قافلہ ہے

یہ گِل کدہ
جو مہک رہا ہے
صدا و صوت و نوا و نغمہ کی دھڑکنوں سے
کبھی اس امروز کا کوئی خوشگوار دیروز بھی ہوا تھا

کتابِ ماضی کا ایک اک حرف
اب بھی اس کی صباحتوں سے دمک رہا ہے
بصیرتوں کو ہمک رہا ہے
مثالِ طفلِ طلب، تراشے
یہ فکر کا ایک ایک گوشہ
شناخت کا ایک ایک لمحہ

یہ گِل کدہ
جیسے اک علامت ہے، اپنے عہدِ نظر گذشتہ کی روشنی کی
کہ جیسے سوئے ہوئے مقابر میں دفن، افسانے آگہی کے

گزرتے قرنوں کے کاروانوں کا اک نشانِ قدیم وخستہ
ازل سواروں کی راہواروں کے نقش ہائے سفر کشیدہ
ظفر کشیدہ

یہ گِل کدہ
جو مہک تو دیتا ہے
صوت ونغمہ کی دھڑکنوں کی
مگر اِک آغوشِ خواب دیدہ ہے
گنگزارِ محیط لگتا ہے
لیکن ایسا کہ سنسناتا ہے

کبھی اس امروز کا کوئی خوشگوار دیروز بھی ہوا تھا
کتابِ ماضی ورق ورق
ان صباحتوں سے دمک رہی تھی
بصیرتوں کو ہمک رہی تھی
یہی زمیں تھی جہاں گزرتے دنوں کا سبزہ
لہک اٹھا تھا
یہی زمیں تھی جہاں کبھی لہلہاتے لمحوں کی
فصل کٹتی تھی
عہدِ ماضی، مثالِ طفلِ طلب تراشے ہے
فکر کا ایک ایک گوشہ
شناخت کا ایک ایک لمحہ

میں سوچتا ہوں مگر کہاں وہ

جو نقطہ نقطہ حیات کی آیتوں میں معنی مثال اترے
وہ روزِ فردا کی روشنی کے قدیم فرزند
تیرگی کے عظیم فرزند

مہر گڑھ سبی سے تقریباً 26 کلومیٹر اور ڈھاڈر سے 10 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس مقام پر دنیا کا قدیم ترین تمدن دریافت ہوا ہے۔ دریافت ہونے والی اس تہذیب نے ثابت کیا ہے کہ بلوچستان کرہِ ارض کی قدیم ترین تہذیب کا گہوارہ تھا جو یہاں 9000 سال قبل مسیح میں ابھری تھی۔ بلوچستان میں مہر گڑھ کے آثار قدیمہ پر تحقیقات نے ظاہر کیا ہے کہ 9000 سال ہزار قبل مسیح یہ علاقے انسانی آبادی کے اولین مقامات تھے۔ لہٰذا یہ لوگ نہ صرف پاکستان اور جنوبی ایشیاء میں، بلکہ پوری دنیا میں قدیم ترین کلچر اور تمدن کے علمبردار تھے۔ یہ فخر یہ باتیں تو ہیں، تکبر کی نہیں۔ یہ فخر یہ بات ہے کہ بلوچستان دنیا کے سب سے قدیم انسانی آبادی کا مرکز ہے۔ مگر تکبر اس لئے نہیں کر سکتے کہ پندرہ بلین سال پرانی کائنات کے آگے محض گیارہ ہزار سال کی بھی کیا حیثیت ہے؟۔

مہر گڑھ میں کھدائی کے دوران ماہرین نے آبادی کی کُل سات تہیں دریافت کی ہیں۔ ان آبادیوں کی تہوں کی خصوصیات اور زمانہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اسی مہر گڑھ میں انسان پتھر یعنی ہجری دور میں رہا۔ اور پھر یہیں ہزاروں برس بعد دھات کے عہد میں داخل ہونے لگا اور تانبا دریافت کیا۔

مہر گڑھ کا زمانہ، بہت عرصہ تک پتھر کا زمانہ تھا، یعنی عہد عتیق، سنگی عہد، یا پھر حجری دور۔ یہ سارے لفظ بھاری ہیں۔ اس لئے ہم اسے سادہ والا ''پتھر کا زمانہ'' یا جدید حجری عہد کہیں گے۔ جیالوجی کی زبان میں اسے Neolithic (Neo = نیا، اور Lithic پتھر) کہتے ہیں۔ اس عہد میں انسان حیوان سے اچھا خاصا بلند ہوا۔ مہر گڑھ نے اِس Neolithic انقلاب کے تقریباً ہر مرحلے کو دیکھا ہے۔

پتھر کا زمانہ دراصل دوزخ والا زمانہ ہوتا ہے۔اس سے پہلے کا دور، قدیم کیمونزم کا دور تھا جہاں ایک فرد دوسرے کا مددگار تو ہوتا تھا، اسے لُوٹتا نہ تھا۔سعدیؔ کے بہشت کا زمانہ جہاں:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

کسے را باکسے کارے نہ باشد

اس عہد کا بلوچستان بہت دلچسپ تھا۔ دنیا کے قدیم ترین دندان ساز مہرگڑھ میں رہتے تھے۔9000 سال قبل مہرگڑھ میں دانتوں کو گلنے سڑنے سے بچانے کے لئے دانتوں کو ڈرل کیا جاتا تھا۔ یہ لوگ لکڑی کے سخت سروں والے ڈرل استعمال کرتے تھے جو کہ 20 چکر فی سیکنڈ کے حساب سے چلتے تھے۔ جدید عہد میں یہ 20 ہزار بار فی سیکنڈ کی رفتار سے گھومتے ہیں۔اٹلی کے محققوں نے یہاں سے 300 دفن شدہ ڈھانچے نکالے جن میں 9 کے دانت ڈرل شدہ تھے۔(1)

لوگ خوراک اکٹھا کرنے اور شکار کرنے کے مرحلے سے نکل کر آہستہ آہستہ خوراک ''پیدا'' کرنے کی طرف ارتقاء کرتے گئے، یعنی کاشت کی طرف۔ انسان اپنی خوراک کی سپلائی پر خود کنٹرول کے قابل ہوتا گیا۔اس کے لئے اس نے کھانے کے قابل گھاس، جڑوں، اور درختوں کو منتخب کر کے اُن کی کاشت کرنی شروع کی۔اسی طرح وہ اپنی خوراک کے قابل جانوروں کو پالتو بنانے اور سدھانے لگا اور انہیں چارہ لا کر دینے کے قابل ہوا۔یعنی اب وہ اپنے استعمال سے زیادہ خوراک پیدا کر سکتا تھا اور اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے لئے پیداوار کو بڑھا سکتا تھا۔ یہی تو انقلاب تھا۔ہم ایسے انقلابیوں کی آل اولاد ہیں جنہوں نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ ہمارے آباء شکار سے کاشتکاری کی جانب ترقی کر گئے۔

ٹکنالوجی بدلتی گئی۔جی ہاں۔ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ اُس کی اخلاقیات بھی بدلتی جاتی ہے۔(اخلاقیات اور قدریں بہت ناپائیدار ہوتی ہیں!!۔)

انسان نے پتھر کو پتھر سے ٹکرا ٹکرا کر پتھر کے اوزار بنائے۔ظاہر ہے کہ اِن ابتدائی پتھر والے اوزاروں کی سطح کھردری رہی، اور یہ کسی بھی طرح خوبصورت اور جاذبِ نظر نہ تھے۔

عہدِ عتیق کے یہ اوزار انسان کی مادی زندگی میں بہت ہی اہم تبدیلیوں کے ساتھی ہیں۔

ایک بار جب اوزار بننے شروع ہوئے (خواہ کتنی ہی ابتدائی صورت میں) تو پھر زمین اُن سے اپنی کاشت کا رقبہ اور کوالٹی بڑھواتی ہے، جو پھر انسان کو مجبور کرتا ہے کہ اوزاروں کو مزید بہتر اور تعداد میں زیادہ بناتا جائے۔

پتھر کے زمانہ تک چونکہ مرد اور عورت کے درمیان تقسیمِ محنت ہو چکی تھی اس لئے عورتیں بیج اور جڑیں جمع کرتی تھیں اور مرد شکار کیا کرتے تھے۔عورتوں نے محسوس کیا ہوگا کہ جنگلی اناج جمع کرتے رہنے پر خود کو محدود کیا جانا مفید نہیں ہے۔اس لئے انہوں نے زمین میں بیج ڈال کر اپنی خوراک کی ترسیل بڑھا دی۔پتھر کی کلہاڑی سے وہ نسبتاً آسانی کے ساتھ درخت کاٹ کر زمین صاف کرتی تھیں اور نوکیلے پتھروں سے زمین کھودنا آسان ہوتا گیا۔اسی طرح تیروں کا تیز اور ہموار سرا شکار میں آسانی پیدا کرنے لگا۔

مہرگڑھ میں یہ ساری نشانیاں 9000 سال قبل مسیح کی تھیں جو سائنس دانوں کو ملی ہیں۔

ماہر آثار قدیمہ ژریگ نے مہرگڑھ کو مندرجہ ذیل ادوار میں تقسیم کیا ہے:

1۔ مہرگڑھ، وَن

(9000-6000 ق م)

مہرگڑھ کا اولین دور یعنی ''مہرگڑھ ون'' 9000 سے 6000 قبل مسیح تک کا ہے۔یعنی تین ہزار سال......اس دور میں یہاں کے لوگ نیم خانہ بدوش تھے۔اس زمانے میں اس گاؤں کے لوگ دھوپ میں سکھائے گئے گارے کی اینٹوں کے مکانوں میں رہتے تھے۔ یہ گھر چھوٹے مستطیل کمروں میں تقسیم تھے۔ ہر مکان میں ایک کھلا صحن بھی تھا جس کے آثار دیکھے جا سکتے ہیں۔ان مکانات میں کمروں کی تعداد 6 سے 10 تک ہے۔ان مکانوں میں آگ جلانے کی انگیٹھی موجود ہوا کرتی تھی۔یہ مکان مٹی کی بنی اینٹوں سے تعمیر ہوتے تھے۔میں صرف ایک فقرہ کہتا ہوں آپ اُس کی تاریخی اہمیت کا حساب خود لگائیں: ''اِن مٹی کی اینٹوں میں بھوسہ استعمال ہوتا تھا''۔(2)

یہاں زراعت کی اولین نشانیاں ملی ہیں جن میں دالوں کی ہزاروں باقیات ملی ہیں۔

سات ہزار سال قبل مسیح میں کھجور کی فصل کی ابتداء یہیں سے ہوئی تھی۔ یہیں پر جَو کے دانے ملے ہیں۔

بلا شبہ کھیتی باڑی سے حاصل کردہ پودوں کی ایک بہت بڑی تعداد اناج والی خوراک مہیا کرتی ہے۔ چاول، گندم، جو، جوار، مکئی، اور آلو آج بھی بڑی بڑی آبادیوں کو مدد دیتی ہیں۔ مگر جن تہذیبوں نے آج کے ہماری تہذیبی ورثے کی تعمیر میں حصہ ڈالا، گندم اور جَو اُن کی معاشی بنیادوں میں موجود رہے ہیں۔ اناج کی یہ دونوں قسمیں کئی وجوہات کی بناء پر باقیوں سے مفید ہیں۔ ان میں بہت طاقت موجود ہوتی ہے' انہیں آسانی سے ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، پیداوار اچھی خاصی ہوتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ باقیوں کی بہ نسبت ان کی کاشت میں درکار محنت، کم اور آسان ہوتی ہے۔ اور یہ محنت موسمی ہوتی ہے، پورا سال اور چوبیس گھنٹے والی نہیں ہوتی۔ سردیوں کے شروع میں کاشت کرو، سردیوں ہی کے آخر میں فصل اٹھالو۔

چنانچہ مہرگڑھ کی تاریخی تہذیب اناج پر ہی کھڑی تھی۔ گندم اور جَو کوئی بہت بڑی انسانی ایجادیں نہیں ہیں۔ یہ تو بس جنگلی گھاس ہیں۔ صرف اس جنگلی گھاس کو پالتو بنا کر اسے اپنے قابو میں کرنا تھا۔ چنانچہ اس کو بطور بیج استعمال کرنا پہلی بڑی ایجاد تھی۔ اس کے بعد تو خود بخود پتہ چلا کہ جنگلی گھاس میں بہترین کونسی والی ہے۔ اور پھر حادثاتی طور پر پہلی کراس بریڈنگ سے نسبتاً اچھا بیج ہاتھ لگا، جس کے بعد انسان خود کراس کرتا گیا اور زیادہ قوت بخش اور مقدار میں زیادہ فصل والے بیج بناتا گیا۔ جب تک کسی مزید قدیم تہذیب کی دریافت نہیں ہوتی تو اس وقت تک حقیقت یہ رہے گی کہ دنیا میں گندم اور جَو کے یہ سارے تجربے ہوئے ہی بلوچستان میں، بلوچستانی عورت کے ہاتھوں۔

مہرگڑھ کے علاقے میں پائے جانے والے اناج میں ''جَو'' مقامی نوعیت کا تھا جو 8000 قبل مسیح میں کاشت کیا جاتا تھا۔ (3)۔ دیگر اجناس میں گندم کی مختلف قسمیں ملیں جو 5000 سال قبل مسیح میں کاشت ہوتی تھیں۔

زراعت نے لگتا ہے جانوروں کو پالتو بنا کر، انھیں پالنے کے عمل کو تیزی بخشی۔ بکریاں تو

پہلے ہی پالتو بنادی گئی تھیں، اب کے پکڑے گئے جنگلی گائے بیل اور بھیڑ کو بھی پالتو بنا کر اس کی نسل بڑھانے کا عمل شروع ہوا۔ یہاں جانوروں کے شکار کی علامتیں موجود ہیں جن میں بارہ سنگھا، نیل گائے، ہاتھی اور بھینسے شامل تھے۔ وہ لوگ بھیڑ بکریاں، گائے بیل پالتے تھے اور ان سے تقریباً وہ تمام فائدے حاصل کرتے تھے جو آج کا انسان حاصل کرتا ہے۔ جنگلی جانور بشمول چھوٹی نسل کے ہرن، نیل گائے، جنگلی سؤر، بارہ سنگھے، ہاتھی اور بھینسیں جو کہ اُس وقت سے قبل تک پالتو نہیں بنائے جا سکے تھے، اب خوراک کا اہم وسیلہ بن چکے تھے۔ لہٰذا شکار ابھی تک اپنی اہمیت سو فیصد ختم نہیں کر چکا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ شکار نے اپنی کم ہوتی ہوئی اہمیت کسی بھی دور میں ختم نہیں ہونے دی۔

یہ تو آپ خود سوچیے کہ اس قدر بہتات میں دستیاب شکار کے ہوتے ہوئے بھلا مچھلی اور پرندوں کے شکار کو کیا اہمیت حاصل ہو سکتی تھی۔

گندم اور جَو کی کاشت کا انقلاب بلوچستان کی عورت کا سب سے بڑا انقلاب تھا، نہ صرف انسانی خوراک کے لئے بلکہ جنگلی جانوروں کو گھر میں پالنے کے لئے بھی۔ اس طرح لائیو سٹاک کی بانی بھی دنیا بھر میں ہماری بلوچ یا بلوچستانی خاتون رہی ہے۔ اس عورت کا کمال دیکھیے۔ مثلاً اُس نے دس بھیڑوں یا بکریوں، اور دس آدمیوں کے لئے اِس سال کاشت کی۔ یہ تجربہ ہر لحاظ سے فائدہ مند رہا۔ اب اُسے بیس بھیڑ بکریاں پالنے کی ترغیب ملی، اُس کے کنبے میں بھی اگلے سال کچھ افراد کا اضافہ ہوا۔ لہٰذا اُسے اگلی بار زیادہ فصل کاشت کرنے کی ضرورت پڑی۔ یعنی زیادہ زمین تیار کرنی پڑی............ اَور زیادہ زمین' اور زیادہ بھیڑ بکریاں، اور زیادہ زمین' اور زیادہ بھیڑ بکریاں...... چنانچہ شکار پیچھے رہتا گیا اور کاشت کاری بڑھتی گئی............ چنانچہ کاشت کاری کے لیے درکار اوزار ترقی کرتے گئے۔ ہاتھ سے چلانے والا ہل ارتقا کرتا چلا گیا، کیاریاں بننے لگیں، کٹائی کے اوزار تعداد اور کوالٹی میں بڑھتے گئے، خوشہ سے دانہ نکالنے والے طریقے جدت پاتے گئے۔ دانے کو سٹور کرنے کے لئے جگہ بڑی کرنی پڑی۔ عورت! تم تو مہرگڑھ کے زمانے سے ہمیں پال رہی ہو۔

یہاں بچوں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ عورت نے کاشتکاری ایجاد کر کے انسانی زندگی کی

شکاروالی حالت ہی بدل ڈالی۔اب تک تو بچہ دس بارہ سال تک شکار کے لئے بے کار محض ایک بوجھ ہوتا تھا۔مگر اب وہ کار آمد، ذمہ دار اور کماؤ پوت تھا۔وہاں اب تو نوزائیدہ کے رونے سے بھی فصل چگنے والے بے برکت پرندے اڑ جاتے تھے۔ذرا سا بڑا ہوا تو دنبوں کے لیلوں کے ریوڑ (گوئرپڑ) اور زھگل (بکری کے لیلوں کے ریوڑ) کی چرواہا گیری بچے کے ذمے ہوئی۔پانچ سالہ بچہ تو کھیتی باڑی سے متعلقہ امور میں اچھا خاصا کار آمد انسان بنا۔اُس کی خوراک ٹھیک ہوگئی۔اُس کے مرنے کی تعداد میں کمی آئی۔اب اگر اُس کے پاس کھانے کو ایک منہ تھا تو محنت کرنے کو دو ہاتھ تھے۔منہ سے آوازیں نکالتا تو نہ صرف پرندے بھاگ جاتے، بلکہ بھیڑیں تعمیل کرتیں۔اس کے دو ننھے پاؤں کار آمد ہو گئے ۔ ہر لحاظ سے ارتقاء۔بچپن کی شادی اسی لئے تو کی جاتی ہے کہ افرادی قوت بڑھے۔بلوچستان میں دس ہزار سال قبل بھی بچہ فرد تھا۔بلوچستان میں دس ہزار سال بعد آج بھی بچہ فرد ہے،مکمل فرد!!

مہرگڑھ کے آثار قدیمہ میں پتھر کے بنے ہوئے بے شمار اوزار ملے ہیں۔ان میں پیسنے کی چکی، ہاون (جوغن)، اوزار تیز کرنے کا پتھر، پتھر کی کلہاڑی، پتھر کے برتن، اور پتھر کے تراشیدہ بلیڈ شامل ہیں۔کٹائی کے لئے پتھر کے آلات استعمال ہوتے تھے۔ظاہر ہے یہ عام پتھر نہ تھا۔اوزار کے لئے سب سے اچھا پتھر وہ تھا جو بھاری اور سخت ہوتا تھا۔انسان پتھروں کی شناخت اور انتخاب میں مہارت حاصل کرتا گیا۔دیرپا شکاری پتھر، اور اوزار کو تیز کرنے والا پتھر کونسا اور کہاں سے ملتا ہے۔سوچیے یہ سب کیا تھا؟ یہ سائنس تھی.......... باٹنی کی، زوالوجی کی، ایسٹرالوجی کی، کیمسٹری کی، فزکس کی، جیالوجی کی ۔۔۔مہرگڑھ انسان کے لئے سائنس حاصل کر رہا تھا اور اِسے آگے ہماری آنے والی نسلوں کو منتقل کر رہا تھا۔

اُس دور میں استعمال ہونے والی ہڈیوں کے بنے اوزار بھی یہاں ملے ہیں۔مہرگڑھ میں جانوروں کی پشم سے کپڑا بُنا جاتا تھا۔جی، ہاں اس ابتدائی دور میں کپڑا بننے کے آثار بھی ملے ہیں۔لوگ اپنے مُردوں کو دفن کرتے تھے۔اُن کے ساتھ اُن کے زیورات (خوبصورت پتھر کے منکوں کی مالائیں اور سیپ، گھونگے کے زیورات) بھی دفن کیے جاتے تھے۔

زراعت کے ابتدائی دور میں مہرگڑھ میں آباد لوگ بڑے بڑے برتن یا تو پتھروں سے بناتے تھے یا پھر پیش اور چمڑے سے۔وہی کچھ ہم آج بھی استعمال کرتے ہیں مثلاً مشک، اپان، ہیز، زِنک، بنڈو، گُندری، سُند، چٹائی......

المختصر، بلوچستان میں آبادکاری کا عہد 9000 سال قبل مسیح کا ہے۔اور اس اوائل وقت میں بھی یہاں ترقی یافتہ گاؤں موجود تھے، اور زراعت موجود تھی۔اور جب زراعت موجود تھی تو کیلنڈر بھی موجود تھا اس لئے کہ فصلوں کی بجائی، اور کٹائی کے لئے ماہ و روز مقرر کرنا ایک معمول تھا لہٰذا اسے سائنسی انداز میں متعین کیا گیا اور یاد رکھا گیا۔ساون (بشام) کب ہوگا، ''تِل گوہرانی دل'' کب ہوگا۔''اسّو پانغے مولہ کنت ہشکیں ڈغاراں سولہ کنت''...... بدروا ماذنہ یک گوشے ہورا میسیتہ دوہمی ہشکیں، سہیلہ استار، پنیر پُل بیثہ۔.......... اِسی مجموعے کو ماڈرن زمانے میں کیلنڈر کہتے ہیں جسے بلوچستان' گیارہ ہزار سال قبل بنا چکا تھا۔

2۔مہرگڑھ،ٹُو

(4000-5000 ق م)

پانچویں ملینیم (5000 سے 4000) قبل مسیح میں مہرگڑھ دوسرے دور میں داخل ہو گیا، جسے ماہرین نے مہرگڑھ دوئم کا نام دیا ہے۔لوگ تو وہی مہرگڑھ اول والے تھے، اس لئے کہ اس تہذیب کے تسلسل کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔اور ساتھ ساتھ اہم تبدیلیاں بھی تھیں۔

گھر اُسی طرح گارے کی اینٹوں سے بنے ہوئے تھے البتہ یہاں غلہ رکھنے کے گودام پہلے دور کی بہ نسبت وسیع تر ہیں۔یہ اس بات کی علامت ہیں کہ زراعت نے مزید ترقی کی تھی۔تار کول کے ٹکڑوں میں پیوست کی ہوئی پتھر کی بنی ہوئی درانتی کی بلیڈیں یہاں ملی ہیں۔دوسرے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے کہ اِس پورے براعظم میں ملنے والے فصل کی کٹائی کے خصوصی اوزار یہیں ملے ہیں۔

مہرگڑھ دوئم کے زمانے میں یہاں ملنے والے جَو اور گندم کے بیج ایسی قسموں کے ملے

جنہیں با قاعدہ آبپاشی کی ضرورت پڑتی ہے، جو کہ بہنے والی ندیوں پر چھوٹے چھوٹے بند باندھ کر حاصل ہوسکتا تھا۔

پانی پر کنٹرول حاصل کر کے ہی کپاس کے پودوں کو بڑے پیمانے پر پالتو بنایا جا سکا ہوگا۔

ٹیکسٹائل کا یہ معلوم منبع دنیا بھر میں سب سے پہلے مہر گڑھ دوئم (4000 سال قبل مسیح) سے ملا۔ یوں دنیا کی زرعی تاریخ میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا۔ مہر گڑھ کا انسان سوتی کپڑے پہنتا تھا جبکہ باقی دنیا ابھی پشم پوش تھی۔ ظاہر ہے سفید کپڑے ہوتے ہونگے کہ رنگینی شاید ابھی ترقی یافتہ شکل میں ایجاد نہ ہوئی تھی۔ اور یہ دلچسپ بات ہے کہ آج کا بلوچ بھی سفید پوش ہی ہے............مورخ اس سفید پوشی کو ماضی قریب کی آریائی خصوصیت گنتے آئے ہیں۔ ارے بابا' آریا تو مہر گڑھ کے مقابلے میں ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ہم تو اُن سے تین ہزار سال پہلے سے سفید پوش ہیں۔ لہذا اغلب گمان ہے کہ سفید پوشی آریاؤں نے مہر گڑھ کے ابتدائی لوگوں سے مستعار لی ہو۔

4000 سال قبل مسیح تک یہاں بکری سائز میں اچھی خاصی چھوٹی ہوگئی تھی اور بھیڑ کا حجم بھی کم ہونا شروع ہوگیا تھا، یہ پالتو بن جانے کی پکی علامتیں ہیں۔ ماضی میں تو کچھ کوہان والے جانور ابھی تک جنگلوں سے پکڑے جاتے تھے، مگر اب، ہڈیوں سے پتہ چلتا ہے کہ مہر گڑھ میں گوشت جنگلی جانوروں کی نسبت گھریلو پالتو جانوروں سے زیادہ حاصل کیا جاتا تھا۔

جب ایک دفعہ مویشی اور گائے بیل پالتو بنائے جاچکے تو پھر گوشت کے علاوہ بھی اُن کے فوائد سمجھ میں آ گئے۔ یہ تو ہم مہر گڑھ اول ہی میں بتا چکے ہیں کہ جانور کی جان لیے بغیر خوراک کی ایک اور قسم اُس سے حاصل ہونے لگی تھی: دودھ اور اُس سے بنی اشیا۔ اس طرح اصل جانور بھی محفوظ رہا اور اُس سے خوراک بھی حاصل ہوتی رہی۔

اِدھر سے پھر جانور پالنے میں انتخاب کا عمل شروع ہوا۔ پہلے تو ہل چلانے والے جانور کو ذبح نہ کیا جاتا تھا، اب دودھ دینے والی مادہ جانور کی نسل کو بھی برقرار رکھا جانے لگا۔

مرغی کے انڈے کو بھی دوسرے پرندوں کی طرف سے کھاتا دیکھ کر اُسے ایک اور خوراک بھی میسر آئی۔

اُس کے بعد پھر پشم کا استعمال بھی شروع ہوا، اس طرح ایک اور سلیکشن شروع ہوئی۔

پھر ایک اور کام اُن کی سمجھ میں آیا: جانوروں سے بار برداری کا کام۔

اسی دور میں اُس نے جانوروں پر سواری کا کام بھی لینا شروع کر دیا۔

کاشتکاری کے لئے کھاد انہی کے گوبر کو بنایا گیا۔

لہٰذا انسان نے، اب ہرا یرے غیرے جانور کو سدھانے اور پالنے کا کام چھوڑ دیا۔ وہ غیر کارآمد کو کاٹ کر گوشت خوری کرتا تھا۔ اور صرف اُس کے خدمت گزار اور کارآمد جانور ہی اُس کے آنگن میں رہنے کا مجاز ٹھہرے۔

سدھائے ہوئے جانور خوب بڑھنے لگے۔ خصوصاً بھیڑ بکریاں جو تعداد میں بہت تیزی سے بڑھتی ہیں۔ اب اِس بڑھتی ہوئی تعداد کے لئے پہلے سادہ سے باڑھ بنائے جانے لگے۔ مگر سردیاں عذاب ہوجاتی ہیں بلوچستان میں۔ چنانچہ لکڑی کے شہتیروں، بلّوں اور جھاڑیوں سے اُن کے لئے خصوصی جھونپڑیاں ''جُب'' بن گئیں۔ سردیوں میں پشم کی کٹائی نہیں کی جاتی تاکہ جانور گرم رہے۔ گرمیوں میں جب سخت گرمی پڑتی تو جانور پر سے پشم کا کوٹ اتارا جاتا تھا (ہم آج بھی اپنے انہی آباواجداد کی سنت پر چل رہے ہیں)۔

اسی طرح بارش اور گھاس کی کمی کی صورت میں اپنے ریوڑوں کے ساتھ عارضی طور پر اُن علاقوں کو جایا جاتا جہاں بارش ہوچکی ہوتی۔ اس طرح مویشی چراگاہوں اور میٹھے اور تازہ پانی کے جوہڑوں کے مزے لیتے۔ بہت سے ریوڑ یہ نقل مکانیاں کرتے۔

انہیں بھیڑیوں سے بچائے رکھنے کے لئے بھی افرادی قوت کی ضرورت ہوتی، اُن کا دودھ دودھنے، سٹور کرنے، لسی مکھن اور گھی بنانے کے لئے بھی لوگ چاہیے ہوتے۔ پھر خود اِن لوگوں کے لئے اناج اٹھانے اور روٹی پانی اور دیگر ضروریات کے لیے بھی افراد کی ضرورت پڑی۔ اِس طرح گاؤں کی اچھی خاصی آبادی نقل مکانی کرتی۔ اس عمل کو ہم ''کاہ چر'' (کاشر) کہتے ہیں۔

اِس بڑی آبادی کا بارش، گھاس اور موزوں موسم کی چاہ میں ایک جگہ سے دوسری کی طرف منتقل ہونا ماہ ڈیڑھ ماہ کے لئے بھی ہوتا تھا اور زیادہ عرصے کے لئے بھی۔ دوسرے لفظوں میں

یہ آبادی، نیم کاشتکار ہوتی تھی اور نیم مویشی بان۔ وہ کاشت اور کٹائی کے وقت کھیتی باڑی کرتے تھے اور بقیہ وقت مال چَرائی۔ یہیں سے بعد میں آبادی ایک نئی تقسیم محنت کی بنا پر دو حصوں میں بٹنا شروع ہوئی۔ مستقل کاشتکاری کا شعبہ الگ کرنا پڑا، اور مستقل مویشی بانی کا شعبہ الگ۔ یہی تینوں صورتیں یعنی مکمل کاشتکار، مکمل مویشی بان، اور نیم کاشتکار و نیم مویشی بان آج بھی بلوچ معاشرے میں موجود چلے آ رہے ہیں۔

مویشی بانی نے کاشت کاری کی طرح انسان کو اپنی خوراک پر کنٹرول عطا کر دیا۔ شکار تو چلتا رہا اور آج بھی ہوتا ہے مگر یہ اب امیروں کا چونچلے بن چکا ہے یا نوجوانوں کی پہاڑی جانور کی سجی خوری کا تھرل۔ انقلابات دیکھیے کہ جس شکار پہ اُس کا گزر بسر ہوتا تھا آج وہ محض ایک شوق رہ گیا ہے۔ اناج خور گاندھی بنتے بنتے، اب انسان اگر گوشت کھاتا بھی ہے تو بڑے ''مہذب'' انداز میں............ (گوشت خوری اور مہذب!!)۔ اب وہ باقاعدہ ذبیحہ کرتا ہے، وہ نہ تو پکانے میں بھاگم بھاگ کرتا ہے اور نہ کھانے میں وحشی پن۔ باقاعدہ انتظام و انصرام کرتا ہے۔

ابتدا کی عورتوں کی حادثاتی والی کاشتکاری کی سرگرمی اب انسان کی سب سے بڑی پیداواری سرگرمی بن چکی ہے۔ مہر گڑھ کا دوسرا دور کاشتکاری کی بالادستی کا دور ہے۔

کاشتکاری اپنے ساتھ ایک اور مظہر بھی ساتھ لائی: ذخیرہ کرنے کا مظہر۔ دوسری بات یہ ہے کہ شکار تو ایسا کام ہے جس میں ''آج کا کام آج ہی'' پر ہوتا ہے۔ جیسے مسیحی لوگ دعا مانگتے ہوئے کہتے ہیں: ''اے ہمارے باپ تو جو آسمان پر ہے، تیرا نام پاک مانا جائے، تیری ہی بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسے آسمان پر ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے......'')۔ مگر کاشتکاری میں اِس دعا کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس لیے کہ اس میں آج ہی کی روٹی نہیں ملتی بلکہ پورے سال تک یقینی ہو جاتی ہے، اس کے اپنے کنٹرول میں، اس کے اپنے سٹورز میں۔ اگلی فصل آنے تک۔ بلکہ اس اناج کا ایک حصہ تو بالکل الگ رکھنا ہوتا ہے بیج کے لئے۔

اس طرح سال بھر کی مقدار سٹور کرنے سے مویشی بانی کی زائد پیداوار، اور کاشتکاری کی زائد پیداوار نے تجارت کے راستے کھول دیے، چھوٹے پیمانے کی تجارت، پرانی، ابتدائی معمولی

تجارت.........اور یہ ایک اور انقلاب تھا۔

مہر گڑھ اول کی طرح یہاں بھی ابھی تک اوزار پتھر اور ہڈی کے ہی تھے مگر اب اُن کی ورائٹی بڑھ چکی تھی۔ سب سے زیادہ دلچسپی کی چیز جو ملی ہے وہ ''دستکار کی قبر'' ہے، جہاں وہ شخص ایک پالش شدہ پتھر کی کلہاڑی، تین چقماق کے پتھروں (جس سے وہ اوزار بناتا تھا)، جیومیٹری کے اصولوں پر بنے چقماق پتھر کے 9 ٹکڑوں اور سولہ چھلے ہوئے بلیڈوں کے ساتھ دفن ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح پتھر کے اوزاروں کو نئے نئے مقاصد کے لئے استعمال کیا جاتا تھا (4)۔

کئی ایسی بھری بھرائی ٹوکریاں ملی ہیں جو قربانی اور خیرات کی اشیاء کے ساتھ قبروں میں رکھی گئی تھیں۔ گھروں میں اعلیٰ دستکاری کے منکوں والے زیورات ملے ہیں جن سے ساحل مکران کے ساتھ ان کے گہرے روابط کا اندازہ ہوتا ہے (5)۔

سنگِ صابن ایک ایسا پتھر ہے کہ جس کو ہاتھ لگائیں تو چکناہٹ یا صابن کا احساس ہوتا ہے۔ اس سنگِ صابن اور سنگِ مرمر سے وہ مجسمے، آرائشی ظروف، ڈیکوریشن پیس، اور مہریں بناتا تھا۔ اسی طرح وہ عقیق نامی پتھر (جس میں مختلف رنگوں کی باہم ملی جلی پٹیاں اور تہیں ہوتی ہیں) سے جیولری بناتا تھا۔

عورتیں سرمہ بنا کر آنکھوں کو لگاتی تھیں اور اسی سے مصنوعی خال کے بطور خود کو حسین بناتی تھیں۔ ٹوکریاں بنانا پہلے ہی پارچہ بافی کی نشان ہے۔

مہر گڑھ میں انسانی تدفین ہمیں اچھی خاصی مذہبی رسومات کا علم بخشتی ہے۔ یہ لوگ موت کے بعد کی زندگی پر ایمان رکھتے تھے۔ (واضح رہے کہ ہم اسلام آنے سے نو ہزار سال پہلے کی بات کر رہے ہیں)۔ مہر گڑھ کے لوگوں کی قبریں مشرق سے مغرب کی جانب ہوتی تھیں۔ مردے کو قبر میں بائیں پہلو لٹایا جاتا تھا۔ اس کا سر مشرق کی طرف ہوتا تھا اور چہرہ جنوب کی طرف۔ ہاتھ اور ٹانگیں سیدھی نہ ہوتی تھیں بلکہ مختلف زاویوں میں مڑی ہوئی ہوتی تھیں۔ (6)

وہ لوگ مردے کو سیپیوں اور گھونگوں سے بنی سر کی پٹی، گلے کا ہار، کانوں کی بالیوں، کنگنوں اور، کمر بند جیسے زیورات کے ساتھ دفن کرتے تھے۔ دفن کرنے سے قبل مردے کو مکمل طور

سرخ مٹی چھڑک کر رنگ دیا جاتا تھا۔(7)(مہرگڑھ اول کے دور سے چلا آ رہا سرخ مٹی کا استعمال یہاں ذرا زیادہ ہوتا تھا)۔

قبروں میں مردے کے صرف اوزار ہی دفن نہیں کئے جاتے تھے بلکہ ذبح کئے ہوئے جانور بھی ساتھ رکھے جاتے تھے۔(یہ بہت دلچسپ ہے کہ وہ لوگ مردے کے پیچھے خیرات کر کے زندوں میں بانٹ کر اوپر والے کو خوش نہیں کرتے تھے' بلکہ مردے کے اپنے استعمال کے لیے اُس کے ساتھ ہی قبر میں ڈال دیتے تھے)۔اس کے علاوہ مرحوم کے زیور مثلاً فیروزہ کی مالا، نیلم اور گھونگھے بھی ساتھ ہی دفن کیے جاتے تھے۔اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ یہ نیم قیمتی پتھر مہرگڑھ کے قرب و جوار میں کہیں نہیں ملتے۔لہٰذا صاف بات ہے کہ یہ قیمتی پتھر دور دراز سے تجارت کے ذریعے لائے جاتے تھے۔اور پھر یہ قیمتی پتھر ساری قبروں میں موجود نہ تھے بلکہ کچھ قبروں میں دیکھے گئے ہیں۔ایسی زیورات کا کچھ قبروں میں پایا جانا اور باقیوں میں ان کا نہ ہونا سماجی فرق کے مزید بڑھنے کی نشاندہی کرتا ہے جو کہ پیداوار اور تجارت میں اضافے سے پیدا ہوا تھا۔

یہاں تھوڑا تھوڑا آرٹ بھی موجود تھا۔سرینڈا کی شکل کی مٹی کی بنی مورتیاں جنہیں سرخ مٹی سے رنگ دیا گیا تھا' اس اہمیت کا اظہار ہیں کہ سماج میں تفریحِ طبع اور دل پسندی متشکل صورت میں پیدا ہو چکی تھی۔مٹی کے بنے جانوروں کی مورتیاں بھی ملی ہیں۔آگ میں پکا کر سخت کئے ہوئے ہار کا دانہ ایک سلنڈر شکل میں ملا ہے جو زرخیزی اور نمو پذیری کو ظاہر کرتا ہے۔

یوں لگتا ہے کہ اس عہد کے لوگوں نے مورتیاں بنانے میں مہارت اور جدت پیدا کر لی تھی۔یہ مورتیاں ایسے فنکاروں اور صناعوں کی ہنرمندی اور چابک دستی کا نمونہ ہیں جو نہ صرف نقش ونگار بنانے میں کامل دسترس رکھتے تھے بلکہ انسانی ساخت' اعضا اور ان کی مختلف خصوصیات سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ان صناعوں نے اِن مورتیوں کو جس طرح بنایا ہے اس میں غالباً ان کی عقیدت اور شیفتگی کو بھی بڑا دخل تھا کیونکہ یہ مورتیاں ان کے مذہبی تصورات کا مرکز تھیں' اور یہی وجہ ہے کہ ان مورتیوں کو بڑی شفقت اور احتیاط سے بنایا گیا۔

بہت آگے جا کر تقریباً 3000 قبل مسیح کے زمانے کی جو مورتیاں دریافت ہوئیں وہ

بناوٹ کے لحاظ سے کافی جدید تھیں۔

کلی گل محمد، مہرگڑھ اول، اور مہرگڑھ دوئم یہ بتلاتے ہیں کہ اس وسیع، بارانی اور پہاڑی علاقے نے زراعت اور مویشی بانی کی معیشت کی پہلی شروعات دیکھیں۔خانہ بدوش مویشی بان غالباً سب سے بڑے تاجر تھے، پراڈکٹس کے بھی اور خیالات کے بھی۔وہ دور نزدیک ایک جگہ سے دوسری جگہ تک اشیا اور نظریات لے آتے جاتے تھے۔یہی لوگ ایک آبادی سے دوسری آبادی تک تجارت کے بانی بھی تھے۔

مہرگڑھ دوئم کے مرحلے میں برتن سازی آئی۔شروع میں گِل سے بھدی شکل کے' مگر کام آنے والے برتن بنائے جاتے تھے۔پھر درختوں کی شاخوں سے بنی ٹوکریوں پر کولتار کی تہہ چڑھائی جاتی تھی۔یہ گویا گل کے برتنوں کے قالب کے بطور استعمال کیا جاتا تھا۔(آج بھی بلوچستان کے خانہ بدوشوں میں اس طرح کی برتن سازی موجود ہے)۔

مہرگڑھ دوئم کے اواخر (4000ق۔م) کے آس پاس کمہار کا پہیہ آیا۔اس افقی پہیے پر برتنوں کو گھمایا جاتا تھا تاکہ تیز رفتاری کے ساتھ متوازن و متناسب صورت بن جائے جو کہ ہاتھ سے برتن بنانے میں ناممکن عمل تھا۔یہ ایجاد وقت بھی بچاتی تھی، اور اِس سے برتن خوبصورت بھی ہو گئے اور سستے بھی۔اور یہ ہر شخص کی قوتِ خرید کے اندر آ گئے۔

مہرگڑھ دوئم (4000ق۔م) میں دستی برمے اور کمہار کے چاک کی دریافت سے ثابت ہوا ہے کہ اس مقام پر یہ اشیاء، مشرقی ایران اور وسط ایشیاء کی بہ نسبت ہزاروں سال پہلے انسانی استعمال میں آ چکی تھیں۔4000 سال اور 2500 قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں مہرگڑھ اور اس کے بعض نواحی علاقوں میں دلکش نقش ونگار سے سجے ہوئے خوبصورت ظروف تیار کئے گئے۔

مہرگڑھ دوئم میں پائی جانے والی دوسری اشیاء اور چھوٹی بڑی منقش برتنوں پر بنی ہوئی انسانوں، جانوروں اور پرندوں وغیرہ کی تصاویر ہنرمندوں کی حیرت انگیز مہارت کو ظاہر کرتی ہیں۔عورتوں کی تصاویر میں زرخیزی اور تخلیق کی علامتیں موجود ہیں۔برتن سازی کی ٹیکنالوجی سائنس کی دنیا سے واقف کرنے کا ایک اور زینہ تھی۔

بہترین مٹی کے انتخاب سے لے کر برتن خشک کرتے ہوئے پانی کے ایک ایک مالیکیول کو باہر نکالنا......سب سائنس تھا۔ بلا شک وہ اس سارے عمل کو سائنس کی زبان دینے کے اہل نہ تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ وہ عام حیوانی زندگی سے بڑھ کر سائنس استعمال کر رہے تھے۔ یہ ہر لحاظ سے ایک ابتدائی کاشتکاری کی تہذیب تھی جہاں عملی فنون پر خوب توجہ دی جاتی تھی۔

مہر گڑھ میں 4000 برس سے زائد تک مسلسل آبادی رہی۔ 3000 برس ق۔م تک مہر گڑھ میں شہری آبادی تقریباً 75 ہیکٹر تک پھیل گئی تھی۔(8)

بلوچستان آج کی طرح اُس زمانے میں بھی ایسی آفتوں کا شکار ہوتا رہا جو زراعت اور مویشی بانی دونوں کو متاثر کرتی تھیں۔ ٹڈی دَل سبزہ کو چٹ کر جاتا تو مویشی بانی کہاں ممکن ہوتی؟۔ قحط اور موسمی شدت ہر روزی رساں وسیلے کو کاٹ پھینکتی۔ اُس وقت تک واحد خدا کا تصور نہ تھا۔ اس لیے اُن تمام قوتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، جنہیں اُس وقت کا انسان مویشی بانی اور کاشتکاری کو کنٹرول کرنے کا اہل تصور کرتا تھا۔ گرج (جس کے ساتھ آسمانی بجلی گرتی ہے) پر قادر قوت کو خوش رکھنا پڑتا تھا، بارش، سیلاب، سورج۔۔۔۔ کوئی نہ کوئی نظامِ جادو (عبادت کا نظام) جس سے یہ طاقتیں طیش میں نہ آئیں اور مہربان رہیں۔ خود زمین کی پیداواریت اور زرخیزی بڑھانے کے لئے زمین اور زمین داری کے کوئی دیوی دیوتا......

انسان اپنے شکار، اور گزر بسر کے لئے ابھی بھی فطرت کا محتاج تھا۔ وہ آسمان میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی مشاہدہ کرتا رہا۔ چاند کی تاریخیں، ستاروں کے مقام وسمت، سورج کی تپش اور زمستانی کیفیات ...... وہ ان ساری تبدیلیوں کے نباتات اور حیوانات پر اثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ فلاں درخت فلاں موسم میں پھول اور فلاں موسم میں پھل دار بن جاتے ہیں۔ پرندے فلاں موسم میں بچے جنتے ہیں، بھیڑیں بکریاں اور گائے سال میں کتنی بار بچے پیدا کرتے ہیں۔

سورج تو خیر ویسے ہی زندگی ہے۔ اُس کے اتنے اثرات وکرامات ہیں کہ آسمان پر انسان کی پہلی توجہ ہی سورج کی طرف جاتی ہے۔

اسی طرح چاند بھی توجہ کھینچنے والا سیارہ تھا۔ مادی ضرورتوں سے لے کر ادبی جمالیاتی

احساسات تک چاند ہمیشہ سے انسان کی دید کا محور رہا ہے۔

اسی طرح انسان کی ابتدا سے لے کر مہرگڑھ کی آبادیاں بسانے تک ستارہ شناسی ایک زبردست ضرورت رہی۔ سفری سمتوں سے لے کر موسمی تغیرات اور پہر گننے تک یہ ''ایسٹرا'' نامی وہ واحد سائنس تھی جس کی ترقی ہوتی رہی۔ سہیلہ استار، روشہ استار، قطبہ استار، مچیں پور، گرانڈ دِرِک ......دوسرے لفظوں میں آسمان کا علم (فلکیات) ہر دم توجہ پاتا رہا۔ فلکیات کا علم زمین جتنا تو نہیں ہوسکتا تھا اس لیے کہ زمین تو اس کی رسائی اور استعمال میں تھی۔ لیکن یہ دوسرے نمبر پر ضرور تھا۔ زمین آسمان دو ہی تو مظاہر تھے جن پر عقلی گھوڑے دوڑائے جا سکتے تھے۔

اسی دور کی مناسبت میں بلوچستان کی کوئٹ منڈا ہی وادی میں پتھر کی بنی ہوئی کلہاڑیاں ملی ہیں جنہیں انسان، کھانے کے لئے پودوں کی جڑیں نکالنے اور سست رفتار جانوروں کا شکار کرنے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ کوئٹ منڈا ہی کے لوگ ننگے پھرتے تھے، غاروں میں رہتے تھے اور تقریباً 3500 برس ق۔م سے تعلق رکھتے تھے۔

المختصر پہلے حجری دور میں انسان خود اپنی اور جانوروں کی افزائشِ نسل کی آرزو میں جیا۔ پتھر کا دور البتہ سب سے انقلابی اور سب سے طویل دور ہے۔ دریافت شدہ اس اولین دور میں رگڑائی کے ذریعے متفرق حصوں کو جوڑ کر اوزار بنائے جاتے تھے لیکن ابھی تانبے یا کانسی کے استعمال سے انسان واقف نہ ہوا تھا۔ یوری گنگوفسکی نے ماہرین آثار قدیمہ کا یہ خیال نقل کیا ہے کہ یہاں جدید حجری دور لگ بھگ چھ ہزار سال قبل مسیح شروع ہوا تھا۔ اس کے خیال میں اس جدید ہجری دور میں بلوچستان سے لے کر بنگال تک کا سارا شمالی علاقہ لوگوں سے آباد تھا اور یہاں حجری دور کی تہذیب کا شباب تھا۔(9)

بلوچستان میں جو آبادیاں ہیں اور وہ جن ٹیلوں پر بنی ہیں، یہ ٹیلے ہزاروں برسوں تک انسانوں کے لئے ایک جگہ آباد رہنے سے، پرانے مکانات کے گرنے اور ان پر نئے امکانات بننے سے وجود میں آئے ہیں۔

ایک اور بات بھی اہم ہے۔ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اِس قدیم بلوچستان میں کھدائی سے

دریافت شدہ اشیاء میں جانوروں کی ہڈیوں، درانتی، جدید حجری اوزار اور برتنوں کی موجودگی تھی۔ اس موجودگی سے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہے کہ یہ لوگ بکری، بھیڑ اور گائے بھینسیں پالتے تھے۔ گندم، جو، باجرا' یا جوار کی کاشت کرتے تھے۔ البتہ اس ابتدائی زراعت میں فصل گاھنے اور دانے نکالنے کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ فصل، کاٹنے کے بعد جلا کر یا بھون کر کھائی جاتی تھی۔ آٹا پیسنے کا تصور تو اور بعد میں آیا۔ (10)

سماجی سائنس دان انسانی سماج کو پتھر، کانسی اور لوہے کے ادوار میں تقسیم کرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی تقسیم ایک اور طرح سے بھی کرتے ہیں۔ ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ مہر گڑھ اول میں آثار قدیمہ کے دستکاری کی چیزیں اور اناج کو وسیع طور پر ذخیرہ کرنے کی سہولتیں اُس زمانے کی نشاندہی کرتی ہیں جب وہاں سماجی امتیاز موجود تھا۔ جہاں امیر اور طاقتور قدرِ زائد میں بڑے حصے کا مالک تھے ، اور اس کے تبادلے میں نسبتاً مہنگی دستکاری کی پیداوار حاصل کر سکتے تھے۔ لہٰذا زرعی پیداوار نے نہ صرف جانوروں کے گھروں میں پالنے کے عمل کو تیز کر دیا بلکہ دستکاریوں کے حصول کی بنیاد بھی ڈال دی۔ یہاں سماج قدیم اشترا کی مرحلے سے نکل کر غلام داری مرحلے میں داخل ہو رہا تھا۔

اسی طرح 5000 ق۔م کے ملنے والے برتن عورتوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ مادر نسبی اور اشترا کی نظام کے اس آخری مرحلے میں چاک پر برتن بننے شروع ہوتے ہیں۔ یہ گویا اس بات کا اظہار ہے کہ سماج میں طاقت کا توازن عورت کے ہاتھ سے نکل کر مرد کے ہاتھ میں منتقل ہو گیا اور سماج میں اونچ نیچ کا آغاز ہو گیا۔

ظاہر ہے کہ سماج میں یہ بڑی تبدیلی یک لخت نہیں آئی بلکہ اس عمل میں کافی طویل عرصہ لگ گیا۔ مگر زراعت کے ظہور اور پھر زائد پیداوار کے جمع ہونے نے لازمی طور پر بالا دست اور زیر دست طبقات پیدا کئے۔ کلی گل محمد کا ڈمب (آثار قدیمہ) اس کی ایک زبردست شہادت ہے۔ اس کا زمانہ 5000 ق۔م سے لے کر 4000 ق۔م تک کا ہے۔ اس کی قدیم ترین آبادی میں زراعت پیشہ لوگ رہتے تھے۔ جو بھیڑ، بکری، گائے اور بھینس پالتے تھے۔ یہ لوگ غالباً اجناس کی ایک، یا چند اقسام کاشت کرتے تھے۔ شاید گندم، جَو، جوار یا باجرہ۔ انجیرہ کے مقام پر ملنے والے آثار بھی اسی

نوعیت کی کاشت کاری کا عندیہ دیتے ہیں۔ کلی گل محمد کی پہلی آبادی کے لوگ چاک پر برتن بناتے تھے لہٰذا مکمل طور پر آباد نہ ہونگے۔ لیکن دوسرے مرحلے کے لوگ کچی اینٹوں کے گھروں میں رہتے تھے۔ تیسرے مرحلے کے لوگ چاک پر برتن بناتے تھے۔ ان پر سرخ رنگ چڑھاتے تھے اور اس کے اوپر کالے رنگ سے نقاشی کرتے تھے۔ چوتھے مرحلے میں کیچی بیگ ثقافت نظر آتی ہے جہاں تانبے کے اوزار بھی نظر آتے ہیں۔

مندرجہ بالا ثقافت، سماج کے اس ارتقاء کو پیش کرتی ہے جہاں قدیم خانہ بدوش مادر سری اشترا کی سماج، ایک قیام پذیر، اور پدر سری طبقاتی سماج میں ڈھل جاتا ہے۔ اور یہ عمل ارتقائی انقلابات کے ذریعے ہوتا ہے۔ مہرگڑھ میں تو نہیں البتہ دوسرے علاقوں کے آثار بتاتے ہیں کہ زیر دست لوگ بالا دست لوگوں کو تباہ و برباد کر کے ان کی بستیاں ملیا میٹ کرتے ہیں۔ اور ان کی راکھ پہ نئی بستیاں بناتے ہیں۔ بار بار علاقائی جنگیں اور شہروں کی تباہی اور آتش زنی اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ یہ لوگ غیر فوجی نسلوں یا اطاعت پسند گروہوں پر مشتمل نہ تھے اور نہ ہی یہ غیر متحرک ساکن و جامد ثقافتیں تھیں۔۔۔ پتھر کا انقلابی دور!!

آیئے پتھر کے زمانے سے آگے بڑھتے ہوئے ہم پتھر کی الوداعی فریاد بھی سنتے جائیں:

بہت نوچی ہے میری کھال انساں نے
بہت چھیلے ہیں میرے سر سے جنگل اس کے تیشوں نے
میرے دریاؤں
میرے آبشاروں کو بہت ننگا کیا ہے
اس ہوس آلود انساں نے
میرا سینہ تو پھٹ جاتا ہے لاوے سے
مگر انسان کا سینہ نہیں پھٹتا
وہ پتھر ہے!

گلزار

3۔مہر گڑھ، تھری (کانسی کا دور)

(4000-3200 قبل مسیح)

اب ہم دیکھیں گے کہ ارتقاء انسان کو پتھر کے عہد سے آگے کہاں لے گیا ....۔اور، ہمارا یہ مسئلہ بھی بلوچستان حل کرتا ہے۔ امیر تو کل کمبوزیا نے لکھا کہ تانبا(Copper) سب سے پہلے دریافت اور استعمال بلوچستان میں ہوا تھا (11)۔اسے بلوچستان سے موجودہ عراق تک بحری راستے سے ٹرانسپورٹ کیا جاتا تھا۔مہر گڑھ دوئم اپنے آخری سالوں میں کانسی کے عہد کی طرف بڑھا یعنی تانبہ جسے ٹین کے ساتھ مرکب کیا گیا۔اور بقول نہرو یہ نئی دھات اپنے اجزا یعنی تانبہ اور ٹین دونوں سے سخت ہوتا ہے۔(12)۔

اب چونکہ دھات کو پگھلا کر تانبے کی کچی دھات سے علیحدہ کرنا ایک اہم ٹیکنالوجیکل ترقی تھی، اس لئے نہ تو کانسی اور نہ ہی تانبہ عام اوزار کے بطور پتھر اور ہڈی کی جگہ لے سکتے تھے۔وجہ یہ ہے کہ اس دھات کو بہت کم مقدار میں حاصل کیا جا سکتا تھا، اس لئے کہ یہ نایاب اور مہنگا تھا۔ یہ تو اُس وقت جا کر ممکن ہوا جب پہلی ملینیم ق م میں لوہے کی ٹیکنالوجی اچھی خاصی ترقی کر چکی۔تب جا کر پتھر واحد انسانی اوزار کے بطور اپنی طویل اہمیت کھو بیٹھا۔لہٰذا یہ کوئی بہت بڑا بریک تھرو نہ تھا جب سماج پتھر کے زمانے سے Chalcolithic (تانبہ جمع پتھر دونوں) کی طرف بڑھا، اس لئے کہ تانبہ یا کانسی پتھر کے اوزاروں میں محض شامل اضافہ تھا اور تعداد میں بہت کم۔

اس تسلسل کی ایک دوسری وجہ بھی تھی۔کاشتکاری کے ساتھ پتھر والے معاشرے زائد پیداوار کرنے لگے۔ممکن ہے کہ باہر سے نئے آنے والے لوگ شاید بہتر (مثلاً کانسی) کے اوزاروں کے ساتھ آئے ہوں گے۔مگر یہ نئے آنے والے کم تعداد کے لوگ' اِن کثیر مقامی آبادیوں کے ساتھ گھل مل جاتے تھے اور پھر دونوں مل کر کاشتکاری کرتے تھے۔لہٰذا ایک ثقافتی تسلسل برقرار رہی اور مقامی آبادی اپنی پرانی مادی و روحانی طور طریقے جاری رکھے ہوئے تھی۔

کانسی کے زمانے کی شناخت یہ ہے کہ اس میں:

i۔ سپیشلائزڈ صنعتیں آئیں اور

ii۔ ایک عمومی منظّم تجارت آئی۔

جن لوگوں کو یہ خصوصی کان کنی کرنی پڑتی تھی انہیں خوراک کی پیداوار کے کام سے تو فارغ کرنا تھا، اسی طرح کاٹنے والوں کو بھی، اور لوہاروں کو بھی۔سماج نے ایسا کرنے کے لئے زائد خوراک پیدا کی۔نسبتاً دور دراز واقع دھات بھرے پہاڑوں سے کچ دھات کی ٹرانسپورٹ کی مد میں زائد خوراک کا ایک حصہ وہاں شفٹ کرنا تھا۔شہر (یا گاؤں) بڑا ہوا جہاں ثانوی صنعتیں قائم ہوئیں اور بیرونی تجارت ہونے لگی تھی۔دستکاروں، تاجروں، ٹرانسپورٹ کارکنوں، اہل کاروں، سپاہیوں اور ملاؤں کی اچھی خاصی تعداد کو کاشتکاروں، چرواہوں اور شکاریوں کی طرف سے پیدا کردہ زائد خوراک مہیا کرنا تھا۔

مہر گڑھ سوئم کا زمانہ انہی حالات کا عکاس ہے۔اس مرحلے (4300۔3800 ق م) کے ظروف یہاں 75 ہیکٹرز پر پھیلے ہوئے ہیں۔یعنی آبادی اور آبادکاری اچھی خاصی پھیل چکی تھی۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف زراعت اور دستکاری کی ترقی سے ایسا ہوا بلکہ نئی آبادیوں کا آنا جانا بھی خارج از امکان نہیں۔مہر گڑھ سوئم کی قبروں میں انسانی ہڈیاں ایرانی سطحِ مرتفع سے ملتی ہیں۔اور یہ بات مہر گڑھ اول کے برعکس ہے جہاں یہ ہڈیاں جنوبی ایشیائی جھکاؤ رکھتی تھیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ مغرب سے نقل مکانی ہوئی تھی۔(چنانچہ جنوبی ایشیاء اور وسطی ایشیاء دونوں کی آبادی ہماری عظیم اور انبوہ آبادی میں گھل مل گئی)۔یہ آریاؤں کے زمانے سے بہت پہلے کی باتیں تھیں۔

اس عہد کے اندازِ زراعت میں ترقی اس بات سے عیاں ہے کہ فصلوں کی فہرست اچھی خاصی طویل ہوگئی۔گندم کی چار قسمیں ہوگئیں، جَو اور جَئی کی دو قسمیں۔مگر اصل ترقی تو دستکاریوں میں ہوئی۔مہر گڑھ سوئم تو گویا تانبہ پگھلانے کا زمانہ ہوا۔اوزاروں (ابھی تک حتماً پتھر سے بنے) میں زبردست دلفریبی آئی۔یہیں پر نیلم، یاقوت، فیروزہ، گھونگھا اور کولتار پر کام کرنے کے آثار ملے ہیں۔پتھر کو بہت حرارت دے کر ابرق کی آمیزش سے ہار کے دانے بنائے جاتے تھے۔تیز کرنے' اور پیسنے والے پتھر اور ایک پالش شدہ پتھر کی کلہاڑی ہمیں یہ یاد دلاتی ہے کہ اوزاروں کی ٹیکنالوجی کی بنیاد پتھر کے زمانے کی تسلسل ہے، مگر یہ اب ابتدائی Mesolithic ثقافتوں والی

Microliths سے اچھا خاصا آگے کا مرحلہ ہے۔

شیشے جیسے چمکدار بلیڈ پیدا کیے جاتے تھے اور ریت اور مٹی کے گارے سے بنے ننھے مجسمے زیادہ واضح ہونے لگے۔ عورتوں کے چھوٹے مجسمے پینٹ کے ساتھ مزید ڈیکوریٹ تھے، اِن کے ہیئر سٹائل اور زیورات بہت متنوع تھے۔

ایک بڑی ترقی' ظروف سازی میں ہوئی۔ اب اسے پہیے پر گھمایا جانے لگا اور اسے وسیع بھٹوں پر تقریباً 1000 ڈگری سینٹی گریڈ حرارت دی جانے لگی۔ برتن اب اناج اور دیگر اشیا کو سٹور کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ برتن ہی برتن۔ لگتا ہے کہ یہ برتن کی پیداوار کا عہد ہو۔ برتنوں پر انسانوں اور جانوروں کی تصویروں کی پینٹنگ اور جیومیٹری کے ڈیزائنوں سے اُس زمانے میں مروج فوک آرٹ کا پتہ چلتا ہے۔

مہر گڑھ سوئم سے دریافت شدہ ورکشاپوں اور بھٹوں سے دستکاریوں کی زبردست ترقی کا پتہ چلتا ہے۔ یہاں موچیوں کا، کا پر کا سندان کُنڈی اور بلیڈز کی موجودگی ہمیں نیولتھک لوگوں کی ٹکنالوجی کی ایجادات کا بتاتی ہیں۔ یہ ایجادات روزمرہ زندگی میں کارکردگی اور صلاحیت حاصل کرنے کی طرف ایک بڑا قدم تھیں۔ اس سے سماج میں محنت کی تقسیم کے پراگریس کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اشیاء پیدا کرنے کے ہمہ وقتی پیشوں سے وابستہ ہو کر لوگ اپنی پراڈکٹس بیچنے پہ گزارہ کر سکتے تھے۔ واضح رہے کہ اُس وقت نقدی نہیں چلتی تھی، کرنسی کا رواج نہ تھا۔ بلکہ اس کی بجائے اشیاء کا تبادلہ ہی تجارت ہوا کرتی تھی۔

جب دستکار اس قدر زیادہ چیزوں کے ساتھ کام کرتے تھے مثلاً تانبہ، نیم قیمتی پتھر اور گھونگھے، تو یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ چیزیں باہر سے ہی لائی جا سکتی تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اچھی خاصی بیرونی تجارت موجود تھی اور یہ تجارت دور دراز مقامات سے ہوتی تھی۔

قیمتی پتھر اور سونا بالخصوص اشیائے تجارت تھیں۔ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے بھی اور اپنے جادوئی اثرات کی بنا پر بھی۔ جادوئی پتھر آج بھی لوگوں نے انگوٹھیوں میں ڈال رکھے ہوتے ہیں۔ مگر اب غریب اِس واہمے سے نکل چکے ہیں۔ محض دولتمندوں کو ''موافق'' پتھروں کا غم ستائے جا رہا

ہے۔ یا پھر نیم تعلیم ''تافتہ'' مڈل کلاس کے لوگ مخصوص پتھر انگوٹھیوں پر چسپاں کروا کر اپنے بھاگ بدلنے کی امیدیں لگائے رہتے ہیں۔ چنانچہ زیورات محض آرائش و زیبائش کا ذریعہ نہ رہے بلکہ کامیابی، دولت، طویل عمری اور اولاد عطا کرنے کی قوت بھی۔ اس لیے اب یہ لگژری نہیں بلکہ ضرورت بن گئے۔ لہٰذا تجارت ضرورت بنتی گئی............

اس ضرورت نے تجارت بڑھوائی، تجارت نے پھر دنیا بھر کے مہر گڑھوں کو باہم مربوط کیا۔ کسان آبادیاں خانہ بدوش پتھر فروشوں کو اناج بیچنے لگیں۔ لہٰذا منکے اور مالائیں بلوچستان کے اولین فرد کے لیے خوراک کا درجہ رکھتی تھیں۔ تانبہ اور کانسی کی دریافت نے اناج اور منکوں کی پیداوار (کھدائی سے) میں اضافہ کر دیا۔ لہٰذا سائنس' ضرورت کی وجہ سے عملی دستکاریوں سے ہوتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ یہ تو بعد میں جب طب اور اسٹرانومی پر عقائد نے قبضہ کر لیا، تب سائنسی قدریں بے برگ و بے ثمر ہونا شروع ہوئیں۔

تانبے کی دریافت شدہ مہروں سے اُن اشخاص کو محسوس ہونے والی ضرورت کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ اپنے مالِ تجارت کو تجارت کی بڑھوتری کی یقینی علامت سے مخصوص کر دیں۔

پتھر کے زمانے کے مہر گڑھ پہ تحقیق سے پتہ چلا کہ وہاں بیٹھے رہنے والی زندگی سے لوگوں کی صحت پہ بہت برے اثرات پڑے۔ ورکشاپس کی زہریلی ہوا اور آبادیوں میں صفائی ستھرائی کے فقدان نے اوسط عمروں کو 31 سے 24 سال تک گرا دیا، شرح اموات 33 سے بڑھ کر 42 فی ہزار ہو گئی۔ اور پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کی شرح اموات 360 سے بڑھ کر 452 فی ہزار ہو گئی۔ اسی رفتار سے عورتوں پر بچے پیدا کرتے رہنے کا دباؤ بڑھتا گیا۔ ان اعداد و شمار سے اندازہ ہوتا ہے کہ پتھر کے انقلابی زمانہ کے بعد جو اچھی خاصی مادی ترقی ہوئی وہ بغیر نقصان کے نہ ہوئی بلکہ وہ تو آبادی کے طبعی توازن کی قیمت پر ہوئی۔

پیداواری پراسسیوں میں ترقی نے' اِن اشیا کے بنانے والے ماہرین پیدا کرنے شروع کر دیے۔ یہ ماہرین (پیداوار کرنے والے) نئی سے نئی اشیا پیدا کرتے رہے اور پیداوار کے عمل میں آسانیاں پیدا کرتے رہے۔ اور دوسری طرف ایسا وقت آیا جب واہمہ اور مافوق الفطرت

سوچ درآ گئی جو ہرطرح کی ایجاد وجدت کوخطرہ سمجھ کراُس کی حوصلہ شکنی کرتی تھی۔

اس طرح سماج آگے بڑھتا گیا۔ اوراصل پیداوار کرنے والے (جو کہ ایجادات میں ماہر تھے) کی قدرومنزلت گرتی گئی۔ اب ترکھان کمہاراور سنارکمتر طبقہ شمار ہونے لگا۔

رواج' رسومات، مادی حالات اور مکانوں کے ڈھانچے وہی پتھر کے زمانے والے چلے آرہے تھے۔ البتہ اب اگلے جہان میں ساتھ ہونے کے لئے جانوروں اور سامان کو ساتھ دفن نہیں کیا جاتا تھا۔ کمال بات یہ ہے کہ قبروں میں مردے کے علاوہ کچھ بھی دفن نہیں کیا جاتا تھا۔

یہ تو آج بھی حقیقت ہے کہ کاشتکاری میں انسان فطرت پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے۔ اور بڑے پیمانے کی بارش ابھی اکیسویں صدی میں بھی انسان کے بس سے باہر ہے، اُس زمانے میں تو کسی مصنوعی بارش کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ اسی طرح ٹڈی دِل اس کے کنٹرول میں نہ تھا، ہوا ،طوفان، زلزلہ سب اُس پہ زور تھے۔ اس لئے وہ ہمیشہ ہی خوفزدہ رہتا تھا۔ گیارہ ہزارہ سال قبل کوئی منظّم مذہب تو موجود نہ تھا۔ بس مظاہر کے اوپر کنٹرول کرنے والی فرضی قوتیں ہی تھیں: یہ بادل کا دیوتا ہے، یہ چاند کی دیوی ہے، یہ ہوا کو قابو کرنے والا دیوتا ہے............ ۔اس لئے وہ اُس ہستی کو خوش رکھنا چاہتا تھا جو ہواؤں کے جھکڑ اور بارشوں کو بھیجتا تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اُسے کس طرح خوش کرے کیونکہ وہ نظر تو آتا نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بھی اُسی کی طرح کا ہوگا' اور چنانچہ خوراک پسند کرتا ہوگا۔ لہٰذا وہ اپنا بہترین جانور ماردیتا تھا اور دور کہیں رکھ چھوڑتا تھا تا کہ بارش وسیلاب کا مالک دیوتا اُسے نوش فرمائے اور خیرات کرنے والے سے خوش ہوکر اُس پر مہربان ہوجائے۔ یہ دلچسپ ہے کہ اس وقت انسان، دیوتا کو کبھی اچھا اور مہربان نہیں سمجھتا تھا۔ وہ ہمیشہ غصیلا ہوتا تھا، جھنجھلایا ہوا۔ لہٰذا انسان ہمیشہ اُسے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

امیرلوگوں نے جادو، دم اور اُس زمانے کی تشکیل پذیر مذہبی باتوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ کرامت پہ قبضہ دراصل اقتدار پر قبضہ ہوتا ہے۔ جادوٗ مندروں کے قیام کی طرف لے گیا۔ پھر،مندر کے ہاتھ میں خوش قسمت اور بدقسمت قرار دینے کا ہتھیار آ گیا۔ انسان غیر منطقی امید اور خوف میں مبتلا ہوتا گیا اور اس خوف نے اُسے مشقت بھرے تفکر سے ڈرانا شروع کردیا۔ مندر کا

آدمی دیوی دیوتاؤں کورام بھی کرتا تھا اور بدروحوں سے چھٹکارا بھی دلاتا تھا۔ اوراس عمل میں وہ جو زبان بولتا تھا وہ عجیب وغریب اصلی ومہمل باتوں کا ملغوبہ ہوا کرتی تھی۔ مگر اس میں روانی ہوتی تھی، تغزل ہوتا تھا' اور قافیہ ردیف ہوتے تھے۔ یعنی پروہت شاعر تھا اور شاعر کرامت والا۔ آج بھی ہمارے قبائل میں شاعر کو پہنچا ہوا ولی سمجھا جاتا ہے۔ دلچسپ البتہ یہ ہے کہ قبائل میں اس کی شاعری کے حسن کی وجہ سے اُس کی عزت نہیں کی جاتی بلکہ اس کی ناراضگی کی صورت میں بددعاؤں بھری شاعری (سِٹّغ) کے خوف سے اس کی خاطر مدارات ہوتی ہیں۔

اسی دوران فہمیدہ اور معلم لوگوں پر مشتمل درمیانہ طبقہ حکمران طبقے سے سختی کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ وہ مقدس روحانی حاکموں کے منشی کا کام دینے لگے۔ حکمران طبقے کی منشاء کو فتوے کی شکل دینے لگے۔ اور بجائے تجربہ کے یہ لوگ طوطے بن گئے۔ عملی سائنس پیچھے دھکیلی جانے لگی۔ اوراس کے ماننے والوں کو نچلے طبقے میں دھکیلا جانے لگا۔ مندر' پنڈت' واہمہ، دم اور پھُو حکمرانی پاتے گئے۔ صدقات، خیرات، اورنذرانے قیمتی اشیا کو مندرشاہی میں مرکوز کرنے لگے۔ شروع میں رضا کارانہ مگر بعد میں جبریہ وصول ہونی والی اِن اشیا نے ٹیکس کی صورت اختیار کی۔ سماج جمود کا شکار ہوتا گیا اور یہ جامد سماج ایک طرف قدرتی آفات اور دوسری طرف وحشی حملہ آوروں کے لئے آسان بنتا گیا۔ سائنسی ترقی رک جانے سے یہ دونوں قوتیں ہزار گنا طاقتور ہوتی جاتی ہیں۔ اور خوف بڑھتا جاتا ہے۔ خوف تو عقائد کی ماں ہوتا ہے۔ عقائد پھر خوف کو جنم دیتے ہیں۔ اوراس طرح دگنا ہوا ہوا خوف مزید عقیدہ پرستی کی طرف دھکیلتا جاتا ہے۔ یہ سائیکل کبھی نہیں ٹوٹتا۔ عقیدہ سائنس کی بہ نسبت سہل ہوتا ہے۔ چنانچہ دستکار اور کاشتکار زیردست بنا۔ اقتدار یعنی ریاست کی ابتدائی اور اولین تشکیل ہونے لگی۔

4۔ مہرگڑھ، فور (3800 ق م)

اچانک ہنڈوراس کے صدر نے اپنی آواز نیچی کرلی اور تسلیم کرلیا کہ: ''بری بات یہ ہے کہ ہم مایا لوگوں (Mayas) کو دھات کے بارے میں پتہ نہ تھا؛ وہ تو پتھر کے زمانے میں رہتے

تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مفتوح ہو گئے''۔اس نے غمگین انداز میں کہا۔

3800 ق م کے آس پاس مہر گڑھ کی آبادی زوال پذیر ہونا شروع ہوئی ۔مہر گڑھ کی آبادی کی آخری نشانیاں اس بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں کہ یہاں کے باسی اپنی بستی آہستہ آہستہ خالی کرنے لگے تھے اور کسی اور طرف نقل مکانی کرنے لگے تھے ۔ان میں سے کچھ مہر گڑھ کے جنوب میں (کچھی کے میدان میں) وہاں سے نو کلومیٹر دور ایک چھوٹی بستی ''نوشیرو'' میں آباد ہو گئے ۔ باقی زرخیز وادی سندھ کو نقل مکانی کر گئے اس لئے کہ موسمی تبدیلیوں کے باعث بلوچستان بنجر ہو گیا تھا۔ ہم دوبارہ دہراتے ہیں کہ مہر گڑھ تباہ نہ ہوا بلکہ نقل مکانی کر گیا۔

ماہرین اس نتیجے پر پہنچے کہ سندھ میں آمری اور کوٹ ڈیجی کو آباد کرنے والے باشندے بلوچستان سے آئے ۔اس لئے کہ جو نوادرات ماہرین کو ان بستیوں سے ملے ہیں وہ بالکل بلوچستان کی قدیم بستیوں کی طرز پر تھے۔

مہر گڑھ سوئم سے لوگ ہڑپہ اور موہن جو داڑو کے علاقوں کی طرف جانے لگے تھے ۔ ہڑپہ کے لوگوں کے سر کی ہڈیوں اور دانتوں پر تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ مہر گڑھ سوئم کے لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔

ہم موہن جو دڑو اور ہڑپہ کے بارے میں یہاں ذکر کرنے سے معذور ہیں اس لئے کہ اُن تہذیبوں پر بہت کام ہوا جو کہ بے شمار کتابوں میں موجود ہے ۔ بلوچستان میں یہ عہد خلط ملط دور ہے ۔ایک طرف ہم اور ہمارا ارتقا ہے ۔ جو پیرک ہی میں کانسی سے آگے بڑھ کر لوہے کے دور میں داخل ہو جاتا ہے ۔ دوسری طرف شمال اور شمال مغرب سے آریائی لوگوں کی آمد کا زمانہ بھی یہی ہے جو ہمارے ارتقا کو ڈسٹرب بھی کرتے ہیں مگر ہمارے ساتھ گھل مل بھی جاتے ہیں اور بلوچ کی تشکیل کرنے کے عمل میں شامل ہو جاتے ہیں۔

یہ دور 3200---2600 قبل مسیح تک چلا جس میں آج کے افغانستان ،ایران اور سندھ میں بہت سی جگہوں پر ہمارے کوئٹہ کے ''دمب سادات'' والے برتن ملے ہیں ۔موہن جو داڑو ، ہڑپہ، ہمارا آمری نال ۔۔۔۔ یہ سب اسی کانسی دور کا ابتدائیہ تھے۔

ہمارے خطے میں آریاؤں کے پھیلنے سے قبل یعنی 3000 سے 1500 برس ق ۔م کے زمانے میں ہماری اپنی تہذیب عروج پر تھی ۔ موین جو دھڑو تہذیب کے زوال کی تکمیل 2000 سے 1500 قبل مسیح کے وقت ہوئی ۔ (قبل مسیح کو B.C یعنی Before Christ کہتے ہیں اس کا مطلب ہے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے پہلے ۔ جبکہ حضرت عیسیٰ کے زمانے کو A.D کہتے ہیں جو کہ لاطینی زبان کے الفاظ Anno Domini کے پہلے حروف ہیں جس کا مطلب ہے : خداوند کا سال)۔ ہماری اس تہذیب کو دراوڑ بھی کہتے ہیں جن کے بارے میں آج کے تاریخ دان اور ایتھنالوجسٹ یہ مروجہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ عظیم میڈیٹرین نسل کا ایک حصہ ہیں ۔ان کا اصل وطن شاید لیبیا تھا جس کے لوگ بہت قدیم عہد میں مصر اور جنوبی یورپ تک پھیل گئے اور یہ قدیم عہد میں کلچر کا ایک اہم مرکز رہا ہے ۔ یہ تہذیب لیبیائی لوگوں کے ذریعے بلوچستان اور ہندوستان تک پہنچی ۔ وہ یہاں کے مقامی باشندوں کی ثقافت سے خلط ملط ہو کر مزید خوبصورت بنے ۔ نتیجے میں گو کہ یہاں کے باشندے سفید نسل سے ہیں مگر آریا حملہ آوروں نے انہیں سیاہ چہروں والے اور بے ناک والے کہہ کر بیان کیا ہے ۔ دونسلوں کے اتصال سے نئی نسل صرف بہتر ہی نہیں ہوتی بلکہ ایک اعلیٰ اور ارفع کلچر بھی وجود میں آتا ہے۔

ہمارے لوگ بہت ترقی یافتہ لوگ تھے ،ان کی اپنی زبان تھی اور وہ دوسری قوموں سے تجارت کیا کرتے تھے ۔ زراعت بہت ترقی یافتہ تھی ۔ ذرائع پیداوار کی ملکیت موروثی ہو چکی تھی اور پیشے بھی نسل در نسل وراثت میں چلتے تھے ۔ وہ گندم اور جو کاشت کرتے تھے ۔ان کے پاس مویشی اور گھریلو جانور بھی تھے جن میں اونٹ ، بیل ، اور بھیڑیں شامل تھیں ۔ وہ بیلوں سے بیل گاڑیاں کھنچواتے تھے ۔ وہ بڑے ماہر قسم کے سنار تھے ،تانبے سے بنے ہوئے اوزار استعمال کرتے تھے ۔ تحریر کے لئے ان کے پاس اپنا رسم الخط موجود تھا۔ان کی زبانیں آریاؤں والی سنسکرت سے نہیں نکلتی تھیں ۔ بلکہ یہ بہت قدیم زبانیں ہیں جن میں بہت عمدہ ادب موجود ہے ۔اس تہذیب کے آثار بلوچستان میں نال کے مقام پر' کلی گل محمد میں ، اسی طرح افغانستان میں مرو کے قریب آنو میں ، قندھار کے علاقے میں ، جنوبی ایران میں ،عراق میں ، اور حتیٰ کہ مصر میں بھی ہم شکل و ہم ساخت

باقیات کی صورت میں ملتے ہیں۔

بلوچستان میں غلام داری سماج (جو کہ کانسی کا زمانہ بھی ہے) کے واضح آثار کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ بڑے شہروں کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے کہ آبادی وسیع تھی۔ نہ صرف شہروں میں بلکہ دیہات میں بھی۔ یہی دیہاتی آبادی اپنی مقامی ضرورتوں سے زائد اجناس پیدا کر رہی تھی جسے شہروں کو بھیجا جاتا تھا۔ علاقے کے طول وعرض میں پختہ اینٹوں کا کثرت سے استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں وسیع جنگلات موجود تھے۔

ستکغین ڈور، مکران کے علاقے میں ساحل سمندر سے تیس میل دور واقع ہے۔ مگر یہ اپنے عروج کے وقت سمندر کے ساحل پر تھا۔ یہ بہت بڑی بندرگاہ کے بطور استعمال ہوتا تھا۔ یہ قلعہ والا اور فصیل دار شہر تھا۔ سکہ کوہ پسنی سے آٹھ میل شمال کی جانب ہے۔ یہ بندرگاہ تھی اور اس کی عمارتیں اور ظروف ستکغیں ڈور جیسی تھیں۔ ایک اور بندرگاہ بالاکوٹ میں تھی جو کہ سونمیانی کے قریب تھی۔ تینوں بندرگاہیں علاقے کا سامانِ تجارت خلیج فارس کے ممالک میں لے جانے کے لئے استعمال ہوتی تھیں۔ دوسرے ممالک کے بحری حملوں سے بچانے کے لئے یہاں چھاؤنی موجود تھی۔ اسی طرح کی چھاؤنیاں اندرونِ ملک میں بھی تھیں۔ مثلاً ٹوچی، مزینہ دنب۔ اور، سیاہ دنب جھانی۔(13)

غلام داری سماج کی اس شہری تہذیب کی بنیاد زراعت پر تھی۔ کوسمبی نے بڑے اناج گھر وں کے ساتھ بڑی چکیوں اور پاس ہی غلاموں کی رہائش گاہ کا حوالہ دے کر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ غلام ''مندروں کے غلام'' تھے۔(14)

ایرانی بلوچستان کے بمپور کے قریب خوراب کی کھدائی میں ایک قبر سے تانبے کی ایک کدال ملی ہے جس پر اونٹ کی شبیہہ بنی ہوئی۔(15)۔ مختلف اوزان کے لا تعداد باٹ مختلف شہروں سے نکالے گئے ہیں۔ ہڑپہ اور موہنجو دڑو کی طرح میہی (جنوبی بلوچستان) اور ستکغیں ڈور سے باٹ ملے ہیں جو وزن کے ایک معین اور سخت گیر نظام کی ترجمانی کرتے ہیں۔(16)

چونکہ یہ غلام داری سماج تھا اس لئے غلاموں کی تجارت کسی نہ کسی شکل میں ہوتی ہوگی۔ موہنجو دڑو کی رقاصہ کا مجسمہ جس کے پاؤں اور ٹخنے غائب ہیں، ایک گھر میں سطح زمین سے چھ فٹ

چار انچ نیچے مدفون ملی ہے۔ یہ ایک کمسن فنکارہ ہے جو خوشی سے چور، زیورات میں لدی پھندی، جامِ شراب ہاتھ میں لئے برہنہ رقص کر رہی ہے۔ اس نے دایاں ہاتھ کولہے پر رکھا ہوا ہے اور بائیں ہاتھ میں غالباً پیالہ پکڑا ہوا ہے۔ بایاں بازو کندھوں تک چوڑیوں میں چھپا ہوا ہے اور دائیں بازو میں چند کنگن پہنے ہوئے ہیں۔ اس کی شکل بلوچستان کی قدیم آبادیوں سے ملنے والی مٹی کی مورتیوں میں دکھائی گئی عورتوں جیسی ہے۔ اس رقاصہ کے چہرے کے نقوش اور بالوں کے سٹائل سے لگتا ہے کہ وہ یقیناً جنوبی بلوچستان کی اصل باشندہ ہے۔ یہ ممکن ہے کہ اس دور کے تاجر شاہراہوں کی سراؤں میں یا اپنے عشرت کدوں میں ان غلام لڑکیوں سے رقص اور نشاط کا کام لیتے ہوں۔(17)

یہ لوگ (بلوچ؟) ایک طبقاتی سماج میں رہتے تھے۔ شہروں کی رونقوں کو کسانوں کی مشقت سے حاصل کردہ زائد پیداوار ہی سے بنایا اور قائم رکھا جاتا تھا۔ کسانوں کی محنت ہی شہری بالائی طبقہ کو روزی مہیا کرتی تھی۔ آبادی کی عظیم اکثریت دیہاتوں میں مشقت کرتی تھی جبکہ ایک منظّم اقلیت اس زائد پیداوار کے سہارے شہری سہولتوں کے مزے لیتی تھی۔ بلوچستان دراصل کسان اکثریت پر شہری اشرافیہ کی حکمرانی کا وطن تھا۔

اس دور کی ایک اور خاص بات ہے۔ اور یہ بات مہر گڑھ کے پچھلے ادوار سے مختلف ہے۔ اب ان لوگوں کی قبریں عموماً شمالاً جنوباً ہوتی تھیں اور اندر لاش کا چہرہ مغرب کی طرف ہوتا تھا۔ چاہے مردہ گھٹنے سکیڑے گٹھڑی بنا لیٹا ہوتا یا سیدھا، اس کا رخ مغرب کی طرف ہوتا تھا۔(18)۔ (ہم اب سے چھ ہزار سال قبل کی قبروں کی بات کر رہے ہیں)۔

5۔ بلوچستان میں لوہے کا زمانہ

(مہر گڑھ کا تسلسل، پیرک تہذیب)

ہم یہ بات ایک بار پھر واضح کرتے ہیں کہ مہر گڑھ کے لوگ تباہ اور نیست و نابود نہ ہوئے تھے بلکہ جنوب کی طرف ہجرت کر گئے تھے، وہاں سے قریبی نوشیرو میں۔ پھر، نوشیرو کی آبادی بھی تباہ و نابود نہ ہوئی بلکہ مزید جنوب کی طرف ہجرت کر گئی۔ یہ انسانی نسل ہمیں سندھ میں موہن جودڑو اور سبی

میں پیرک میں ملتی ہے۔ پیرک میں بھی یہ نسل ہستی سے مٹی نہیں بلکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ پیرک کے لوگوں نے اپنی مجبوریوں اور رضا سے پیرک میں رہائش ترک کر دی اور کسی اور مقام کو لاد چلے۔(19)

سبی سے ذرا آگے جنوب مغرب کی طرف دریائے ناڑی اور سبی جیکب آباد روڈ کے درمیان ''پیرک'' نامی مقام پر قدیم آثار ملے ہیں۔ یہ بستی 2200 سال قبل مسیح میں آباد کی گئی تھی۔ یعنی دوسری ملینیم میں۔ یہ قصبہ دوسری ملینیم سے لے کر پہلی ملینیم تک ایک اہم زرعی اور دستکاری کی صنعت کا مرکز رہا۔ یہ چاول پیدا کرنے والا وسیع مرکز تھا۔ پیرک 2200 سے لے کر 1000 سال قبل مسیح تک تقریباً ایک ہزار برس تک آباد رہا۔ اس آبادی کی تین تہیں یا تین دور تھے: پہلا دور (2130 تا 1600 ق م)، دوسرا دور (1300 ق م)، اور تیسرا دور (1000 ق م)۔

دورِ سوئم تقریباً گیارہویں صدی قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ یہی دور لوہے کا زمانہ ہے۔ یہاں پر لوہے کی پانچ عدد نیزے کی انیاں، دو بلیڈز اور ایک کلہاڑی ملی ہے۔ یعنی لوہا پہلے پہل ہتھیار بنانے کے لئے استعمال کیا گیا۔ اوپری سطح میں البتہ لوہے کی بے شمار چیزیں ملی ہیں۔(20)

سائنس دان متفق ہیں کہ مہرگڑھ کا یہ دور لوہے کا ابتدائی دور ہے۔ اس عہد کی کھدائی نے انکشاف کیا کہ یہاں ملنے والی چیزوں سے 80 فیصد لوہے کے عہد کی ہیں۔(21) یہاں انسان نے پتھر اور ہڈی والے زمانے کو دفن کر دیا اور بلند و برتر دھات یعنی لوہے کے استعمال کی ابتداء کر دی۔ گو کہ لوہے کا استعمال محدود ہی رہا۔ مگر ان نوادرات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے رہنے والے لوہے سے آشنا ہو چکے تھے۔

بلاشبہ مہرگڑھ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اور وہ یہاں تو کیا، پوری دنیا کی اولین تہذیب ہے۔ مگر ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وسیع و عریض بلوچستان کے دیگر دور دراز گوشوں میں بھی انسانی رہائش گاہوں کے آثار ملے ہیں۔ گو کہ وہ آثار مہرگڑھ جتنے قدیم نہیں ہیں مگر اُن کی اہمیت کبھی بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے۔ 4000 سال قبل مسیح مرکزی مکران میں باقاعدہ ایک تہذیب موجود تھی۔ زاہدان کے قریب شہرِ سوختہ 3000 سال قبل مسیح کا ہے۔ یہ تہذیبیں اگر اپنی نشانیاں چھوڑ گئیں ہیں تو بلاشبہ اپنے اثرات بھی دے گئی ہیں، کبھی محسوس اور کبھی غیر محسوس طریقے سے۔

حوالہ جات

1- باربرا میکموہن۔ دی گارڈین۔ www.guardian.co.uk/2006/pr/18/italy

2- مردانوی، عثمان۔ تہذیب کے ارتقا میں مہرگڑھ کا حصہ۔ ماہنامہ سنگت کوئٹہ۔ اپریل 2009

3۔ Lorenzo Constantini and Loredana Biassini. Agriculture in Balochistan between 7th and 3rd Mellenium B.C ۔ نیوز لیٹر آف بلوچستان سٹڈیز، موسم بہار 1985، نیپلز، صفحہ نمبر 24

4۔ یحییٰ امجد۔ قدیم دور، صفحہ 390

5۔ پاکستان ٹورازم ڈائریکٹری۔ 1989۔ صفحہ نمبر 216

6۔ Pterone, Pier Paolo: Mehrgarh:New Bio-Cultural Evidence from the Neolithic Graveyard. in the book,South Asian Archology, 1997, ROMA. صفحہ 287

7۔ صفحہ Pterone, Pier Paolo: Mehrgarh:New Bio-Cultural Evidence from the Neolithic Graveyard. in the book,South Asian Archology, 1997, ROMA.، 293

8۔ گورڈن جانسن ''کلر اٹلس آف انڈیا'' 1996، انڈرومیڈا، آکسفورڈ۔ انگلینڈ، صفحہ نمبر 59۔

9۔ یحییٰ امجد، ''تاریخ پاکستان'' قدیم دور۔ 1997، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، صفحہ نمبر 191

10۔ ایضاً، صفحہ 199

11۔ http://forums.yaleglobal.yale.edu/thread.jsp?forum=20&thread=1255

12۔ نہرو، جواہر لال Letters from a father to his Daughter۔ چلڈرنز بک ٹرسٹ۔ نیو دہلی۔ 1988۔ صفحہ 27

13۔ یحیٰی امجد۔ تاریخ پاکستان۔ قدیم دور۔ 1997۔ سنگ میل پبلی کیشنز۔ لاہور۔ صفحہ 280

14۔ کوسمبی، ڈی ڈی۔ سٹڈی آف انٹروڈکشن آف انڈین ہسٹری۔ صفحہ 59

15۔ یحییٰ امجد۔ قدیم دور۔ صفحہ 289

16۔ ایضاً۔ صفحہ 307

17۔ایضاً۔صفحہ 390

18۔ایضاً صفحہ 396

19۔جارج ،جین فرانکوئس۔Fouilles de pirak ۔انگریزی حصہ۔1979۔پیرس ۔صفحہ 406

20۔حمیرا عالم۔آثار قدیمہ کی سائنس۔1999۔اردو سائنس بورڈ۔صفحہ 177

21۔جارج ،جین فرانکوئس۔Fouilles de pirak ۔انگریزی حصہ۔1979۔پیرس ۔صفحہ 361

باب پنج

بلوچ، آریا بھی ہے!

نو ہزار سال قبل مسیح کا بلوچستان، ڈیڑھ ہزار سال قبل مسیح میں ایک اور عجوبہ سے دو چار ہوا۔ یہاں ایک عجیب قسم کے لوگ شمال کی جانب سے آنا شروع ہوئے۔ یہ خانہ بدوش لوگ تھے۔ ہماری اصل آبادی کی بہ نسبت تہذیبی طور پر بہت ہی پسماندہ لوگ۔معلوم نہیں انہیں ''آریا'' کا نام کس نے دیا تھا۔خود نے، یا بعد کے مورخوں نے۔ہم ابھی سے واضح کردیں کہ آریا کسی ایک نسل یا قوم کا نام نہیں ہے۔ بلکہ آریا وہ تمام لوگ ہیں جو 1500 ق م سے لے کر 700 ق م تک شمال کی طرف سے آتے رہے۔

چلو،تھیوریاں پڑھتے ہیں:

آریاؤں کا ابتدائی وطن یعنی ''آریہ ویجہ'' کہلاتا تھا جو بحیرہ کیسپین کے قرب و جوار کا علاقہ اور روسی جنوبی سٹیپ کے میدانوں پر مشتمل تھا۔آریاؤں کے قدیم مسکن کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ جس وسیع علاقہ پر زندگی بسر کر رہے تھے۔اُس میں آج کے زمانے کا ازبکستان، تاجکستان اور شمالی افغانستان شامل ہیں(1)۔جنوب، اور جنوب مغرب تک ان کی مہاجرت اسی علاقے سے شروع ہوئی تھی۔

اُس زمانے میں باختر سے دریائے سندھ اور بحیرہِ بلوچ کے ساحلوں تک اس علاقے کے الگ الگ حصوں کے پرانے ناموں کا پتہ چلتا ہے......بولان اور حب سے ساحل سمندر تک کے علاقے کا نام گیدروشیا تھا، اور کوہ سلیمان کے مشرقی دامن سے دریائے سندھ کے کنارے تک کے علاقے کا نام ''یوناس'' تھا۔

تھیوری یہ ہے کہ ایشیا اور یورپ میں جیالوجیکل تغیرات سے قبل ایک بہت سرد زمانہ آیا جس نے صرف انسانی ہی نہیں بلکہ حیوانی دنیا کی زندگی میں بھی بڑی تبدیلیاں پیدا کیں(2)۔اس سردی کی وجہ سے بہت سے جاندار یا تو مر گئے یا ہماری طرف جنوب میں ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے ۔آریا بھی مجبور ہوئے کہ سرد علاقوں سے ہجرت کر کے گرم علاقوں کی طرف جائیں۔چنانچہ یہ لوگ دنیا کے مختلف حصوں یعنی یونان، ایشیائے کوچک، ایران، بلوچستان اور ہندوستان کی طرف پھیل گئے اور دنیا کے ان حصوں میں کئی تبدیلیوں کی بنیاد رکھی۔اس طرح آج یورپ، پارس، میسو پوٹیمیا اور شمالی ہند تک ہمارے علاقے کے سارے لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہوئے بھی آریا ہیں۔ یوں دیکھا جائے تو آریا دنیا کی آبادی کی واضح اکثریت کے لوگوں کے عظیم اجداد میں سے ہیں۔(اس تھیوری میں حیرانگی کی بات یہ ہے کہ ایک چھوٹے سے علاقے میں اتنی بڑی آبادی کیسے رہتی تھی۔چلو ممکنات ناممکنات چھوڑ کر آگے بڑھتے ہیں)۔

1500 برس قبل مسیح میں خوارزم اور بخارا کے وسطی ایشیائی خطوں کی چراگاہوں سے ہمارے وطن کی طرف رخ کرنے والے یہ لوگ آریا تھے۔آریا کا مطلب ویدوں میں ''لارڈ'' ہوتا ہے۔جنٹلمین، معزز۔اس لفظ کا متضاد لفظ ہے ''ملیچھا''، جس کا مطلب ہے بے رحم، ناپاک۔

یہ آریا کسی فاتح منظّم فوج کی صورت میں نہیں آئے بلکہ مہاجرت کرنے والے قبائل کی طرح یہاں داخل ہوئے جو اپنے ساتھ اپنے بال بچے لائے، مال مویشی لائے۔ بالکل اسی طرح جیسے آج بلوچ قبائل پہاڑوں پہ اپنے مسکن سے وادیوں کی طرف آتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی پگڑی پہنتے تھے۔نصیر خان نوری کی طرح ان کے سر کے بال بھی لمبے ہوتے تھے۔ ہر لحاظ سے خانہ بدوش لوگ۔ایک جگہ گھاس کی قلت ہوئی تو اپنی مویشیوں کو لے کر دوسری چراگاہ (چَراغ) کو چلے جاتے۔ ان کی سنسکرت زبان میں آریہ اونچی ذات' شریف اور آزاد کو کہتے ہیں۔ یہ ایک نسل یا ایک قوم ہرگز نہ تھے۔(اور یہ بات بہت اہم ہے!!)۔آپ ''سنسکرت'' والی بات دل میں رکھ لیں کہ آگے ہم آپ کو اس کی ضرورت رہے گی۔

ہم بلوچستان والے کپاس پہنتے تھے مگر بقیہ پوری دنیا کی طرح، اِن آریا لوگوں کی

پوشاک پشم سے بنی ہوتی تھی۔ مرد اور عورت دونوں پگڑی باندھتے تھے۔ ان کے سر کے بال لمبے ہوتے تھے۔ عام طور پر ''ایک مرد ایک عورت'' کا رواج تھا البتہ بعض اوقات ایک مرد کی زیادہ بیویاں بھی ہوتی تھیں۔

آریائی لوگ موج در موج آئے۔ بہت عرصہ تک یہ افغانستان سے بالائی علاقوں میں رہے اور تقریباً 14 ویں صدی قبل مسیح میں بھارتا نامی نسبتاً ایک بڑے گروپ نے اپنے مال مویشی سمیت باختر (بیکٹریا) کا یہ علاقہ چھوڑا، اور یہ لوگ کابھا (کابل) اور ارغنداب سے گزر کر بولان کی وادیوں میں پھیل گئے۔ آریاؤں کا جہاں کہیں لوگوں سے واسطہ پڑا، وہ اُن میں جذب ہوتے گئے۔ جی ہاں، جذب ہوئے!! اِس کا مطلب کیا ہے؟۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آج کا بلوچ مہر گڑھی بھی ہے اور آریا بھی۔ بہ یک وقت دونوں)۔

آریا مہاجرت کا پہلا مرحلہ 1500 سے ایک ہزار قبل مسیح کا ہے۔ یہ رگ وید کا عہد ہے ۔ اُن منظوم ٹکڑوں کا عہد جنہیں لکھا تو صدیوں بعد گیا لیکن جو پروہتوں نے زبانی یاد رکھے اور انھیں مائتھالوجی یا مذہبی امانت کے بطور نئی نسلوں کو منتقل کرتے رہے۔

آریا لوگ اپنے اِس نئے وطن کو ''بھارتا ورش'' کہنے لگے جس کا مطلب تھا، بھارتاؤں کی چراگاہ۔ وہ پہاڑی بلوچستان میں تو شاید کم ہی رہے اور زیادہ تر میدانی سندھ و ہند میں بڑھتے بڑھتے موجودہ یو پی تک چلے گئے۔ حتیٰ کہ وسطی ہند کے کوہ وندھیا تک پہنچے۔ چونکہ ان جنگلات بھرے پہاڑوں کو عبور کرنا ممکن نہ تھا اس لئے جنوبی ہند، آریاؤں کی آمد سے بچا رہا۔ لیکن بعض محققین اور تاریخ دان اس بات سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کے بقول دو عظیم مقدس کتابیں ''رامائن'' اور ''مہا بھارت''، جن کا شمار دنیا کی اولین رزمیہ قصوں کے طور پر کیا گیا ہے (جو تقریباً 500 ق۔م سے 300 ق۔م کے درمیان لکھی گئی تھیں) ان میں سے مہا بھارت کے اندر ''بھارت ورش'' کا ذکر ملتا ہے جس سے ثابت ہوا ہے کہ اس خطہ کے لئے یہ نام 14 ویں صدی قبل مسیح سے بہت پہلے مروج تھا۔ مہا بھارت میں جس جنگ کا ذکر ہے وہ آریا اور کسی دوسری نسل کے درمیان نہیں ہوئی بلکہ ایک ایسی عظیم جنگ ہے جو کہ آریاؤں اور آریاؤں کے درمیان لڑی گئی تھی۔(3)

''ویداس'' کا مطلب ہے علم۔ وہ علم جو اُس زمانے کے دانشمند (رشی اور منی) لوگوں نے اکٹھا کیا تھا۔ ویدوں نے انسانوں کے سامنے آسمانوں کی بالکل اصل تصویر پیش کی ہے۔ دیوتاؤں سے استدعا تھی کہ وہ ریوڑوں میں اضافہ اور چراگاہوں کو سرسبز کریں۔ گائیوں کو بدقسمتی سے محفوظ رکھیں۔ اس دور میں تبادلے کا سکہ مویشی ہوا کرتے تھے۔ گائے مقدس جانور ہوا کرتی تھی۔ بھینسوں ، بھیڑوں اور بکریوں کے علاوہ ویدوں میں گھوڑوں کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہ لوگ شراب خور تھے ۔ وہ آزادانہ طور پر سوم رس اور شراب پیتے تھے۔ دانشور اور بزرگ سوما کے کشید کردہ میٹھے رس کو پیتے تھے۔ سوما ایک پودا ہے جو خاص طور پر بولان کے درے میں پیدا ہوتا تھا (4)۔ نہرو کے بقول وہ یقیناً خوش مزاج لوگ رہے ہوں گے، مسرت اور مہم سے بھرپور لوگ۔ جس زمانے میں وید لکھے گئے وہ ''ویدی عہد'' کہلاتا ہے۔ یہ وید چار ہیں: رگ، ساما، یاجر اور اتھارون۔

رگ وید اس سلسلے کی اولین تحریر ہے۔ جس کو منترا کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ بھجنوں ، دعاؤں اور مناجات پر مشتمل ہے جن کی تعداد 1017 ہے۔ یہ 10580 اشعار پر مشتمل ہے۔ رگ وید میں زراعت کے بہت سارے حوالے موجود ہیں۔ کاشت کیے ہوئے کھیت کو کشترا (بلوچی کاکشار) کہا جاتا تھا۔ ہل کو لنگالا (بلوچی میں لنگار یا ننگار) کہا جاتا تھا۔(5)۔

ساما، رگ ہی کے اقتباسات پر مشتمل وید ہے۔

یاجر میں بھی بہت سا مواد رگ ہی سے حاصل کیا گیا ہے۔

اتھارون، جو دوسرے لفظوں میں برہما کے نام سے مشہور ہے، رگ وید سے کافی عرصہ بعد کی ہے۔ اس سے مقدس رسوم ادا کرنے کی نشاندہی ہوتی ہے۔ جن میں مذہبی خاندانوں کے لوگ بھجن گاتے تھے۔

آریا لوگ مقامی لوگوں میں مل گئے اور رفتہ رفتہ زمین پہ آباد ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ قبیلے کے اندر خاندان بلا شبہ سب سے اہم سماجی یونٹ تھا۔ خاندان پدرسری والا ہوتا تھا۔ لڑکیوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جاتا تھا۔(6)

آریا کسی جگہ جم کر آباد ہونے والے لوگ نہ تھے۔ وہ تو چراگاہ کے پیچھے بھاگنے والے

لوگ تھے۔ چنانچہ سمجھ میں آتا ہے کہ اُن کی مستقل عبادت گاہیں نہ تھیں، نہ ہی اُن سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ مورتی بناتے، اور اگر بناتے بھی تو اسے ٹوٹنے سے کیسے بچاتے۔ لہٰذا وہ مظاہرِ قدرت ہی کی پوجا کرتے تھے۔ وہی ان کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔ آسمان، آگ، ہوا، سورج، سانپ کے لیے مناجات، دعائیں، ترانے (بھجن) گاتے تھے۔

ان لوگوں کے دیوتا' اپنی طاقت و کرامت و معجزات میں اُسی طرح تھے جو اُن سے قبل ہمارے اپنے مہرگڑھ سے چلے آرہے تھے۔ صرف ناموں کا فرق تھا۔ اور انہیں راضی کرنے والے طریقوں میں فرق تھا۔ بادل برسات لانے والی طاقت کا نام کچھ بھی رکھیں، اس کا کام تو بارش برسانا ہوتا ہے۔ اُس کو راضی اور مہربان رکھنے، اُسے منانے اور خوش رکھنے کے طریقے جس قدر بھی مختلف ہوں، کرنے تو ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں مہرگڑھیوں اور آریاؤں کے میل ملاپ کے بعد پرستش والے دیوی دیوتاؤں کے کیا نام پڑ گئے۔ میں یہاں اُن ناموں کا تذکرہ کروں گا جو آریاؤں والے بتائے گئے ہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ ہماری پوری آبادی کے تھے:

اِندر: آریا جب اپنے آبائی سرد وطن میں تھے تو وہاں آگ بہت ضروری تھی لہٰذا قدرتی بات ہے کہ وہ اگنی دیوتا کی پرستش کرتے تھے۔ (آتش پرست ایک الگ مذہب بھی ہے)۔ البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ ڈھاڈر، سبی اور ماوند جیسے آتشیں گرم علاقوں میں آگ کی کیا اہمیت تھی۔ یہاں تو پانی کی ضرورت ہے۔ لہٰذا وہ فضائے آسمانی کے دیوتا اِندر کی پوجا کرنے لگے ہوں گے۔ بھئی یہ جو گرج ہے نا، یہ تو اِندر کی آواز ہے۔ بجلی اس کا نیزہ ہے۔ اور یہ نیزہ جب کالے بادلوں کی پیٹھ میں گھپ جاتا ہے تو ان میں سے بارش کی دھار نکل کر کھیتوں کو سیراب اور چراگاہوں کو سرسبز کرنے لگتی ہے۔ اِندر نے ہلتی ہوئی زمین کو سخت بنا دیا، اس نے پہاڑوں کو شانت کیا جب وہ پریشاں تھے۔ سارے گاؤں، گھوڑے اور رتھ اس کی قدرت میں ہیں۔ (7) ہم آریا اور گھوڑے کو کبھی جدا نہ کر پائیں گے۔

لکشمی: لکشمی زرد لباس میں ملبوس ہے۔ وہ ایک سانپ پر بیٹھی ہے۔ پرندے پر سوار ہوتی ہے۔ اس کا مسکن پانی ہے لیکن وہ مسلسل حرکت پذیر رہتی ہے اور ایک جگہ پر نہیں ٹھہرتی۔ اسے یقیناً

بحیرہ بلوچ میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ دولت، خوش بختی اور خوشی کی دیوی (پری) ہے۔

سرسوتی: علم کی دیوی سرسوتی کو عورت کے بطور پیش کیا گیا۔ وہ نرگس کے پھول پر کھڑی ہے اور بربط بجا رہی ہے۔ اس کے پاس آدمیوں کو صاحبِ علم اور ''خوش بیان'' کرنے کا خاص ملکہ ہے۔

کرشن: بانسری نواز کرشن جس نے گوپیوں اور شہزادیوں کو یکساں طور پر گرویدہ بنا لیا تھا۔ جب وہ آٹھ سال کا ہوا تو اُس نے آسمان کے دیوتاؤں کو پریشان کر دیا تھا جنھوں نے دیہاتیوں سے ناراض ہو کر، ان پہ ژالہ باری اور بادوباراں کے زبردست طوفان بھیجے۔ انسان اور مویشی ہلاک ہو رہے تھے کہ اس اثناء میں، اِس ہیرو نے گووردھان، مقدس پہاڑ کو اٹھایا اور مویشیوں اور دیہاتیوں کے سر پر چھتری کی طرح اس کا سایہ کر دیا۔ اس سے ان کی جانیں بچ گئیں۔

اس نے بہ یک وقت سولہ ہزار گوپیوں سے جھوٹ موٹ کا عشق کیا۔ تمام متمول لوگ اور سبھی عورتیں اس کی پرستش کرتی ہیں۔

آریاؤں نے جو کتابیں لکھیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ جب وہ افغانستان میں اور شمال میں رہتے تھے تو ہندوستان کو ''براہما ورتا'' کہتے تھے اور افغانوں کو گندھارا۔ آریا یہاں آئے تو بلوچستان اور ہندوستان کے علاقے کا نام ''سپت سندھو'' بھی پڑ گیا اور پھر اسے ''آریا ورش'' کا نام بھی دیا گیا۔

''آریاورتا'' کو چاند کی سرزمین بھی کہتے تھے۔ ''اندو'' کا مطلب ہے چاند اور اس لئے آریاورتا ''اندو سرزمین'' ہی تھا۔ خود نہرو کی بیٹی اندرا کا پیار سے نام تھا ''اندو''۔

لہٰذا مظاہرِ قدرت اُن کے دیوتا ہوا کرتے تھے۔

سات دریاؤں کی سپت سندھو کے علاقے کی سرسبز چراگاہوں کی طرف اپنے آبائی وطن آکسس سے نقل مکانی کرتے ہوئے آریا قبائل کے راستے میں خود وہی آریا قبائل رکاوٹ بن گئے جو بہت پہلے مشرقی علاقوں میں بس ہو چکے تھے۔ اس وجہ سے دس آریا قبائل کے درمیان ایک بہت بڑی جنگ ہوئی جس کے نتیجے میں آگے بڑھنے والوں کے لئے راہ کھل گئی۔ اس جنگ میں حصہ لینے والے دس قبائل النسیا، پکہت، بھالانا، شیوا، ویشانین، انویا، دروہویا، توواسا، یادو، اور

پورو کے ناموں سے مشہور ہیں۔ بھالا نادرہ بولان کے علاقوں میں آباد لوگ تھے۔

پہلے پہل آریاؤں کی ایک ہی زبان تھی۔ بعد میں جب وہ دنیا کے مختلف علاقوں تک پھیل گئے تو وقت گزرنے کے ساتھ آہستہ آہستہ فطری وسماجی عوامل کے اثرات سے زبان کی بناوٹ میں بھی فرق آتا گیا۔ آریاؤں کی زبان سے جو مختلف زبانیں نکلیں، ان میں سنسکرت، پہلوی، بلوچی، کردی، پشتو، لاطینی، فرانسیسی، یونانی، اطالوی، جرمن اور سلاوز بانیں شامل ہیں۔ چنانچہ ہماری اس سرزمین اور پڑوس کی قومی زبانیں حتیٰ کہ ہندی، اردو، بنگالی، مرہٹی اور گجراتی بھی اسی سر چشمے کے عظیم دریا ہیں۔ (اسی لیے سنسکرت ہم مندرجہ بالا ساری زبانوں کی اہم جزو ہے)۔

اس خطے میں تاریخ کے اتھل پتھل، جغرافیائی تبدیلیوں اور وقت کے اتار چڑھاؤ نے انسانی نسل کے مختلف گروہوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح باہم پیوست کر دیا کہ ان کو جدا کر کے پہچاننا آج ممکن نہیں ہے۔ المختصر' آریا سرزمینِ بلوچستان پر آباد قدیم بلوچ آبادی سے آن ملے۔ اور وہ ہم میں سے ہوئے، یا ہم اُن میں سے۔ لہٰذا بلوچوں کی ایک بنیادی ساخت آریا کی بھی ہے۔

مہاجرت کی اس تھیوری کی حمایت میں چند ثبوت پیش کیے جاتے ہیں۔

1- مہر گڑھ دور چہارم میں آریاؤں کی لاشیں ملی ہیں۔

2- پیرک اور نوشہرو میں گھوڑوں کی باقاعدہ نشانیاں ملی ہیں۔

3- ژوب کے قدیم آثار ''پریانو غونڈی'' میں گھوڑوں کے مجسمے، اور جسم کی باقیات ملے ہیں۔

4- سرینا ہوٹل کی کھدائی میں سونے کے پیالے، خنجر اور نیزے ملے ہیں۔

5- کہتے ہیں کہ یہ جو بلوچوں کا شہر راجن پور ہے نا' یہ ریاست کے حکمران کے ٹائٹل ''راجن'' سے نکلا ہے۔ آریا لوگ اپنا حکمران (راجن) چناؤ سے مقرر کرتے تھے۔

آریاؤں کے علاوہ کچھ عرب بھی آکر ہم میں جذب ہو چکے ہوں گے۔ کوئی تاریخی دستاویز موجود نہیں، کوئی آرکیالوجی کے آثار نہیں۔

لیکن ایسا بھی نہیں کہ انسانی آمدورفت پر کوئی پابندی تھی۔ یہ پاسپورٹ، یہ سرحدیں، یہ ریاستیں، یہ ممالک تو ابھی حال کی بکواسیات ہیں۔ انسانوں کی آمدورفت بھی تھی، خانہ بدوشی اور مہاجرتیں بھی تھیں۔ آبادکاریاں اور نقل مکانیاں بھی تھیں۔ مگر اتنے بڑے پیمانے والی نہیں کہ ٹوپو گرافی ہی تبدیل ہو جائے۔ لہٰذا ہم بلوچ ایک دادا کی خالص نسل والے لوگ نہیں ہیں۔ ہماری پڑوسی قومیں بھی اسی طرح کا مکسچر ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی 1968 سے پہلے کے ایڈیشنوں میں لکھی ہوئی اس بات سے محظوظ تو ہوا جاسکتا ہے کہ بلوچوں کا باپ بلو، ازبکوں کا باپ ازبک، اور افغانوں کا باپ افغانہ تین بھائی تھے۔ مگر یہ بات سچ نہیں ہے کہ آج کی یہ تینوں بڑی قومیں صرف ان تین اشخاص کی اولاد ہیں۔

لہٰذا جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ جو کوئی بھی دعویٰ کرے کہ اُس کی قوم اصل اور خالص اور ایک آدمی کی آل اولاد ہے تو سمجھ لیں کہ وہ سچ سے کنی کترا رہا ہے۔ ''خالص خون، خالص نسل اور خالص قوم''، تو محض شکست خوردہ، غلام ومحکوم، ماضی پرست اور نا اہل ذہنوں کے نظریات ہیں۔ اصل صورت یہ ہے کہ ہر قوم کئی قبیلوں کے آن ملنے سے تشکیل پاتی رہی ہے اور ہر قبیلہ بہت سے فرقوں اور گھرانوں کے آپسی اتصال سے تشکیل پاتا رہا ہے۔ (سیاست ہمیشہ تاریخ کو توڑتی مروڑتی رہی ہے۔)

جہاں تک آریاؤں کا تعلق ہے تو وہ بھی صرف ایک ہی بار ہمارے خطے میں نہیں آئے بلکہ یہ تو موجیں تھیں، ایک گزری، دوسری آئی۔ پھر تیسری، چوتھی (ہر ایک کے کچھ لوگ یہاں وہاں رک گئے)........... چرواہی معیشت کے یہ نیم خانہ بدوش لوگ، بغیر کسی خاص ٹیکنالوجیکل برتری کے ہم کاشتکار اور اعلیٰ ٹیکنالوجی والے آباد لوگوں میں شامل ہوتے رہے۔۔۔ آریا ہماری مقامی آبادی سے مل کر بہت عرصہ کے پراسیس میں ایک قوم' یعنی ہماری بلوچ قوم کی تشکیل کرتے چلے گئے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم میں نئے نئے لوگوں، نئی نئی نسلوں کے شامل ہونے کا یہ عمل آج بھی جاری ہے۔ دیکھیے نا، تیسری صدی ہجری سے کوچ اور بلوچ دو ہم آہنگ اور ہم قافیہ الفاظ کی حیثیت سے تحریر میں آتے رہتے ہیں۔ یہ دونوں الگ الگ آریائی قومیں ہیں مگر کوچ' بلوچ قوم کے

اندر جذب ہوکر ایسے گم ہوگیا ہے کہ اب ہمیں یہ لفظ بھی اجنبی اجنبی سا لگتا ہے۔

بلوچوں کی اکثریت کو آریا قرار دینے کی غلطی لگتا ہے کہ اب ایک فیشن بن چکا ہے۔اس فیشن کا ایک بہت بڑا سہارا خود ہماری زبان بلوچی رہی ہے۔زبان دانوں نے لسانیاتی رشتوں کے حوالے سے قرار دیا ہے کہ بلوچی ایک قدیم آریائی زبان ہے جو قدیم اوستا سے قربت رکھتی ہے۔

ہماری بلوچی زبان آریائی زبانوں کے ''انڈو یوروپین'' خاندان شاخ ایرانین سے ہے ۔ انڈو یورپین خاندان کی مزید شاخیں ہوجاتی ہیں مثلاً انڈو ایرین، دارڈک، ایرانی' اور نورستانی۔ان میں سے جو شاخ ''ایرانی'' کہلاتی ہے،اس میں بلوچی زبان شامل ہے۔

ہماری یہ قدیم ایرانی شاخ تین ادوار میں منقسم ہے:

سب سے پرانا دور(1000 سال ق م) قدیم ایرانی کہلاتا ہے جس کی اہم زبانیں تھیں:

1۔قدیم فارسی، medic، اوستا، قدیم ساکا، اور پہلوی۔(8)۔اَوستا قدیم فارسی کی وہ صورت ہے جو زرتشتیوں کے مذہبی کتبوں پر کھدی ملتی ہے۔(9)

2۔ایرانی شاخ کا دوسرا دور(331 سال ق م) وسطی ایرانی کہلاتا ہے۔جس میں پہلوی، سوگدیائی، وسطی ساکا اور بلکی زبانیں تھیں۔

3۔ایرانی شاخ کا تیسرا دور موجودہ دور ہے جس میں اہم زبانیں ہیں جدید فارسی، پشتو، کردی، اور بلوچی۔یہ سب نئی ایرانی زبانیں ہیں۔(10)۔

پرابلم پتہ ہے کہاں ہے؟۔پرابلم مہر گڑھ میں، نوشہرو اور پیرک میں ہے۔مہر گڑھ کی زبان ابھی دریافت وعدم دریافت کے چلمن کے پیچھے رقصاں ہے۔مہر گڑھ کا انسان بولتا تھا۔ اور بولنے کے لئے بولی ضروری ہوتی ہے۔وہ بولی کونسی تھی اور اس کے کتنے فیصد الفاظ و اظہاریے آریوں کی زبان میں زندہ رہے' ابھی معلوم نہیں ہے۔اس لئے ہم آج کی بلوچی زبان کو ''اُکھڑی جڑوں والی زبان'' قرار دے کر ہی اُس پر بات کرنے پر مجبور ہیں۔اور جب زبان محور ٹھہرے تو سمجھو بلوچ کو تو اپنی جڑ مہر گڑھ سے کاٹ دیا جاتا ہے۔زبان، (دوسری قوموں کے برعکس)، بلوچ کا نہ تو اصل جڑ کی طرف لے جانے میں مدد کرتی ہے، نہ حال کی بلوچ قومی عوامی تحریک میں فیصلہ

کن بنیاد کا کام کر رہی ہے اور نہ مستقبل میں یہ فیصلہ کن کردار ادا کرے گی۔

بس آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ آریاؤں کی آمد (یا، وقت) سے ہمارے ہاں مادرسری نظام تباہ ہونے لگا۔اس تباہی میں تیزی آئی اور ہم ارتقائی (لیکن ظلم واستحصال سے بھرے) پدرسری نظام میں تیزی سے داخل ہوگئے۔

حوالہ جات

1۔ اعتزاز احسن۔Paksitan Indus Saga And The Making of ۔1996۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔کراچی۔صفحہ 65

2۔ساد۔خیر محمد۔لرغونی اریایان۔افغانستان اکیڈمی آف سائنسز کابل۔1985۔صفحہ نمبر 2

3۔نہرو، جواہر لال۔Letters from a father to his daughter۔ چلڈرنز بک ٹرسٹ نیو دہلی، صفحہ نمبر 79

4۔سید، محمد لطیف ''تاریخ پنجاب''۔1994 تخلیقات ٹمپل روڈ لاہور۔صفحہ نمبر 97

5-عرفان حبیب۔دی ویدک ایج۔فکشن ہاؤس۔2004۔صفحہ 6

6-ایضاً۔صفحہ 13

7۔بائیر، سوسن وائز۔دی ہسٹری آف دی اینشینٹ ورلڈ۔2007۔نارٹن، لندن۔صفحہ 265

8۔نہرو، جواہر لال۔Letters from a father to his daughter۔ چلڈرنز بک ٹرسٹ نیو دہلی، صفحہ نمبر 79

9۔ باربر، چارلس۔اے سٹوری آف لینگویج ۔ 1964 ۔ انگلش لینگویج بک سوسائٹی لندن۔ صفحہ 85

10۔جہانی، کارینا۔سرگئی ایکسی نوف کی کتاب The Balochi Language of Turkmenistan۔اپسالا 2006۔صفحہ 20 میں حوالہ

باب شش

بلوچستان: مزاحمتوں کی سرزمین

1۔ایران اور بلوچ

بلوچ ہزار ہا برسوں سے قبائلی تنظیم میں منظّم چلے آ رہے ہیں ۔ باہمی لڑائیاں' کشت و خون اور غارتگری انہیں کسی صورت ایک قوم بننے نہیں دیتی ۔مگر آپ جب بھی کسی غیر قوم کی طرف سے جارحیت کی بات کریں بلوچ یک دم ایک بن جاتا ہے،ایک قوم بن جاتا ہے۔جب بھی باہر کی قوم سے واسطہ (زیادہ تر دشمنی اور کم تعداد میں دوستی میں) پڑتا ہے ہماری داخلی یکجہتی فوراً بڑھ جاتی ہے۔ ہم یک دم اشتراک کی باتیں ڈھونڈنے لگ جاتے ہیں،فوراً اپنے مذہبی،لسانی، زمینی اور تاریخی اتحاد کے نکات تلاش کر لیتے ہیں۔ایک بن جاتے ہیں، خارجی طاقت سے نمٹ لیتے ہیں اور پھر اُسی جوش و خروش سے ''باہم مختلف ہونے کے دلائل'' ڈھونڈتے ہیں۔لڑائی اور علیحدگی کے بہانے ڈھونڈتے ہیں............اور یہ بہانے مل ہی جاتے ہیں (نظریاتی نہیں،معاشی و طبعی)۔

ایک ہزار سال قبل مسیح میں ایران اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں بسنے والے لوگ ایک ہی قبیلے یا گروہ کے لوگ نہ تھے۔انہی لوگوں میں سے کچھ کی اولاد 'ماد' کہلاتی تھی۔708 ق۔م کے قریب مغربی ایران میں ماد حکومت قائم ہوئی۔اس کا پایہ تخت موجودہ ہمدان تھا۔اس حکومت کے بانی ڈیوسس اور اس کے جانشینوں نے نہ صرف فارس پر قبضہ کر لیا بلکہ اس خاندان کے عظیم سلطان ہوخشتر (585-653 ق۔م) نے بابلی حکومت کے ساتھ معاہدہ کر کے آشور کی عظیم سلطنت کو شکست دی اور 612 ق۔م میں اس کے دارالحکومت کو تباہ کر دیا۔

اس زمانے میں کرد بلوچ ''آشورا'' (آھورا) کی پرستش کرتے تھے۔''ھور'' کا مطلوب ہے'' آگ'' اور ''آ'' کا مطلب ہے ''آیا'' ۔'' وہ حقیقت جو آگ سے دائمی ہے''، دائمی

آگ۔کارل ساگاں (کاسموس:108) کا خیال ہے کہ ’’رستے ہوئے تیل اور گیس میں آسمانی بجلی کی وجہ سے لگنے والی آگ کو ’’ابدی آگ‘‘ کا ماخذ خیال کیا گیا جو قدیم فارس کے آتش پرست مذاہب میں بنیادی حیثیت اختیار کر گئی۔ جب بلوچوں نے توران اور مکران میں سکونت اختیار کی تو انہوں نے اپنے مذہب کو رواج دیا۔توران کی بت پرستی متروک ہوگئی۔کرد بلوچ ،دن میں تین بار آگ کی پرستش کرتے تھے۔وہ اپنی عبادت گاہ کو ’’آرینم‘‘ کہتے تھے۔جس کا مطلب ہے آتشکدہ۔ آتشکدہ کے معبد کو آری وان کہتے ہیں۔شہروں اور دیہاتوں میں آتشکدہ ہوا کرتے تھے۔ بلوچ کردوں کے حکمرانوں نے دو بڑی عبادت گاہیں کیکان (موجودہ نال) اور خضدار میں ’’آرین زوراک‘‘ اور ’’آرین حلوان‘‘ کے نام سے تعمیر کی تھیں۔ جو کوہ زوراک اور کوہ حلوان کی چوٹیوں پر بنائی گئی تھیں۔اس عہد کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس دور میں لوہے کا استعمال ہوتا تھا۔(1)

اسی طرح نیچارہ اور پندران کے علاقہ میں کئی پہاڑوں، چٹانوں اور قبرستانوں میں بھی زرتشتی آثار موجود ہیں۔خاران اور ماشکیل میں بھی زرتشتیوں کے آثار اور قبریں اس خطے میں اس مذہب کی موجودگی کی دلالت کرتے ہیں۔کوئٹہ (شال) میں سرینا ہوٹل کی تعمیر کے دوران تہہ خانوں کی کھدائی کے وقت ایسے آثار دریافت ہوئے جن سے زرتشتی معتقدات کی نشاندہی ہوتی ہے۔(2)

بلوچ آج بھی آگ کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں آج بھی آگ کی طرف پاؤں کرنے، آگ کی طرف تھوکنے، آگ کو پھلانگنے اور آگ کی طرف ہاتھ کا پنجہ کھول کر لعنت بھیجنے کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔(کچھ قبائل البتہ غیر آئینی طور پر آگ سے چیف جسٹس کا کام بھی لیتے ہیں)۔

کرد بلوچ سال میں دو بار (خزاں اور بہار میں) توران و مکران سے راشن اور جانور ساتھ لے کر آتے اور کئی روز تک ان عبادت گاہوں کی پرستش کرتے۔(3)

یہ بلوچ موت کے بعد زندگی کے قائل نہ تھے۔موت کو اہرمن سے قطع رشتہ تسلسل جانتے تھے۔وہ شروع میں مردے کو دفن نہیں کرتے تھے۔ بلکہ پتھروں یا سطح مرتفع پر چھوڑ جاتے تا کہ پرندے اور جانور اسے کھالیں۔دفن کرنے کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا۔ان میں نکاح کا رواج نہ

تھا۔فقط طرفین کی رضامندی کافی ہوتی تھی۔تاریخ کی کتابیں بتاتی ہیں کہ ختنے وغیرہ کی رسم نہ تھی۔ بلوغت سے پہلے لڑکوں کو مار ڈالنا ممنوع تھا۔

شروع میں یہ خانہ بدوش لوگ تھے۔بعد میں سکونت اختیار کر کے کھیتی باڑی، باغبانی اور شجر کاری شروع کی اور پانی کو ذخیرہ کرنے کے لئے ایسے ایسے بندات تعمیر کیے کہ انہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔انہیں ’’گور بند‘‘ کہا جاتا ہے ۔ یہ لفظ آج کی بلوچی زبان میں بھی مستعمل ہے۔کرد گال نامک کے مصنف اخوند صالح کے مطابق یہ ’’گور بند‘‘ 854 تا330 ق۔م میں تعمیر ہوئے۔ساراوان میں وادی گزگ ۔نرمک، رودبار، باڑی میں چھپر جم، اور جھالاوان میں سوراب سے لے کر وادی ہب تک ’’گور بندوں‘‘ کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ جو بندات بہتر حالت میں ہیں وہ ہیں: وادی بھپو، تو تک، لاکوریان، سارونہ، گدر، مشکے، جیری اور ہب۔خاران میں یہ بندات وادی راسکوہ، گر، اور سیاھان کوہ میں واقع ہیں۔ بلوچی کہن یا کاریز بھی زرتشتیوں کے دور کے طریقۂ آبپاشی اور کاشتکاری کا پتہ دیتے ہیں۔سام پور کا ٹیلہ جومستنگ کے کاریزات میں واقع ہے، اسی قدیم دور کی یادگار ہے۔

سردار قبیلے کے سارے فیصلے کرتا تھا۔کرنسی نہ تھی اور ضرورت کی اشیاء، اور اجناس کا باہم تبادلہ ہوتا تھا۔ان کے ہتھیار تیر و کمان، خنجر اور کمند ہوا کرتے تھے۔

آشو کی تباہی کے بعد اس کی سلطنت کے بڑے حصے پر مادوں کا قبضہ ہو گیا اور ان کی حکومت ایران سے اناطولیہ تک پھیل گئی۔البتہ ہوخشتر کا جانشین استاگس اپنے پیشرو کا ہم پلہ ثابت نہ ہوسکا اور اس کے عہد میں کورش دوئم ہخامنشی نے بغاوت کر کے حکومت مادوں کے ہاتھ سے چھین لی۔

نویں صدی قبل مسیح میں ایرانی قبائل کے دو بڑے گروہ ابھر کر سامنے آئے: میدی اور پارسی ۔ساتویں صدی قبل مسیح کے اختتام تک میدیہ نے ایک طاقتور ریاست کی صورت اختیار کر لی تھی۔لیکن چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط میں میدیوں کو اپنے پڑوسی پارسیوں کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا۔یہ پارسی (جو آریاؤں کی وہ شاخ تھی جو ایران میں بس گئی تھی) ہخامنشی خاندان کے فرمانرواؤں کی قیادت میں ایک طاقت کے طور ابھرے۔گوروشِ اعظم (559۔530 ق م) جسے سائرسِ اعظم

بھی کہا جاتا ہے' کا لشکر جنوب مغربی ایران (پارس) سے آندھی کی طرح اٹھا اور بابل کی عظیم سلطنت کو روندتا ہوا اُدھر دریائے نیل کے ساحلوں تک پہنچا۔ اس نے نہ صرف مادوالی پہلی سلطنت پر قبضہ کرلیا بلکہ ایک طرف اسے یورپ کی سرحدوں تک وسعت بخشی اور دوسری طرف اس نے عظیم بابلی حکومت کو شکست دے کر مصر تک فتوحات حاصل کیں۔ اس نے مشرق میں خراسان سے آگے اور جنوب مشرق میں ہندوستان فتح کرلیے۔ البتہ فوج کے جس حصے کی قیادت کرتا ہوا وہ بلوچستان پر حملہ آور ہوا تو بلوچستان نے اُسے برباد کر ڈالا۔ یہاں کے دشوار گزار راستوں اور قدم قدم پر زبردست عوامی مزاحمت کے باعث وہ نیست و نابود ہوگیا۔ اور اس بہت بڑی فوج میں سے صرف سائرس اور اس کے سات ساتھی زندہ بچ کر واپس بھاگ جانے میں کامیاب ہوسکے۔(4) بالآخر وہ انہی فتوحات کے سراب کا پیچھا کرتے کرتے 529ق۔م میں وسطی ایشیاء میں مارا گیا۔

جھوٹی دنیا کے اس کے جھوٹے تخت پر ہخامنشیوں کی ایک دوسری شاخ کے دارا (داریوش اول) نے قبضہ کرلیا اور شہنشاہ ایران کی حیثیت اختیار کی۔(5) (شہنشاہ .... بادشاہوں کا بادشاہ) اس کی سلطنت کے بیس صوبوں میں بلوچستان بھی شامل تھا۔(6)

اس کے جانشین داریُوش (522۔۔۔486ق۔م) نے البتہ بلوچستان کو قبضے میں لے لیا۔ اور ہم سے خراج لینے لگا۔ سلطنت ہخامنشیہ کے عہد میں بلوچستان چودھویں ساتراب (ضلع) کا حصہ تھا۔ ہخامنشی حکومت کی سرحدیں ایران کے مشرق سے وادی سندھ تک پھیلی ہوئی تھیں(7)۔

داریوش نے یہ طے کیا کہ حکومت کو فردِ واحد کے ہاتھ میں مرتکز نہیں ہونا چاہیے۔ اس لیے اس نے صوبوں کو چھوٹے چھوٹے چھ ضلعوں (ساتراب) میں تقسیم کردیا۔ اور ہر ضلع میں ایک ٹیکس کلکٹر اور سمجھدار اور تجربے کار گورنر مقرر کیا۔ اس طرح سے سلطنت متعدد چھوٹے ساتراب میں تقسیم ہوگئی۔ انہی میں سے ایک ماکا، یا، مکہ (مکران) بلوچستان تھا۔(8)

اس نے اپنی وسیع سلطنت میں واحد کرنسی جاری کی تھی۔ سونے کا یہ سکہ "داریک" کہلاتا تھا۔ یہ تو معلوم بات ہے کہ کرنسی تجارت کی ضامن ہوتی ہے اور تجارت، سڑکیں بنواتی ہے۔ چنانچہ

شیر شاہ سوری سے بھی کئی صدیاں پہلے دارا کی حکومت میں ان خطوں میں ہر پندرہ میل پر سرائیں اور چوکیاں قائم تھیں جہاں گھوڑے بدلنے کا انتظام رہتا تھا۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ زرتشی مذہب دارا کے عہد حکومت میں وجود میں آیا تھا۔

کیخسرو کے دور حکومت میں بلوچستان سلطنت ماکیانیہ کا ایک حصہ تھا اور بلوچ کیخسرو کے لشکر کا بہادری و دلیری کی صفات سے مزّین ایک حصہ سمجھے جاتے تھے۔ جنہوں نے کبھی بھی میدان جنگ میں پیٹھ نہیں دکھائی تھی۔

حوالہ جات

1-مبارک علی "انڈرسٹینڈنگ پاکستان" 1992۔ پروگریسو پبلشرز، صفحہ 3

2 - جمالديني، عبداللہ جان، پیش لفظ، محمد اشرف شاہین کی کتاب" بلوچستان تاریخ اور مذہب 1997 "ادارہ تدریس کوئٹہ

3-اخوند، صالح محمد "کردگال نامک"۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ 1994 صفحہ 109

4-یحیٰی امجد "تاریخ پاکستان، وسطی عہد" 1997، سنگ میل پبلیکشنز لاہور، صفحہ 56

5-فاروقی، عمادالحسن آزاد۔ "مغربی ایشیاء کے مسلمان"، گوتم پبلشرز لاہور، صفحہ 66

6-دل ڈیورائٹ "آوراورینٹل...... ہیرٹیج، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس" صفحہ 355

7-دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 41

8-دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 107

2۔سکندر ''اعظم'' کی دُرگت

اِدھر ایرانی سطح مرتفع میں مذکورہ تبدیلیاں ہوئیں تو اُدھر ہندوستان کی سرزمین پر مہاتما بدھ نمودار ہوا اور اس درمیان زمان، مکان کی پھسلن پہ اپنے کرتب دکھاتا جارہا تھا۔مہاجرت قوموں کی بھی ہوتی رہی، گروہوں، خاندانوں اور افراد کی بھی۔شمشیر، مالی اور جغرافیائی فتوحات بھی سر انجام دیتی رہی اور عقیدوں،نظریوں کو بھی پھیلاتی رہی۔مگر اس کا اصل مرام تو دولتمندوں کی معیشت کو، دولت کو بڑھانا تھا۔

پارس اور ہندوستان کی دولت لوٹنے والے بڑے بڑے حملہ آوروں کی گندی لسٹ میں سکندر اعظم کا نام بہر حال نمایاں ترین ہے۔وہ یونان کے شمال مشرقی حصے میں مقدونیا نامی ابھرتی ہوئی قوت والے علاقے کا باشندہ تھا۔میسوڈونیا (مقدونیہ) میں یونانی ریاستوں کے برعکس مطلق العنان بادشاہت قائم تھی جسے 359 ق م میں فلپ جیسا توسیع پسند اور فوجی امور کا ماہر حکمران ملا۔ اس نے اپنی فوج کو آہنی ڈسپلن عطا کیا۔اور اُسے خطرناک ترین فوجی قوت بنا ڈالا۔اس نے تقریباً تمام یونانی ریاستوں کو زیر کرلیا اور اسی فوج کے بل پر بعد میں اس کا بیٹا سکندر 22 سال کی عمر میں دنیا کو فتح کرنے نکل کھڑا ہوا۔

فلپ اور اولمپاس کا بیٹا سکندر، جو بعد میں ''اعظم'' کا لقب لینے والا تھا ''پیلا'' کے مقام پر 356 ق۔م میں پیدا ہوا۔(1) ....اللہ جانتا ہے کہ ڈاکو کبھی اعظم نہیں ہوتا،لٹیرا، حملہ آور، فاتح، اور جنگی جنونی کبھی اعظم نہیں ہوتا۔البتہ تلوار بازی کے پیشے اور مالِ غنیمت پر زندہ معاشرے والے اس سادہ اور کم مہذب عہد میں یہ کوئی حیرت کی بات نہ تھی کہ اُسے سکندر ''اعظم'' کہا جاتا تھا۔ اس لئے کہ جب وہ 32 برس کی عمر میں مرا تو اس وقت تک اس نے مال غنیمت کے لوٹنے کے لئے اپنی سلطنت میں میسوڈونیا اور یونان سے لے کر وہ سارے علاقے شامل کر دیئے جن میں آج کا ترکی، لبنان، اسرائیل، اردن، مصر، لیبیا، قبرص، شام، عراق، وسطی ایشیا کے ممالک، ایران، افغانستان، بلوچستان، اور پاکستان کے دیگر علاقے، اور ہندوستان واقع ہیں۔

جب 336 ق۔م میں فلپ قتل ہوا تو تخت سکندر کی جھولی میں تھا۔وہ 326 ق۔م کے

موسم بہار کے اوائل میں صوبہ خیبر پختونخوا کی طرف سے برصغیر میں وارد ہوا۔وہ اپنے ساتھ تاریخ نویس بھی لایا تھا۔انہوں نے جو باتیں یہاں کی دیکھیں یا سنیں اُن سب کے حالات قلمبند کیے۔

اس کے انجینئروں نے دریائے کابل اور دریائے سندھ کے مل جانے کے مقام سے ذرا نیچے کشتیوں کا ایک پل تعمیر کیا جہاں سے اس کی مہیب افواج گزر کر ٹیکسلا میں اپنا استقبال کرانے کے لئے پہنچیں۔(2) ٹیکسلا میں وہ اپنی فوجوں کو دریائے جہلم پر ہندوستان کے بادشاہ پورس کے ساتھ گھتم گتھا ہونے والی ایک جنگ کے لئے منظّم کرتا ہے۔جہلم کا دریا پورس کی شکست کا گواہ بن جاتا ہے۔یہی جہلم اس بات کا گواہ بھی ٹھہرا کہ سکندر کی فوجیں آگے جانے سے انکار کرتی ہیں اور وطن کے لئے اداس ہوکر سکندر کو بھاری دل کے ساتھ مجبور کرتی ہیں کہ وہ گھر واپسی کے طویل سفر میں اُن کی قیادت کرے۔جہلم دریا کے دونوں کنارے، ان وحشی افواج کے بھاری قدموں کی خوف ناک آہٹوں کے بھی گواہ ٹھہرے جو اس کے ساتھ ساتھ نیچے چلے۔اور یہی دریا ان 2000 کشتیوں کے فلیٹ کی شاہراہ بھی ٹھہرا جس میں سکندر کے بقیہ فوجی بیٹھ کر وطن واپس ہوئے۔یہ 326 ق۔م کے اواخر کا زمانہ تھا۔واپسی کے اِس سفر میں جہلم، چناب اور سندھ کے دریاؤں کے پیچ وخم سکندر سے شہر شہر فتح کرواتے گئے۔مگر............آگے تو بلوچستان تھا!

سکندر نے اپنے ایک ایڈمرل نیرکوس (Nearchos) کو دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر بحیرہ عرب اور خلیج فارس کے ساحل کے ساتھ ساتھ جانے اور دجلہ وفرات سے ہوتے ہوئے سوسا (Susa) تک جانے کا حکم دیا۔اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ دریائے سندھ کے دہانے سے لے کر سمندر اور ساحلی علاقوں تک کا جائزہ لے اور ہندوستان کو میسو پوٹیمیا کے ساتھ دریائی علاقے سے ہوتے ہوئے ایک سمندری راستہ کھول دے۔نیرکوس نے یہ سفر 325 اور 324 ق۔م کی سردیوں میں کیا۔اس نے اس علاقے کے بارے میں جو تحریریں لکھیں، وہ ہمارے لئے بہت اہم ہیں۔اس کی ان تحریروں کے ذریعے ہمیں بلوچستان کی اُس زمانے کی سماجی اور معاشی زندگانی کے بارے میں بڑی معلومات ملتی ہیں۔وہ اپنے پیشرو اور ہمعصر جغرافیہ دانوں کی طرح بلوچوں کو Ichthyophagi (یعنی ماہی خور) کا نام دیتا ہے۔ہماری اس دور کی ماہی گیری کچھ یوں

تھی۔''وہ اپنے جال سمندر میں پھینکتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہ جال کھجور کے پتے کو بل دے کر بنائے جاتے تھے''۔(3)

وہ بڑی مچھلیوں کو اچھی طرح دھوپ میں سُکھاتے تھے۔ پھر وہ انہیں پیس لیتے تھے اور ان کا آٹا بنا کر روٹی تیار کرتے تھے۔ وہ لوگ اپنے مویشیوں کو سبزہ نہیں دیتے تھے جو یا تو موجود نہ تھا ،یا کافی نہ تھا۔ وہ مچھلی کا آٹا اپنے مویشیوں کو دیتے تھے۔ خود بھی ماہی خور اور اُن کی بھیڑ بکریاں بھی ماہی خور!۔

یہ ماہی خور لوہا استعمال نہیں کرتے تھے۔ البتہ اس زمانے میں یہاں آگ موجود تھی۔ لہٰذا ان کے پاس جو بھی ہتھیار تھے، خواہ تیر ہو یا نیزہ، وہ اس کی انی کو محض آگ میں سخت بناتے تھے اور چقماق کے پتھر کے ساتھ اسے تیز کرتے تھے۔(4)۔ یہ نوکدار پتھر کو بھی چاقو کی طرح استعمال کرتے تھے۔ گو کہ آج بھی بلوچ چرواہے نوکدار پتھروں سے اپنے مویشی ذبح کرتے ہیں مگر آج کی بات اور ہے۔ آج لوہا موجود ہے جبکہ ہمارے اُن ساحلی اجداد کے ہاں لوہا ابھی متعارف نہ ہوا تھا۔

مکران کے ساحلی علاقوں کے لوگ دیو ہیکل مچھلیوں کی ہڈیوں کو عمارتی سامان کے لئے استعمال کرتے تھے۔ ان کا بالائی طبقہ جھگیوں میں رہتا تھا۔ اور سمندر کی کسی بڑی مچھلی کی ہڈیوں کو شہتیر اور کڑیوں کے بطور استعمال کرتا تھا۔ چپٹی ہڈیاں ان کی جھگی کا عظیم دروازہ بنتیں۔

سکندر کے اس مشہور بحری افسر اور سمندری سفر کے رہنما نیرکوس نے بلوچوں کی بہادری اور سخت کوشی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا:

''ان کا اسلحہ چھ ہاتھ لمبے نیزے تھے۔ جن کا پھل لوہے کی بجائے لکڑی کا تھا۔ لیکن یہ لکڑی لوہے سے زیادہ مضبوط تھی............۔ انہی نیزوں سے انہوں نے ہزاروں مقدونی سپاہیوں کے سینے چھید دیے تھے''۔(5)

وہ مزید کہتا ہے: ''ان کے جسم اور چہرے لمبے لمبے بالوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ وہ تیز اور لمبے کانٹوں کی مدد سے مچھلیوں اور درختوں کی شاخوں کو کاٹتے تھے۔ ان کا لباس حیوانات اور بڑی مچھلیوں کی کھال سے بنا ہوا تھا.....''(6)

بہر حال آگ کی موجودگی اور استعمال خود ایک زبردست سماج کی عکاسی کرتی ہے۔ تھوڑے سے اناج کی کاشت کا حوالہ بھی مصنف نے دیا ہے۔ اس طرح زراعت، ماہی گیری اور آگ کا استعمال ایک اچھے خاصے ترقی یافتہ سماج کی عکاسی کرتے ہیں۔

چھ دن ٹھہرنے کے بعد انہوں نے مالان کی طرف بحری سفر کا آغاز کیا............''۔

سکندر نے اپنے ایک اور جرنیل کراٹی راس کو وادی سندھ سے ہیلمند کے راستے کو روانہ کر دیا تا کہ وہ علاقے کا سروے کرتا ہوا سکندر سے پارس میں آن ملے۔ کراٹی راس درہ مولا سے گزر کر خضدار کے راستے گیا۔ کاش کہ ہمیں اس کا بھی کوئی روزنامچہ ملتا کہ ہم اس دور کے جھالاوان اور اس کے اڑوس پڑوس کے علاقوں کے علاوہ ایرانی بلوچستان کے سماج کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل کر سکتے۔

بہر حال سکندر کی واپسی کے راستے پر بحیرہ بلوچ کے طویل ساحل پر بلوچستان واقع تھا ۔اُس کے پاس کل ایک لاکھ بیس ہزار فوج تھی۔ اس نے اپنی فوجوں کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ اس نے نیرکوس کی قیادت میں آٹھ ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک حصہ، ساحل کے ساتھ ساتھ بحری جہاز پر روانہ کر دیا۔ 90 ہزار کو کراٹرس کی سربراہی میں عام راستے پر روانہ کر دیا اور بقیہ پچیس ہزار کی خود قیادت کرتے ہوئے وہ بلوچستان کے صحرا کے پاس مغرب کی طرف روانہ ہوا۔ کامل القادری نے لیمب کے حوالے سے لکھا کہ مقدونیہ کے بحری جہازوں کی ساخت ایسی تھی کہ وہ تین روز سے زیادہ کے لئے پانی یا خوراک اپنے ساتھ نہ لے سکتے تھے۔ گویا پورے سفر کے سلسلے میں یہ ضروری تھا کہ ہر تیسرے دن ساحل پر کم از کم اگلے تین دنوں کے لئے راشن پانی مہیا کیا جاتا رہے۔ مکران میں سے سفر کی ایک اہم غرض یہ تھی۔ اور سکندر نے یہ فرض اپنے سر لیا۔(7)

اس گدروشیائی صحرا میں (لسبیلہ سے کرمان تک کا علاقہ) ساٹھ دن کا سفر اس کی فوجوں کے لئے مکمل تباہی کا سفر ثابت ہوا۔ (اب معلوم نہیں کہ گدروشیا نام کا ''گدر'' لفظ سے کوئی تعلق ہے یا پھر یہ یونانیوں کا دیا ہوا نام ہے)۔ بہر حال گدروشیا کی تباہ کن گرمی اور پانی کی قلت نے بے شمار اموات اُسے بخش دیں۔ بالخصوص جانور تو بڑی تعداد میں سورج سے جلتی ریت میں پک پک کر

گرتے رہے۔ فاصلے لمبے تھے۔ پانی نہ ملتا تب بھی مصیبت تھی اور ملتا تب بھی موت تھی۔ نہ ملتا تو پیاس مار دیتی، ملتا تو بے قابو ہو کر بہت زیادہ پینے سے موت آجاتی۔ راشن سخت کم تھا لہٰذا سپاہی لوگ جان بوجھ کر خچر اور گھوڑے مار دیتے اور بہانہ کرتے کہ تھکاوٹ اور گرمی نے مار دیا۔ اگر اوپر والوں کو پتہ چلتا بھی تو وہ خود کو بے خبر ظاہر کرتے۔

سپاہی بیمار پڑتے تو اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے۔

اور جب دور پہاڑوں پر بارش ہوتی تو سیلابی ندیاں (جہاں پڑاؤ ہوتا تھا)، سکندری فوجوں کا صفایا کرتیں۔ کراچی اور اورماڑہ کے درمیان اسے شدید مشکلات پیش آئیں۔ بلاشبہ اس کی فوجوں کو پورے ایشیا میں اتنی مشکلات کا سامنا نہ ہوا جتنی کہ اسے گدروشیا میں پیش آئیں۔ (8) اس کے مورخوں کے مطابق مارچ کرتی ہوئی فوج کی مصیبت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ ڈسپلن گراوٹ کی انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ سپاہی کھلے عام شاہی سٹوروں پر ٹوٹ پڑتے۔ خوراک کے لئے وہ بار برداری والے جانوروں کو کاٹ پھاڑ ڈالتے اور ایندھن سے لدی ہوئی ویگنوں کو جلا ڈالتے۔ اُن سے اپنا غنیمت اور لوٹ کا مال بھی نہیں اٹھایا جاسکتا تھا۔ وہ اسے وہیں پھینکتے جاتے۔ انہیں بادشاہ کی جانب سے سزا' کے بجائے بھوک سے موت فوری نظر آتی تھی۔ (9)

بہرحال سکندر گرتے پڑتے دریائے ہنگول کے پاس پہنچا جہاں اس نے اپنی سمندری فوجوں کے لئے راشن جمع کرنے کی خاطر قیام کیا۔ مگر یہاں سے آگے سمندری فوج کے ساتھ رابطہ رکھنے کی خاطر وہ ساحل کے ساتھ ساتھ اپنا سفر جاری نہ رکھ سکا۔ سلسلۂ مالان کوہ نے اس کا راستہ روک لیا۔ اسے مجبوراً اندرونی علاقے سے جانا پڑا۔ وہ ہنگول کے ساتھ ساتھ مغرب کی سمت چل پڑا ۔ ہنگلاج کے مقدس دربار کے اردگرد موجود بڑے بڑے پہاڑوں میں سے اس نے اپنا راستہ بنالیا ۔ وہ چالیس میل تک دریائے ہنگول کے کناروں کی قدم بوسی کرتا رہا اور دریائے پرکان سے اُس کے آن ملنے تک چلتا رہا۔ یہ دریا ہنگول سے مغرب کی طرف جاتا رہا۔ سکندر کو پہلی بار ''مالان'' سے نجات ملی اور اس نے مغرب کی طرف سمندر کی جانب اپنے لشکر کا رخ موڑ دیا۔ سارے علاقے میں ریت کے ٹیلوں کے علاوہ کچھ نہ تھا اور اس کی فوجوں کے لئے راشن، اور پانی نایاب، اور اوپر سے

شدید گرمی۔ بلوچستان نہ اِس غاصب کو سایہ دینے پر آمادہ تھا اور نہ پناہ گاہ میسر کرنے پہ تیار۔

مگر سکندر آگ و ریت کی اس قیامت میں بھی اپنے ہوش و حواس میں رہا۔ اس کے مورخ ''آرین'' نے لکھا کہ سکندر کو پیاس نے بے چین کر رکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ پیدل ہی فوج کی قیادت کرتا رہا تھا تاکہ فوجیوں کو احساس ہو کہ سب لوگ ایک ہی طرح یہ مصیبت سہہ رہے ہیں۔ اور جب اس کے سکاؤٹ تھوڑا سا پانی کہیں سے ڈھونڈ کر لائے، اور اُسے پیش کیا تو سکندر نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر سب لوگوں کو متوجہ کر کے برتن سر سے بلند کر کے پانی زمین پر گرا دیا۔ (فوج کا مورال بلند کرنے کے حربے تو کوئی سکندر سے سیکھے!)۔

گو کہ پرکان کا راستہ اُسے دریائے بسول تک لے جاتا مگر وہ راستہ بھول کر پسنی کے قریب جا پہنچا۔ اس نے پسنی کے ساحل کے ساتھ ساتھ دو دن تک سفر جاری رکھا اور کرمان کی مشہور شاہراہ تک پہنچ گیا۔ وہ ساحل کو دریائے دشت کے قریب ہی چھوڑ سکتا تھا اور وادی باہو میں داخل ہو سکتا تھا جو اسے گدروشیا کے دارالحکومت بمپور تک لے جاتا تھا۔ مارچ کے اس حصہ نے تقریباً ایک ماہ کا عرصہ لے لیا۔ (10)۔

بمپور میں سکندر کو اپنے آدمیوں کے لئے خوراک اور پانی مل گیا۔ اور وہ سامان پا کر دوبارہ روانہ ہوا۔ بالآخر بہت زیادہ مشقتیں اور تکالیف جھیلنے کے بعد سکندر ''اعظم'' اپنی باقی ماندہ تباہ حال افواج کو بورایا بہرہ ''فہرج'' (موجودہ ایران شہر) کی طرف نکال کر لے گیا۔ ان مصائب سے اپنی نجات اور سلامتی کی مناسبت سے اس نے ایک جشن کا اہتمام کیا جو ایک ہفتے تک جاری رہا۔ (11)۔

یونانی فوج نے اس کے بارے میں لکھا ''اگر فہرج میں سرسبزی و شادابی اور پانی کی فراوانی نہ ہوتی تو ہم میں سے ایک بھی شخص زندہ نہ بچتا اور اس کے لشکر جرار کی تباہی کی خبر آگے پہنچتی''۔ (12) فہرج سے سکندر اعظم آگے بڑھا اور رخسانہ یا روشنک نامی بلوچستانی خاتون سے شادی کی مگر شادی کے بعد وہ زیادہ دیر تک زندہ نہ رہا۔

وہ 323 ق۔م میں بابل میں داخل ہوا۔ مشکلات اور تھکاوٹ سے چور، زخموں سے بھرا

اورزیادہ شراب نوشی سے بدحال، وہ بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر پڑ گیا۔ اور دو دن کے اندر اندر شہر بابل میں مرگیا۔ رخسانہ یا روشنک سے شادی کے چھ ماہ بعد۔ سکندر جو ابھی 33 سال کا بھی نہیں ہوا تھا۔

اس سفر میں سکندر کے ہمراہ چالیس ہزار فوجی تھے جن میں سے پچیس ہزار کے قریب راستے میں مر گئے۔ ان میں سے بیشتر صحرائے مکران میں مرے تھے۔ صحرائی گرمی، پیاس اور پانی کی نایابی نے اس فوج کو تباہ کرنے میں یقیناً اہم کردار ادا کیا مگر بلوچ قبائل نے جگہ جگہ ان پر چھاپہ مار حملے بھی تو کیے رکھے۔ کیونکہ یہ ان کی معلوم تاریخ میں ایک لازمی صفت رہی ہے۔ (13)

سکندر اپنی فتوحات میں علاقوں کو تباہ و برباد نہیں کرتا تھا۔ وہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کرنے کے بجائے روزانہ سونے کا انڈہ ہتھیا لینے کا قائل تھا۔ مال حاصل کرنے کے لئے وہ لوٹ مار، گھیراؤ جلاؤ قطعاً نہیں کرتا تھا۔ وہ رعایا کے ساتھ بھی اچھا برتاؤ کرتا تھا۔ وہ ان کے مقامی حاکم مقرر کرتا تھا۔ اس کے یونانی آرکی ٹیکٹ نئے نئے شہر بساتے، اس کے ساتھ لائے ہوئے جغرافیہ دان اور سروے والے مقبوضہ علاقوں کے مفصل نقشے تیار کرتے تھے۔ موجودہ لسبیلہ کے علاقے میں اس نے ''سکندریہ'' نامی شہر بسایا۔ اس نے پارس جیسی عظیم سلطنت کے طاقتور بادشاہ (داریوس سوئم) کی قوت کو تباہ کر کے اس کی ساری زمین اور القابات خود لے لئے۔ اس نے میسوڈونیا کے پہاڑوں سے لے کر مصر کے صحراؤں تک، اور برف پوش ہندوکش اور وسطی ایشیا کے میدانوں سے لے کر بلوچستان کے تباہ کن علاقے تک ایک بہت بڑے خطہ کو اپنی گزرگاہ تو بنا لیا مگر ساتھ ساتھ اس نے اس پورے انجانے خطے کے نقشے بنا لیے، شہر اور بازار تعمیر کر کے تجارتی راستے کھول دیے اور مشرق و مغرب کے درمیان خیالات کے تبادلے کو تقویت بخشی۔ وہ اپنے میسوڈونیا والے فوجیوں کی لاشیں اعزاز کے ساتھ دفن کراتا تھا۔ ان کے خاندانوں کو ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیتا تھا۔ اس کے حملوں اور فتوحات نے نسلوں کو باہم مخلوط کرایا، قبائل یہاں سے وہاں جا بسے، نظریات و کلچر کی موجیں باہم لین دین کرتی گئیں اور مشرق و مغرب کے درمیان ایک مضبوط و توانا رشتہ استوار ہوا۔ وہ واحد دس برس جو سکندر کو جوانی سے موت تک لائے، اُسے معلوم تمدن کی سرحدوں کے پار تک لے گئے۔ یونانیت جیسے ترقی پسند عنصر کے عہد میں شہروں نے بڑی تیزی سے وسعت اختیار کی

، شہر تجارت اور ترقی یافتہ صنعت کے مراکز بن گئے۔ علم و دانش کے چرچے بڑھے اور تہذیبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔

حوالہ جات

1- Crindle J.W. "The invasion of India by Alexander the Great"-1992-Indus Publication, Karach page No.15

2- ایضاً صفحہ 4۔

3- Oddone Longo, A Trip Among Fish Eaters۔ نیوز لیٹر آف بلوچستان۔ نیپلز، 1987,4، صفحہ 12۔

4- ایضاً، صفحہ 16۔

5- دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

6- دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

7- کامل القادری ''قدیم بلوچستان 1971''، بولان بک کارپوریشن کوئٹہ، صفحہ 42۔

8- Crindle......The Invasion صفحہ 173

9- رائس، ای۔ ای۔ الگزنڈر دی گریٹ 1997۔ Sutton پبلشنگ لمیٹڈ صفحہ 81

10- Crindle......The Invasion of India by Alexander، تعارف، صفحہ xxix۔

11- دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 110

12- دشتی، محمد اسماعیل / صادق بلوچ بلوچ۔ تاریخ اور تہذیب 1999۔ فضلی سنز لمیٹڈ۔ صفحہ 348

13- یحییٰ امجد ''وسطی عہد'' صفحہ 163۔

3۔ بلوچستان اور موریہ عہد

سکندر کی موت کے بعد چندر گپت نے سلطنت کے جنوبی حصے پر قبضہ کر لیا۔ سکندر کے اپنے جرنیل بھی اِس سلطنت پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں جنگیں لڑ رہے تھے۔ بالآخر سارے جرنیل اس فیصلے پہ پہنچے کہ سلطنت کو آپس میں بانٹ لیا جائے۔ چنانچہ سلطنت کا مشرقی حصہ (مادستان، پارس، توران، مکران، زابلستان اور کابلستان) 310 ق۔م میں سکندر کے ایک مشہور جرنیل سیلیوکس نیکاٹر کو ملا۔ اس نے صبر وشکر کے بجائے مزید پھیلنا چاہا اور ایک بہت بڑی فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ مگر مگدھ کے حکمران چندر گپت نے اسے بری طرح شکست دے دی۔ (اسی چندر گپت کی ماں کا نام مُرا تھا جس کی وجہ سے اس خاندان کو موریہ خاندان کہتے ہیں) (1)۔

شکست خوردہ سیلیوکس کو صلح کرنی پڑی۔ صلح کی شرائط کے مطابق یونانی جرنیل نے اپنی بیٹی چندر گپت موریہ سے بیاہ دی اور افغانستان و بلوچستان بطور تاوان چندر گپت کو دے دیے۔ (2)۔ کہتے ہیں کہ اس یونانی حسن کے لئے چندر گپت نے 500 ہاتھی اپنے شکست خوردہ سسر کو تحفتاً دے دیئے۔ اتنی دور سے چندر گپت بھلا بلوچستان کو کیا چلا سکتا تھا۔ (اسے تو قریب کے کراچی سے اسلام آباد سے نہیں چلایا جا سکا ہے!!)۔ چنانچہ لوگ، اپنے پہاڑوں کے اندر ایک سادہ انسانی زندگی بسر کرتے رہے۔

چندر گپت نے بیس برس سے زیادہ عرصہ تک حکومت کی۔ اور 296 ق۔م میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس کی وفات کے بعد اس کا بیٹا بندوسار (296-273 ق۔م) تخت نشین ہو گیا۔ اس نے بھی باپ کی طرح 24 برس تک حکومت کی۔ چانڑکیہ ہی اس کا مشیر تھا۔ چانڑکیہ جو ہندوستان کا میکاولی تھا۔ سازشوں، مہارتوں اور جوڑ توڑ کا بادشاہ۔ اُس کے دو تین اقوال سنیے تو اندازہ ہو جائے گا کہ بادشاہ ظالم کیوں ہوا کرتے تھے:

* کسی کو زیادہ ایماندار نہیں ہونا چاہیے۔ وہی سب سے پہلے شکار ہو گا۔

* سانپ خواہ زہریلا نہ بھی ہو تو بھی اسے زہریلا ہونے کا دکھاوا کرنا چاہیے۔
* ہر دوستی کے پیچھے ایک ذاتی مفاد ہوتا ہے۔

اس نے بھی بلوچستان پہ کوئی حکومت نہ کی اور نہ ہی کوئی اثر ڈالا۔ البتہ ہم پہ اثر اس کے بیٹے اشوک نے ڈالا اور وہ بھی فوجی زور سے نہیں بلکہ ایک اور طریقے سے۔ اشوک اُس وقت منظر عام پر آیا جب بندوسار کے دور میں ٹیکسلا میں بغاوت ہوئی۔ اس نے اس بغاوت کو کچلنے کے لئے اپنے بیٹے اشوک کو ایک بڑی فوج کے ساتھ روانہ کر دیا۔ اشوک نے بڑی کامیابی کے ساتھ حالات پر قابو کر لیا۔

بندوسار کی موت کے بعد اس کا بیٹا اشوک 273 ق۔م میں تخت نشین ہوا۔

4۔ بلوچستان اور اشوکِ اعظم

(304-232 ق۔م)

(سنسکرت میں ''اَ'' کا مطلب ''بغیر''، اور ''سوکا'' کا مطلب ''غم''۔ ''کوئی غم نہیں''، کوئی پریشانی نہیں)

اشوک کا شمار موریا خاندان کے عظیم اور نامور بادشاہوں میں ہوتا ہے۔ اس کی سلطنت میں آج کا سندھ و پنجاب و خیبر پختونخواہ، مغرب میں افغانستان، بلوچستان، بنگلہ دیش، آسام، کرالا اور آندھرا شامل تھے۔ مگدھ (آج کا بہار) اس کا دارالحکومت تھا۔ اشوک کی بادشاہی میں پورا شمالی اور وسطی ہند شامل تھا اور اس کی یہ سلطنت وسطی ایشیاء تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے 38 برس تک حکومت کی۔ حسن تدبیر اور ملکی سرحدوں کی نگہبانی کی صلاحیتوں کے باوجود بنیادی طور پر اشوکا کی حکومت بھی اپنے دادا کی طرح ظلم پر قائم تھی۔

اشوکا نے فتوحات کے لالچ میں کالنگا کی جنگ شروع کر دی۔ کہتے ہیں کہ جس وقت جنگ ختم ہوئی تو اشوک شہر کا دورہ کرنے نکلا۔ مگر اسے وہاں صرف جلے ہوئے مکان اور ہر جگہ بکھری لاشیں ہی نظر آئیں۔ اس منظر نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور وہ یہ مشہور خود کلامی چیخا:

''یہ میں نے کیا کر دیا؟ ۔اگر فتح یہ ہے تو پھر شکست کیا ہے؟ ۔کیا یہ فتح ہے یا شکست؟ ۔ کیا یہ انصاف ہے یا بے انصافی؟ ۔کیا یہ بہادری ہے؟ ۔کیا معصوم بچوں اور عورتوں کو قتل کرنا بہادری ہے؟ ۔کیا میں ایسا سلطنت کو توسیع دینے کے لئے کرتا ہوں یا شان وشوکت کے لئے، یا دوسروں کی سلطنتوں کی تباہی اور اپنی طمطراق کے لئے؟ ۔کسی نے اپنا شوہر کھویا، کسی نے باپ، کسی نے بچہ، کسی نے پیٹ کا بچہ............ لاشوں کا یہ ملبہ کیا ہے؟ ۔کیا یہ فتح کی علامتیں ہیں یا شکست کی؟ کی۔ یہ گدھ، کوے، اورعقاب موت کے پیغامبر ہیں یا بدی کے؟''۔

تب اس نے 260 ق م میں بدھ مذہب اختیار کیا' راہبانہ لباس پہن لیا اور بدھ مذہب کی تعلیمات کے مطابق شکار اور گوشت خوری سے پرہیز شروع کردی...... وہ ہر ذی روح سے شفقت اور نرمی کے سلوک کی تلقین کرتا تھا۔ بدھ مذہب سے متعلق اس کی تحریریں ستونوں پر کندہ کی گئیں۔

''دیوتاؤں کا محبوب'' اس بادشاہ کا لقب تھا۔ یہ بدھ مت کا بہت جوشیلا پیرو کار تھا۔ اس نے بدھ مت کی تبلیغ وترویج کی زبردست کوشش کی۔ مگر ایسا کرتے ہوئے اس نے جبر سے قطعاً کام نہ لیا۔ وہ انتہائی رواداری برتنے والا بنا۔ وہ لوگوں کے دلوں دماغوں کو جیت کر انہیں اپنے دین میں شامل کرتا تھا۔ اشوک کو مہاتما بدھ کے بعد بدھ مت میں سب سے اونچا درجہ حاصل ہے۔

اشوک نے اپنی پوری سلطنت میں ریڈیکل تبدیلیاں کیں۔ اس سلطنت میں ریونیو جمع کرنے پہ بہت زور دیا گیا۔ جس کی خاطر کسانوں کی بڑے پیمانے پر آبادکاری کی گئی۔ اپنے وسیع تعمیراتی منصوبوں کی تکمیل اور تجارت کی سرپرستی کے لئے اشوک نے بڑی شہرت حاصل کی۔ اس نے بدھ مت کو ریاست کا مذہب قرار دے کر برہمنوں کے اقتدار واثر کو کاری ضرب لگادی ۔جب وہ شہزادہ تھا تو اس نے ٹیکسلا میں وائسرائے بن کر بلوچ علاقوں پر حکمرانی کی تھی۔ (3)۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچستان میں بعض مقامات پر بدھ مت کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اور ابھی تک بلوچستان میں سنائی جانے والی فوک داستانوں میں بدھ مت کے اثرات بڑے پیمانے پر ملتے ہیں۔ (4)

بلوچستان میں بہت سے علاقوں میں ''گجاری'' جاتی اور ہندوؤں کی مستقل کالونیاں موجود ہیں جن میں کچھ کشان کے عہد میں اور کچھ گپت کے زمانے میں آباد ہوئے۔ (5) بلوچستان میں بدھ مت کے آثار چلگری اور تمبو میں دیکھے گئے ہیں۔ تمبو میں بدھ مذہب کی مہر بھی ملی ہے۔ (6)

گوردگال نامک کے مطابق موجودہ بلوچستان کا وہ علاقہ جو بولان کے پہاڑوں کے مشرق میں واقع ہے۔ اور جسے کچھی کا علاقہ کہا جاتا ہے، وہاں بدھ مت کے پیروکار رہتے تھے۔ مگر باقی بلوچستان یعنی مشرقی سلیمانی قبائل، توران اور مکران کے لوگوں نے بدھ مت قبول نہیں کیا۔

آج اگر آپ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ مشہور ومعروف دانشور اور گوشہ نشین شہزادہ مہاتما بدھ کے مذہب کو نسل انسانی کے تقریباً نصف حصے نے اپنا رکھا ہے۔ سدھارتا نامی یہ دانشور نیپال کے پہاڑوں کے دامن میں کپل دستو نامی سلطنت کے حکمران سدھودانہ کا بیٹا تھا۔ وہ 622 ق۔م میں پیدا ہوا۔ وہ کوروش اور داریوش کا ہم عصر تھا۔ اس نے برہمن معلمین سے تعلیم حاصل کی اور غورو فکر میں لگ گیا۔ والد نے 16 برس کی عمر میں ایک باکمال شہزادی ''گوپا'' سے اس کی شادی کردی۔ اس کے علاوہ بھی شہزادے کی دو اور بیویاں تھیں۔ کنیزوں کا لاتعداد ریوڑ بھی اس کی ''خدمت گاروں'' میں شامل تھا۔ اسی انداز میں رہتے ہوئے اسے 29 برس ہوگئے کہ ایک روز باہر جاتے ہوئے اس نے ایک لاغر وناتواں بوڑھے شخص کو دیکھا جس کا سر گنجا تھا اور جس کے اعضا ہل رہے تھے۔ وہ زخموں سے بھرا ہوا تھا۔ پھر اس نے ایک تابوت کی لاش کو دیکھا جس کے گرد متوفی کے عزیز اور دوست رو رہے تھے۔ اس نے اس دکھ بھری زندگی پہ افسوس کیا جو ایک خواب اور بربط کی آواز کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس نے زمین پر افسوس کیا جو غم کی وادی ہے، جو دکھ درد سے لبالب بھری ہے۔ تب سدھارتھ نے دنیا سے کنارہ کشی کرنے کا ارادہ کرلیا اور اپنے محل، بیویوں، بچوں (وہ بیٹا بھی جو تھوڑی دیر پہلے پیدا ہوا تھا) کو چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اور خود کو زبردست چلّوں اور کفاروں کے تابع کر دیا۔ بھوک، بیماری، گرمی، سردی اور طوفان برداشت کئے۔ لیکن چھ سال کی نفس کشی اور

سختیوں کے بعد بھی سچ کو دریافت کرنے میں ناکام رہا۔ مگر وہ گیان میں مصروف رہا۔ اس نے بالآخر دلچسپ دریافتیں کرلیں۔ وہ بُدھ (عارف) بن گیا۔ اس کے گیان میں چار سچائیاں شامل تھیں: تکلیف، درد کی پیدائش، درد سے نجات اور اس کو ختم کرنے کے ذرائع، جس سے لافانی خوشی حاصل ہوتی ہے۔

اس نے یہ بات بتائی کہ بلاتخصیص تمام جاندار، اذیت اور تکلیف کے تابع ہیں۔ وہ خود کو مہاتما بدھ یعنی ''روشن خیال'' کہتا تھا۔ اس نے 36 برس کی عمر میں سرعام تبلیغ شروع کی۔ وہ زرد رنگ کا لبادہ پہنتا تھا، سر منڈواتا تھا اور ہاتھ میں پیالہ رکھتا تھا۔ اس نے تقریباً 44 برس سفر کیا اور دور دراز جا کر لوگوں اور شہزادوں کو اپنے مذہب کی طرف راغب کیا۔ اس کی زندگی کے اہم مقامات (اجودھیا، گایہ اور راجگڑھ) اب اس کے پیروکار کے لئے زیارت گاہیں ہیں۔ اس نے اپنی آخری رات تبلیغ میں گزاردی۔ اور اپنے شاگردوں کو الوداع کہنے کے بعد گیان میں بیٹھ گیا۔ اور اسّی برس کی طویل عمر میں، سال کے درخت کے نیچے کنج میں بیٹھے ہوئے فوت ہوگیا۔ جہاں اس کے بااعتماد چیلے آنند نے اس کے لئے بستر تیار کردیا تھا۔ اس کی راکھ کو ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں ضلع گورکھپور کے ''کیسیا'' میں دفن کردیا گیا۔

مہاتما بدھ ہندوؤں کے رسم و رواج اور تقریبات سے الگ رہا۔ اس نے برہمن رہبانیت کو ہٹا دیا، قربانیوں کے ڈرامے بند کردیئے اور دیوتاؤں کو بے اختیار کردیا۔ وہ سنسار سے باہر کسی پرآتما کو نہیں مانتا تھا۔ اُس کے نزدیک نہ بھگوان کا وجود تھا اور نہ ہی دیوی دیوتا کا۔ اس کے نزدیک سنسار میں ہر طرف دکھ ہی دکھ ہے۔ اور اس دکھ کا سبب یہ ہے کہ انسان ہوس کا غلام ہوگیا ہے۔ طاقت کی ہوس، مال و دولت کی ہوس، عیش وعشرت کی ہوس، جنسی لذتوں کی ہوس۔ بدھ، ہوس یعنی نفسانی خواہشوں کا دشمن تھا۔ لہٰذا نہ تو ہوس کی پرستش کی جائے اور نہ ہی اس کو مکمل تیاگ دیا جائے۔ درمیانہ راستہ ہی ٹھیک ہے۔ یہ بیچ کا راستہ ''سچائی'' کا راستہ ہے۔ اس راستے کی آٹھ شرطیں ہیں: مناسب خیالات، مناسب ارادے، مناسب کلام، مناسب کردار، مناسب کسب، مناسب جہد، مناسب حافظہ اور مناسب دھیان۔ سچ بولنا، چوری نہ کرنا، دوسروں کے مال میں

خیانت نہ کرنا، نہ دوسروں کے مال پہ قبضہ کرنا، پرائی بہو بیٹیوں پر للچائی نظریں نہ ڈالنا۔ یہ ان ''مناسبات'' کی عملی شکلیں ہیں (7)۔ یہ حیران کن بات ہے کہ فطرت اور ماحولیات کا جتنا احترام بدھ مت کرتا ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔

برہمن کی چودھراہٹ اور بنیاد پرستی کے خلاف یہ مذہب پورے ہندوستان، سیلون، برما، سیام، جاپان، چین، کوچن، چین منگولیا، منچوریا، تبت اور مشرقی جزائر میں پھیل گیا۔ بلوچستان میں اس مذہب کے اثرات کا ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں۔ کندا بیل (گنداواہ) کو تو اس کے ایک مرکز کی حیثیت سے بتایا جاتا ہے۔

اشوک نے خود کو دیکھا، اپنی جوانی کو دیکھا جو بہت سی بیماریوں، بڑھاپے اور موت کے تابع تھی۔ وہ 232 ق۔م میں فوت ہوگیا۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل اس نے سنیاس لے لیا اور بدھ بھکشو بن گیا تھا۔

اس کے بعد موریا خاندان زوال کا شکار ہوگیا۔ اور جنوب مشرقی ایران (بلوچستان) سے اس کی عملداری کا خاتمہ ہوگیا۔

حوالہ جات

1۔ مارسڈن۔ ای/ خلیفہ عمادالدین۔ تاریخ ہند۔ 2005۔ بک ہوم لاہور۔ صفحہ 60
2۔ چانکیہ، اچاریہ کوتلیہ/ ذبیح محمد اسماعیل ''ارتھ شاستر'' (مقدمہ)، 1991، پی سی ایچ اس، کراچی، صفحہ 39
3۔ نہرو، جواہر لال ''تاریخ عالم''، صفحہ 203
4۔ نصیر، گل خان ''بلوچی رزمیہ شاعری 1979''، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 14
5۔ سید، عبدالقدوس، ''ٹرائبل بلوچستان 1990''، فیروز سنز لاہور، صفحہ 50
6۔ بلوچ، سردار خان'' اے لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ'' جلد اول، 1977، بلوچی اکیڈمی کوئٹہ، صفحہ 401
7۔ سبط حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ صفحہ 119

5۔ مانویت اور مزدکی تحریکیں

بعد میں بلوچستان بیکٹر یائی سلطنت (آج کے وسطی ایشیاء اور بلخ) کا حصہ بنا۔ اس سلطنت کا 130 ق۔م میں وسطی ایشیاء کے ایک خانہ بدوش قبیلہ ساکا (Scythians) نے تختہ کر دیا۔ پہلی صدی ق۔م کے شروع میں ساکا جنوبی افغانستان اور بلوچستان سے آگے بڑھے۔ اور وہاں سے ہندوستان گئے اور 400 سال تک حکمرانی کی۔(1)

پانچویں صدی میں بلوچستان ہندی قبضہ میں نظر آتا تھا۔ جب ہند کے ملک شرماہ نے اپنی بیٹی ساسانی سلطنت کے حکمران بہرام گور (404 تا 427) سے بیاہ دی اور جہیز میں سندھ اور مکران دے دیئے۔

اُس زمانے میں مرکزیت والی ساسانی بادشاہت قائم تھی۔ زرتشتی مذہب ریاستی مذہب تھا۔ مگر شاہ پور اول کے دور میں اس وقت ایک نیا مذہبی رہنما اور تحریک نمودار ہوئے جب مانی نے خود کو یسوع مسیح کا سب سے بڑا اور آخری حواری جتایا۔ وہ آخر میں قتل ہوا۔ اس کی تحریک اور مذہب کا نام ''مانویت'' پڑا۔ اس تحریک سے ہمارے اس خطے کے غلام داری سماج میں زبردست بحران آیا۔ مانویت نے اس سماجی ڈھانچے کو غیر منصفانہ قرار دیا اور اس پر زبردست تنقید کی۔

ایسے میں جب دوسرے علاقے بھی مفتوحات میں شامل ہوتے رہے تو اس غلام دارانہ سماج کے بالائی طبقے کو تو دولت ملی مگر ان کے سماج کے اندر بڑھتے ہوئے بحران میں بھی شدت پیدا ہوتی گئی۔ کئی بغاوتیں ہوئیں مگر کوئی بڑی کامیابی نہ مل سکی۔

مگر یہیں پر مزدک کی قیادت میں ایک اور تحریک شروع ہوئی۔ وہ ایک ابتدائی سوشلسٹ (Protosocialist) تھا۔ ایک ایسا مصلح اور مذہبی شخص جس نے ساسانی شہنشاہ قباد اول کے دور میں زبردست اثر ورسوخ پیدا کیا۔ اس نے مشترکہ ملکیت اور سماجی بہبود کے پروگرام شروع کیے۔ وہ اپنے فلسفے کو زرتشتی مذہب کا اصلاح کردہ اور پاک کردہ صورت سمجھتا تھا۔

مزدکیوں نے سماجی برائیوں کے خلاف کھلے عام جدوجہد کرنے کا اعلان کیا۔ ان کا مطالبہ تھا

کہ فاضل جائیداد رئیسوں سے چھین لی جائے۔ مزدک کی نظر میں لالچ، خودغرضی اور حرص ہی ساری برائیوں کو پیدا کرتے ہیں۔ اسی حرص اور استحصال نے ''انسانیت کی برابری'' والے خدائی حکم اور خواہش کو تباہ کر دیا تھا۔ مزدک نے خدا کی اس خواہش اور حکم کی دوبارہ بحالی کو اپنا مقصد حیات بنا دیا (2)۔ وہ خود بھی زرتشتی ملاّ یعنی معبد تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسرے نجی ملکیت کے طرفدار زرتشتی ملاّ اُسے کافر سمجھتے تھے۔

مزدکیت کے مطابق انسان کو اپنے عمل میں دنیا کے اندر روشنی پھیلانے کی جدوجہد کرنی چاہیے اور یہ کام بہتر اخلاقی رویوں اور مثالی زندگی سے کیا جا سکتا ہے۔ نرم خو ہونا چاہیے، مہربان اور مہمان نواز ہونا چاہیے۔ برادرانہ امدادِ باہمی کی حوصلہ افزائی اور حرص وظلم کو کم کرنے کے لئے مزدک نے جائیداد کو اجتماعی ملکیت میں دینے کا تصور پیش کیا۔(3) کمیونزم اور مزدکیت میں کوئی فرق نہیں سوائے اس کے کہ مزدکیت سائنسی کے بجائے عینیت پسندی کی خصوصیت رکھتی ہے۔

مزدک نے مذہبی رسومات کی اہمیت کم کی۔ اس نے نفس کشی پر بہت زور دیا۔ نفسانی خواہشات حرص کو جنم دیتی ہیں جو دوسروں کے استحصال تک لے جاتا ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ شادیوں پر ممانعت کر دی۔(4) وہ زرتشتی ملاّؤں کی مضبوط پوزیشن پر تنقید کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا ملاّؤں نے عوام کو محکوم بنا رکھا ہے اور اُن کی غربت بڑھا دی ہے۔

مزدک کے مطابق ابتدا میں خدا نے زمین پر گزربسر کا کافی سامان مہیا کیا مگر طاقتور لوگوں نے کمزوروں کو خوفزدہ اور گمراہ کیا، بالادستی حاصل کی اور عدم مساوات پیدا کی۔

اس بدبختی کا علاج انصاف کی بحالی ہے اور ہر شخص ضرورت سے زیادہ ذخیروں کا مساوی حقدار ہے۔ اس مقصد کے لئے وہ ساری دولت کو مشترک بنانا چاہتا تھا۔

ساسانی دور سلطنت میں عوام کا استحصال اور ظلم اپنی انتہا کو پہنچ چکے تھے۔ غلام داری عروج پر تھی اور وہی بحران کا سبب بھی تھی۔ فیوڈل اشرافیہ کے ناقابل برداشت ستم کے نتیجے میں غریب کسانوں کی شہروں کی جانب زبردست مائی گریشن ہوئی مگر شہروں میں بھی انہیں غلام ہی برتا جاتا تھا۔ اسی ظلم وجور کے ارتکاز نے اُس انقلاب کا لاوا اگل دیا جس کی قیادت مزدک نے کی۔

عوام کی پست حالت اس قدر خستہ تھی کہ مزدک کا کمیونزم آناً فاناً مقبول ہوا۔ ہزاروں لاکھوں لوگ مزدکیت کے پیروکار بن گئے۔ سلطنت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چند ماہ کے اندر اندر مزدکیت ہی مزدکیت تھی۔ مزدک کے پیروکاروں نے امرا کے محلات پر حملے کیے اور وہ سا ری قیمتی چیزیں لے گئے جن پر انہیں مساوی حقدار ہونے کا یقین تھا۔

چونکہ زرتشی ملاؤں اور وڈیروں کی طاقت بہت بڑھ چکی تھی اور بادشاہ اُن کی اس طاقت کو کمزور کرنا چاہتا تھا اس لئے شاہ قباد اول نے اس نئے نظریے کی حمایت کی اور وہ مزدکی مذہب میں شامل ہوگیا۔ اس نے مزدک کی تعلیمات کے مطابق معاشی سماجی اصلاحات کیں۔ جس سے وڈیرے اور زرتشی ملاّ اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ردِ انقلاب میں قباد کو سال 496 کو عارضی طور پہ اپنے بھائی جماسپ کے حق میں معزول ہونا پڑا۔ مگر فوراً ہی اس نے پینترا بدل ڈالا اور تین سال بعد دوبارہ اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور دوبارہ حکمران بنا۔ اب وہ سمجھ چکا تھا کہ مزدکیت ایک ایسا کمیونسٹ انقلاب ہے جو اس کی بادشاہت کے خاتمے پر جا کر دم لے گا۔ چنانچہ اب کے اس نے مزدکیوں ہی کا قتل عام شروع کیا۔ اس قتلِ عام کی قیادت اس کے شہزادے خسرو اول نے کی جسے پھر نوشیروان کا خطاب ملا۔

(نوشیرواں کے حکم سے مزدک کو باندھا گیا اور باغ کے وسط میں اسی مقصد کے لئے خصوصی طور پر تیار کردہ بلند مقام پر زمین میں زندہ گاڑ دیا گیا۔ اور بے شمار تیروں سے چھلنی کر دیا۔ یہ واقعہ 528 کے اواخر یا 529 کے اوائل میں پیش آیا۔

مگر ظاہر ہے اتنے بڑے نظریے کو ایک ہی دن میں تو ختم نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ جب ضیاء الحقی خصوصیات والا نوشیروان 531 میں خود بادشاہ بنا تو اس نے مزدکیوں کے قتل عام کا ایک اور دور چلایا۔ کہتے ہیں کہ اِس چنگیز کے ہاتھوں تیس ہزار مزدکی مارے گئے۔ اُس نے بہ ظاہر تو مزدک کی تعلیمات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا مگر یہ فلسفہ تو مزدک کی شہادت سے بعد بھی صدیوں تک جار ی رہا۔ بلاشبہ مزدک کی انقلابی تحریک ہمارے خطے کی تاریخ میں سب سے بڑی طبقاتی تحریک تھی (5)۔

اور اسلام سے قبل بلوچوں کی اکثریت اسی انقلابی مذہب ''مزدکیت'' سے وابستہ تھی۔ مزدکیت فوراً ختم نہ کی جا سکی اور بالخصوص دارالحکومت سے باہر دور دراز کے علاقوں میں تو یہ کسی نہ کسی شکل میں کئی صدیوں تک قائم رہی۔

6۔ نوشیروانِ بے عدل

انوشیروان (خسرو پرویز) نے محض اس کمیونسٹ تحریک کو کچلنے اور اپنے اصلی استحصالی نظام کو بحال کرنے کے نام پر ہی بلوچوں کا قتل عام نہ کیا، بلکہ اس نے تو جب دریائے سندھ تک پیش قدمی کی (531 عیسوی میں) تو بھی پورے راستے میں بلوچوں کو تباہ و برباد کرتا گیا۔ اس کی ظلم و جبر کی سلطنت میں موجودہ افغانستان، بلوچستان، موجودہ ایران، عراق اور کچھ عرب علاقے شامل تھے۔ اس کے ظلم و جور کی ضرب المثل آفریدیوں کے پشتو میں یوں ہے:

چہ نوشیروان بادشاہ وی
اختک وبختک وزیران وی
نوں ڈیرے بوڑے کنڈ والے بہ وگورے

ترجمہ:

اگر نوشیروان بادشاہ ہو
اختک بختک اس کے وزیر ہوں
تو بے شمار آباد گھروں کو کھنڈروں میں بدلتے دیکھو گے

بلوچ خانہ بدوش مویشی بان تھے، کسان تھے، اور ماہی گیر تھے۔ ان کی معاشی ضرورتیں انہیں سرسبز چراگاہوں اور پانی کے چشموں کی طرف کھینچ لاتی تھیں۔ شہنشاہ نوشیروان کے اپنے اغراض تھے۔ بلوچوں نے علیم والوں سے دوستی گانٹھ کر شمال میں بحیرہ خضر کے جنوبی اور مغربی علاقہ گیلان والوں کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ کرمان سے لے کر مازندران تک سارے بلوچوں نے

بغاوت کا علم بلند کیا۔

نوشیروان کی فوجوں نے بلوچوں کی آبادیوں پر قیامت خیز حملہ کر دیا۔ اس کی خونریز اور سفاکانہ کارروائی میں بلوچ لڑتے کٹتے ''کوہ البرز'' سے نکلے اور دو حصوں میں منقسم ہو کر مکران میں زابل سیستان پہنچے۔ خسرو اول جو کہ ہرمزین نوشیروان کا بیٹا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک سال تک مکران میں قیام پذیر رہا۔ جہاں اس نے کھیتی باڑی کو بہتر بنایا اور کاشتکاروں کو میوہ کے باغات، شکارگاہوں اور چراگاہوں کے قیام کے لئے ترغیب دی۔ جب خسرو مکران سے چلا گیا تو اس نے اشکاش کو اس علاقے کا گورنر بنا دیا۔

بلوچوں کے خلاف نوشیروان کے اس حملے کا بیان، شاہنامہ میں دیا گیا ہے۔ ہم اِس بے عدل اور ظالم بادشاہ کے بارے میں پھیلائے گئے اُس باطل تاثر کو زائل کرنے کے لیے شاہنامہ کا یہ ٹکڑا نقل کرتے ہیں۔ جس کے تحت اُس کو بہت عادل اور منصف بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے:

همی رفت و آگاہے آمد بہ شاہ
کہ گشت از بلوچی جہانے تباہ
زبس غارت و کشتن و تاختن
زنفریں پراگشدہ گشت آفرین
دل شاہ نوشیرواں شد غمی
برآمیخت اندوہ باخرمی
بہ ایرانیاں گفت ، الانان وہند
شد از بیم شمشیر ماچوں پرند
بشندہ نباشیم باشہر خویش
ہے شیر جوئیم و پیچاں زمیش
بدوگفت گوئندہ کائے شہر یار
بپالیز گل نیست بے رنج خار

هما رزتا بود بارنج بود
زبہر پراگندن گنج بود
زکار بلوچ، ارجمند اردشیر
بکوشید، باکار دانان پیر
نہد سود مندی بہ افسون و رنگ
نہ از بند و رنج و نہ پیکار و جنگ
اگرچند بد ایں سخن ناگزیز
بپوشید برخویشتن اردشیر
زگفتار دہقان آشفتہ شاہ
بسوئے بلوچ اندر آمد ز راہ
چو آمد بنزدیک آں برزہ کوہ
بگردید گرد اندرش باگروہ
بدان کوہ گرد اندر آمد سپاہ
کہ بستند برمار و برمور راہ
ہمہ دامن کوہ تا روئے شخ
سپاہ بود برسان مور و ملخ
منادی گرے گرد لشکر بگشت
خروش آمد از کوہ و از غار و دشت
کہ ہر گز بلوچی بیابند خورد
چہ از تیغ داران مردان گرد
و گرانجمن باشد از اند کے
نباید کے یابد رہائی یکے

چو آگاہ شد لشکر از خشمِ شاہ
سوار و پیادہ بہ بستند راہ
از ایشان فراوان و اندک نماند
زن و مرد جنگی و کودک نماند
سراسر بشمشیر بگذاشتند
ستم کردن کوچ برداشتند
بشد ایمن از رنج ایشان جہان
بلوچی نماند آشکار و نہان
چنان بد کہ بر کوہ ایشان گلہ
بدی بے نگہبان و گردی یلہ
شبانے نہ بودی بر گوسفند
بہ ہامون و برتیغ کوہ بلند
ہمہ رنجہا خوار بگذاشتند
در و کوہ راخانہ پنداشتند

بعد ازاں بلوچستان ، بالخصوص اس کا مغربی علاقہ اگلی دوصدیوں تک انہی ساسانیوں کے پاس رہا۔خسرو پرویز (591 تا628) نے اپنے باپ کی سلطنت کے سندھ کی جانب مشرقی علاقوں پر دوبارہ قبضہ کرلیا جنہوں نے بغاوت کی تھی۔ بعد میں کمزور شدہ ساسانیوں کو سندھ کے برہمن حکمرانوں نے زیرکرلیا جن کی حکومت بلوچستان تک پھیلی ہوئی تھی۔

7۔ چچ

اُدھر 635 تک رائے خاندان کے حکمرانوں نے سندھ میں برہمن حکمران کوزیرکرلیا تھا،جوکہ پانچ پشتوں سے حکمرانی کررہا تھا۔ان کی سلطنت ملتان سے لےکر ساحل سمندر،اورساحل

سے لےکر پہاڑوں تک پھیلی ہوئی تھی۔جس میں بلوچستان کا علاقہ جھالاوان بھی شامل تھا۔رائے حکمرانوں کا آخری بادشاہ رائے ساھاسی تھا۔وہ جب مرا تو چچ نامی اس کے برہمن وزیر نے بیوہ ملکہ(رانی سوہنی دیوی) سے شادی رچالی اور تخت پر بیٹھ گیا۔ برہمن کا بیوہ سے شادی کرنا برہمی تعلیمات کی یکسر خلاف ورزی تھا۔لیکن حکمران نے برہمن مولویوں سے فتوے حاصل کرکے اس شادی کو جائز قرار دیا۔رانی سوہنی کی اس سے پہلے کوئی اولاد نہ تھی۔اب اس شادی کے بعد چچ سے اس کے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان کے نام علی الترتیب یہ تھے۔ داہر،دہرسینہ اور بائی مابین۔(6)

632 میں جبکہ فارس پر ملکہ توران دُخت کی حکومت تھی جوکہ خسرو پرویز(شیریں فرہاد والے خسرو) کی بیٹی تھی، نے کرمان اور مکران پر یلغار کی تھی۔خسرو پرویز کو جب اس کے بیٹے شیرویہ نے (جوشیریں کے بطن سے تھا)قتل کردیا تھا تو اس قتل کے تین چار سال بعد توران دُخت تخت نشین ہوئی تھی۔اسی ملکہ کے زمانے میں چچ ایک دن شبھ گھڑی نکلوا کر ارمن بیلہ(موجودہ ضلع لسبیلہ میں ساموندی کے قریب ایک شہر) کی سمت روانہ ہوا۔ یہاں کا راجہ بودھ شرامن تھا جوکہ رائے ساہسی کے مقررکردہ حاکموں کے خاندان سے تھا۔مگر بعد میں یہ لوگ رائے خاندان کے مخالف ہوئے۔اس بودھ راجے نے آگے بڑھ کر رائے چچ کا استقبال کیا اوراس کے ساتھ دوستی کا عہد کیا۔ اس کے بعد چچ کرمان کی طرف روانہ ہوا۔ جب وہ مکران سے آگے گیا تو وہ بکر کے علاقے میں آگیا۔اس شہر میں ایک قدیم قلعہ تھا۔جس کا نام تب ''پنج پور'' تھا اور یہ اُس جگہ تھا جہاں اب پنجگور ہے۔ چچ نے پنجگور کے اس قلعے پر قبضہ کرلیا اور اس کی مرمت کا حکم دے دیا۔ پھر وہ اس جگہ گیا جہاں کرمان اور مکران کے درمیان ایک دریا ہے۔ اس کے کنارے ایک جگہ کھجور کے جھنڈ تھے ۔وہاں پراُس نے لکھوایا:

''یہ جگہ ہند کی سرحد تھی چچ کے وقت میں، جو بیٹا تھا سیلاج کا، جو بیٹا تھا باساباس کا۔ یہ سرحد آج ہمارے قبضہ میں آئی ہے''۔(7)

چچ نامہ میں ہے کہ اس کے بعد وہ واپس توران کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔

اور گنداواہ پہنچا۔ چچ گنداواہ کے باہر میدان میں خیمہ زن تھا اور شہر پر اچانک حملے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ گنداواہ کی فوجیں قلعہ بند ہوگئیں۔ وہاں سے وہ آگے بڑھ کر دریائے سنی، یا سمنی کے کنارے جا کر رکا۔ کچھ عرصہ محاصرے کے بعد گنداواہ شہر کے لوگ صلح کے طلب گار ہوئے اور دونوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے مطابق ان پر سالانہ خراج 100 پہاڑی خچر اور ایک لاکھ درہم مقرر ہوئے۔ ایک سال کا ٹیکس پیشگی وصول کیا گیا جس کی وصولی کے بعد وہ واپس اروڑ گیا اور چالیس سال تک حکومت کرنے کے بعد 671 میں مرگیا۔(8)

چنانچہ سندھ کا یہ حکمران، چچ 'ارمابیل (لسبیلہ) سے مارچ کرتا ہوا جھلاوان کے علاقے سے کندابیل (گنداواہ) تک، اور اس کے بعد سبی تک دریائے ناڑی (بیجی) تک آیا۔ (گنداواہ کی بنیاد ہندوؤں اور ترکوں کے درمیان پارس کے بادشاہ بہمن نے رکھی تھی)۔

چنانچہ بلوچستان اور بالخصوص مکران' عربوں کے حملے شروع ہونے تک سندھ کے تحت تھا۔

حوالہ جات

1- دشتی، جان محمد Essay on Baloch National Struggle in Pakistan گوشۂ ادب، جناح روڈ کوئٹہ، صفحہ 7

2- براؤن، ایڈورڈ، جی۔''اے لٹریری ہسٹری آف پرشیا جلد نمبر ا کیمبرج 1929، صفحہ 170۔

3۔ Corne, Patricia
Kawad's Heresy
in: Iran 29 (1991), P- 21-40. and " Mazdak Revolt"

4۔ Yarshater, Ehsan. The cambridge history of Iran , vol-2 P-999

5- ایچ جی ویلز مختصر تاریخ عالم۔ 2001۔ تخلیقات لاہور۔ صفحہ نمبر 175

6۔ یحیٰی امجد ''وسطی عہد''۔ صفحہ 40

7۔ قلیچ بیگ ''چچ نامہ''، صفحہ 68

8۔ یحیٰی امجد ''وسطی عہد''، صفحہ 40

8۔ اسلام سے قبل یہاں کے مذاہب

قبل از تاریخ بلوچستان کے مختلف علاقوں میں مختلف مذاہب کی پیروی ہوتی تھی۔ زرتشتی اور بدھ مت ان سب میں اہم ترین بلوچستانی مذاہب رہے ہیں۔

پنجگور اور خاران میں زرتشتی آثار موجود ہیں۔ مزدکیت تو اسی مذہب کا انسانی نرم چہرہ ہے۔ بالخصوص مغربی بلوچستان کے بلوچ اس کے پیروکار رہے۔ آگ کی تو اب تک عزت کی جاتی ہے۔ اُس کی طرف تھوکا نہیں جاتا، اس کی طرف پاؤں کر کے نہیں سوتے، اس کی طرف تھوکنا گناہ تصور ہوتا ہے، آگ پر سے پھلانگا نہیں جاتا بلکہ اب بھی ہم چکر کاٹ کر گزرتے ہیں، اُس کی طرف بُجا نہیں کیا جاتا۔ مریض کو تندرست کرنے کے لیے بڑی آگ جلا کر تیز موسیقی میں ڈانس کرتے ہیں جسے ''جھنڈ جنغ'' کہتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے چیف جسٹس سمجھ کر قتل تک کے فیصلے کرائے جاتے ہیں۔ ملزم آگ میں جل جائے تو قاتل، نہ جل پائے تو معصوم۔

ہم سورج کے ساتھ بھی مندرجہ بالا تعظیم رکھتے ہیں۔ مکران میں لوگ بات کرتے ہوئے جب قسم کھائیں گے تو ''سورج کی قسم'' کھائیں گے۔ ہم غروبِ آفتاب کو اچھا نہیں سمجھتے۔ ہم سورج ڈوبنے کو ''سورج برکت ہوگیا'' کہتے ہیں۔

بلوچستان کے مختلف علاقوں میں بدھ مذہب کی موجودگی کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں۔ گنداواہ سب سے اہم ہے۔

ساتویں صدی میں مکران کے visitors لکھتے ہیں کہ مکران میں 6000 بھکشوؤں کے ساتھ بدھ مت کی تقریباً 100 عبادت گاہیں تھیں۔ اسی طرح لسبیلہ میں 5000 بھکشوؤں کے ساتھ بدھ مت کی 80 عبادت گاہیں تھیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کے ابتدائی وقت میں بلوچستان میں بدھ مت کی زبردست آبادی موجود تھی۔

لسبیلہ میں مائی گوندرانی کا مزار ہے۔ بعض ماہرین آثار قدیمہ کے مطابق یہ غار ساتویں صدی عیسوی میں بدھ مت کے پیروکاروں نے بنائے تھے اور بدھ مت کے پیروکاران غاروں میں

رہتے تھے۔

غاروں کی اس بستی کے اندر ایک آبشار کے واضح نشانات اب بھی موجود ہیں۔مقامی روایات کے مطابق ہندووں کی بڑی تعداد اشنان کرنے آتی تھی۔وہ اس اشنان سے پوتر ہوتے تھے۔

بہت سے غار سرنگ کے ذریعے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔غار کے باہر باقاعدہ برآمدہ بنایا گیا تھا۔اس کے بعد غار کا دروازہ اور کمروں کے اندر بھی کئی پارٹیشن ہیں۔گویا باورچی خانہ یا اٹیچ باتھ روم ہو۔

اِن غاروں سے وابستہ مائتھالوجی ملاحظہ کریں:

1- پیغمبر سلیمانؑ کے دور میں کسی نامعلوم بادشاہ کی بیٹی بدیع الجمال کو دیو نے قید کرلیا تھا۔کئی بہادر، بادشاہ کی بیٹی کو اس دیو سے آزاد کرنے آئے لیکن دیو کا مقابلہ نہ کرسکے۔شہزادہ سیف الملوک کو خبر ہوئی۔اس نے دیو کو قتل کر دیا اور بادشاہ کی بیٹی کو آزاد کرالیا۔اُس وقت سے لے کر آج تک ان غاروں میں دیو اور شیطانی قوتوں کا بسیرا ہے۔

2- دوسری کہانی کے مطابق یہاں رہنے والی ''مائی گوندرانی'' نامی خاتون نے اپنی جان دے کر اس خطے کے لوگوں کو اُس دیو اور شیطانی قوتوں سے نجات دلائی۔مائی گوندارانی قریب ہی ''شیر روغن'' کے مقام پر مدفون ہے۔اسی مرشد اور ولی خاتون کی نسبت سے اس علاقے کا نام ''گوندرانی'' پڑ گیا۔

3- ایک اور خیال یہ ہے کہ ان پہاڑوں اور غاروں میں شیطانی قوتوں اور راکھشسوں کا ڈیرہ ہے۔جو سیر کے لیے غاروں سے باہر نکلتے تھے اور اپنی بھوک مٹانے کے لیے مقامی گوندارنی لوگوں کا گوشت کھاتے تھے۔اور یہ سلسلہ اس وقت تک چلتا ہی رہا۔جب ایک خاتون مائی گوندرانی نے اپنی جان دے کر اِن راکھشسوں اور شیطانی قوتوں کا خاتمہ کر دیا اور مقامی لوگوں کو اس سے نجات دلائی۔

اس کے علاوہ لاہوت شاہ نورانی خضدار اور ہنگلاج لسبیلہ میں شیولنگ کی موجودگی رہی ہے۔

9۔عربوں کی آمد

(مہاجر یا حملہ آور؟)

بلوچ کلاسیکل شاعری میں بتایا گیا ہے کہ:

ماہواں رندوں ژہ حلبا پاذآتکغوں
دو برا جنگی گوں یزیدا مانا تکغوں
آڑ تو ایرانا میر جلال خانا کشتغوں
رند پہ بولانا ،ما ڈھاڈر و سیوی گپتغاں
نیلا او سنی ئے تڑو گھیراں نشتغاں
کوہِ مارانامیر حسن رندہ بوذن اث
تخت شورانا آتکو میرالی نشتغاں

(یعنی بلوچ وہ رند ہیں جو حلب سے نکلے۔دوبار یزیدی فوج سے ٹکرا گئے۔ہمیں میر جلال خان ایران لے آیا۔ہم بولان سے ڈھاڈر و سیوی پر قابض ہوگئے۔نیلا اور سنی کے آس پاس آباد ہوگئے۔کوہِ ماران میں میر حسن رند کا بسیرا ہوا۔تخت شوران میں میرالی آن بسے)۔

یہ نظریہ بلوچوں کے اندر بہت طاقتور انداز میں موجود ہے۔ان اشعار کو دیکھیں تو لگے گا کہ بلوچوں کی عرب (حلب) سے بلوچستان آمد حضرت امام حسینؓ اور یزید کی جنگ کے بعد ممکن ہوا ہوگا کہ اُس کے بعد وہاں سے ہجرت کر کے بلوچستان آیا جائے۔لیکن عرب تو اُس سے بہت پہلے (دیگر وجوہات کی بنا پر بھی، اور نیز حملہ آور کی صورت میں بھی) بلوچستان پہنچ چکے تھے۔ہم دونوں صورتوں پر بات کریں گے۔

ساتویں صدی کے پہلے نصف کے دوران مدینہ میں اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا تھا اور اس نے جلد ہی اپنی سرحدیں بڑھانی شروع کی تھیں۔حکومت کو فوج کی حمایت حاصل تھی۔فوج کو معاوضہ زمین کی صورت میں نہیں دیا جاتا تھا بلکہ معاوضہ کی صورت میں جنگ میں حاصل شدہ مالِ غنیمت میں سے حصہ ملتا تھا۔اس رواج کی وجہ سے نسبتاً طویل عرصے تک فوج کے

لڑنے کی صلاحیت باقی رہی۔عرب ریاست کے تحت زمین کا بیشتر حصہ یا تو نجی ملکیت میں تھا یا پھر جرگہ کی ملکیت۔ ریاست کی زمینوں کے ٹکڑے ملٹری اور سول بیوروکریسی کو ملنے شروع ہوگئے۔ یہ زمینیں انہیں مدت ملازمت تک کے لئے دی جاتی تھیں۔اس طرح زمینداروں اور طاقتور امراء کے ایک نئے طبقے کی تشکیل کا آغاز ہوا جن کی جائیداد ریاست کی ملازمت پر منحصر ہوتی تھی۔ یہ زمین مالکوں سے اس وقت واپس لی جاسکتی تھی جب نیا مالک مطلوبہ فرائض انجام دینا شروع کردیتا۔پیغمبرِ اسلامؐ کے وصال کے بیس برس بعد تک عربوں نے مشرقِ وسطیٰ کا پورا علاقہ فتح کرلیا تھا۔اور سو سال بعد تو اٹلانٹک سے لے کر بحرِ ہند تک کا سارا علاقہ اُن کے تصرف میں تھا۔

ساتویں صدی کے وسط تک ملکِ عرب متحد تو ہوگیا مگر مستقل استحکام کی کوئی امید نہ تھی اس لئے کہ اس اتحاد نے زمین کی تقسیم کے مسئلے کا کوئی حل پیش نہیں کیا تھا۔ملکِ عرب میں طاقتور تعلقات قائم کرنے کے بعد سرداروں کو خواہش پیدا ہوئی کہ پڑوسی قوموں کی زمینوں پر قبضہ کر کے ان میں مزید توسیع کرلیں۔اس دوران بہت ساری مہموں کے دوران خانہ بدوش (جن کے لئے جاگیردارانہ نظام والے ملکِ عرب میں کوئی جگہ نہیں تھی)، پیشہ ور فوجی بن گئے اور بعد میں مختلف مفتوحہ ممالک میں زمیندار بن گئے۔ اس سے جاگیردارانہ سماجی طرز کو تقویت حاصل ہوئی اور حکومت کو قابلِ اعتماد فوجیں بھی مہیا ہوگئیں۔ان فوجوں کی گزر بسر مفتوحہ ممالک سے ہوتی تھی۔ جو بھی اُن کے سامنے مزاحمت کے بغیر ہتھیار ڈال دیتا وہ اُن کی جائیداد کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔اس سے مفتوحہ علاقوں میں آبادی کے خاصے بڑے حلقے نیوٹرل ہوگئے۔عربوں نے وہاں سے فوجی بھی بھرتی نہ کیے اور مقامی امراء کو مراعات سے بھی محروم نہ کیا۔ وہ صرف محصول اکٹھا کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔ علاوہ ازیں مفتوحہ علاقوں کو ریاستی ملکیت قرار دے کر گو کہ مقامی آبادی پر محصول عائد کیے گئے مگر مقامی سرداروں پر محصول کا بوجھ بہت حد تک گھٹا دیا گیا تھا۔

المختصر عرب حکمرانی ایک معاشی نظام پر مبنی تھی۔سروس کے عوض مشروط زمینداری، لازمی محصولات اور فوجی خدمت......دشمنوں کی زمینیں جب ان حکمرانوں نے عام پیمانے پر از سرِ نو تقسیم کردیں تو زمین کی اس وضع کی ملکیت کا غلبہ ہوگیا۔ طاقتور سرداروں کی زمین پر عام طور پہ پابند

کسان کام کرتے تھے۔

جہاں تک بلوچستان کا معاملہ ہے تو خلیفہ ثانی، حضرت عمرؓ نے پہلی بار ایک جماعت مکران بھیجی تاکہ اس علاقے کے حالات و کوائف کا جائزہ لیا جاسکے۔(بلوچستان کے ایک بڑے حصے میں اُس وقت بدھ مت کا راج تھا)۔عربوں کی جماعت نے مکران کے بعض علاقوں کو دیکھا اور واپس جاکر خلیفہ کو یہ رپورٹ پیش کی: ''اس علاقے کی خیر سے اس کا شر زیادہ ہے۔ پہاڑ تو پہاڑ اس کے میدان بھی پہاڑوں سے زیادہ دشوار گزار ہیں''۔ جماعت کے سربراہ نے کہا کہ اس علاقے میں تھوڑی فوج رکھنے سے اس کے مغلوب ہونے کا خطر ہے۔اور زیادہ فوج کے لئے وہاں غلہ اور پانی نہیں ہے، اور وہ بھوک اور پیاس سے ختم ہوجائے گی''۔ چنانچہ بلوچستان پر حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا گیا۔مگر حضرت عمرؓ ہی کی خلافت (634-643) کے آخری برس عبداللہ بن عبداللہ کی فوج یہاں آئی۔مکران کے سعد نامی حکمران نے زبردست مزاحمت کی مگر شکست کھا گیا۔

حضرت عثمانؓ کے عہد حکومت (644-656) میں عبدالرحمٰن بن ثمرہ نے سیستان کے پایہ تخت زرنج سے لے کر کیچ مکران تک کا علاقہ فتح کرلیا۔(1) اس فتح میں انہیں بلوچستان کے بختی اونٹ اور بھیڑ بکریاں ملیں۔

23ھ میں مکران کے فتح پر الحکم بن عمرو ثعلبی نے درج ذیل اشعار کہے:

لقد شبع الارامل غیر فخر
بفئ جا ء مس مکران
اتا ہم بعدمشقۃ وجہد
وقد صفر الشاتمن الد خان

ترجمہ:

اس میں فکر کی بات نہیں
کہ مکران کے مالِ غنیمت سے بیوائیں سیر ہوگئیں
یہ مالِ غنیمت مُشقت اور جدوجہد سے حاصل ہوا
گھر میں چولہا نہ جلنے کی وجہ سے موسم سرما دھوئیں سے خالی تھا(2)

پھر، حضرت علیؓ (عہد حکومت 655-661) نے 658 شاغر بن داعو کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا۔ اس نے کوہ قیقانان (قلات) تک کا علاقہ فتح کرلیا۔ جب وہ کوہ قیقانان میں پہنچے تو 20 ہزار بلوچ پہاڑی دروں کی حفاظت کے لئے ڈٹے ہوئے تھے۔ مگر، تاریخ نے اپنے فیصلوں پر عمل کروانا ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ بلوچ شکست کھا گئے اور قلات فتح کرلیا گیا۔ اس جنگ میں بے شمار ''مالِ غنیمت'' ہاتھ لگا اور ہزاروں نوجوان مرد اور عورتیں غلام اور کنیزیں بنائی گئیں۔

دراصل عرب حکمرانی میں ایسے نئے ملکوں کو شامل کیا گیا جو معاشی اعتبار سے اُس کے دستنگر نہیں تھے اور جہاں مختلف نسلوں کے لوگ آباد تھے جن کی اپنی الگ تاریخ اور روایات تھیں۔ ان کی وجہ سے ریاست میں بالکل ویسی بدامنی پیدا ہوئی جو جاگیرداری نظام والی تمام ریاستوں میں ہوا کرتی تھی۔ سواروں پر مشتمل فوجوں نے (جنہیں صرف ''مالِ غنیمت'' میں حصے کا حقدار تسلیم کیا گیا تھا) حضرت علیؓ کی قیادت میں ان رئیسوں کے خلاف بغاوت کردی جنہوں نے بڑی بڑی زمینیں حاصل کی تھیں۔ 656 میں حضرت علیؓ خلیفہ بن گئے مگر رئیس طبقہ نے اپنی طاقت اکٹھی کرلی اور بنی امیہ کے معاویہ کی قیادت میں تحریک چلائی۔

اس تحریک کا گڑھ شام تھا جو کہ نئے مفتوحہ ملکوں میں سے زیادہ منظّم ملک تھا۔ طاقتور سرداروں کی پشت پناہی میں معاویہ نے شام سے آدمی اور سامان کی کمک حاصل کر کے ان لڑائیوں میں فتح حاصل کرلی۔ حضرت علیؓ شہید کر دیے جاتے ہیں اور حکمرانی پر معاویہ قابض ہو جاتا ہے۔ امیر معاویہ نے شام کو بدستور اپنا ہیڈ کوارٹر بنائے رکھا۔

معاویہ نے عبداللہ عبدی کو چار ہزار سواروں کے ساتھ ہمارے وطن پر قبضہ کرنے بھیجا مگر چچ نامے کا مصنف راجہ چچ (راجہ داہر کا باپ) اپنے چچ نامہ (صفحہ 103) میں ذکر کرتا ہے کہ 41 ہجری میں خضدار اور گنداواہ کے کوہستانوں میں اُسے شکست دی گئی۔ پھر اس نے تین چار سال بعد راشد بن عمرو کی قیادت میں دوسرا لشکر بھیجا۔ اس سے بھی بلوچستان دو دو ہاتھ کر گیا اور راشد مارا گیا۔ اموی لشکر کو واپس جانا پڑا پھر سنسان بن سلمہ آیا، قتل ہوا۔ (3)

664 میں معاویہ کی خلافت میں المنظر خضدار پہ حاوی تھا۔ وہ وہیں مرگیا۔ ادھر عربستان

میں داخلی چپقلش جاری تھی۔ اور جب عبدالمالک (684-705) حکمران بنا تو اس نے حجاج کو عراق کا گورنر بنایا۔

حجاج بن یوسف 694 میں عراق کا والی بنا تو اس نے سعید بن اسلم کلابی کو مکران پر حکومت کرنے بھیجا۔ جب سعید مکران پہنچا تو وہاں ایک مسلمان سردار سفہوی بن لام سے اس کی تلخ کلامی ہوگئی اور اس نے سفہوی کو قتل کر دیا۔ سعید بن اسلم قلابی نے مکران اور ارد گرد کے علاقوں سے پہلے کی نسبت بہت زیادہ ٹیکس وصول شروع کر دیئے۔ عرب آباد کار علافی خاندان اس زمانے میں مکران کی سرحد پر آباد تھا اور راجہ داہر کا حلیف تھا۔ سفہوی انکا رشتہ دار تھا۔ علافی قبیلے نے حملہ کر کے سعید کو قتل کر دیا اور خود مکران پر قبضہ کرلیا۔ (4)

حجاج بن یوسف نے کچھ عرصہ بعد مجاعہ بن سعر تمیمی کو گورنر مکران بنا کر بھیجا۔ تب تک علافی مکران سے واپس چلے گئے اور سندھ میں راجہ داہر کے تعاون سے اس علاقے میں آباد ہو گئے تھے۔

واضح رہے کہ سعید کے بعد موجا کو مکران کا انچارج بنایا گیا تھا۔ مگر وہ 705 میں مرگیا اور محمد بن ہارون نے اس کی جگہ لے لی۔ اس نے بودائیل کی قیادت میں اس فوج کی مدد کی جو سیلون کے حکمران کی طرف سے خلیفہ کو بھیجے گئے آٹھ جہازوں پہ لدا ہوا سامان قزاق، کرک اور میدوں سے واپس لینے آیا تھا۔ مگر یہ مہم ناکام ہوئی اور بودائیل قتل ہوا۔ حجاج نے اس پورے خطے کو فتح کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اس نے خلیفہ ولید سے سندھ پر حملہ کرنے کی اجازت مانگی تو خلیفہ ولید بن عبدالملک (705-715) نے اخراجات کا عذر کیا۔ اس پر حجاج نے لکھا کہ جنگ میں جو خرچ ہوگا اس کا دگنا تگنا واپس کرنا میری ذمہ داری ہے۔ حجاج نے یہ عہد پورا کیا۔

حجاج نے محمد بن قاسم اموی کو سپریم کمانڈر بنا کر بھیج دیا۔ محمد ہارون اس کے ساتھ ہوا مگر وہ مرگیا، اور بیلہ میں دفن ہوا۔ محمد بن قاسم اموی نے ایک ماہ مکران میں ٹھہرنے کے بعد پہلے پنجگور کو فتح کیا پھر ارمن بیلہ کو فتح کر کے چند ماہ وہاں قیام کیا۔ (5) ارمن بیلہ سے وہ سیدھا بھنبور (دیبل) روانہ ہوا۔ اس وقت داہر کا بیٹا جے سنگھ نیرون (حیدرآباد) میں تھا۔ محمد بن قاسم نے چچ کے بیٹے داھر سے سندھ فتح کیا اور مکران کو اس میں شامل کر دیا۔ اس نے جب دیبل فتح کرلیا تو بلا امتیاز

سارے سپاہیوں کو مار دیا اور سب سے بڑے مندر پر قبضہ کر کے سارے مذہبی راہنماؤں کو قتل کر دیا۔مندر سے تقریباً 700 عورتیں قبضہ میں لے کر انہیں لونڈیوں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔ دیبل سے حاصل کردہ مالِ غنیمت فوج میں مقام اور رینک کے مطابق بانٹ دیا گیا۔خلیفہ کا پانچواں حصہ اُسے روانہ کر دیا گیا۔(اس منطقے کو فتح کرنے پر چھ کروڑ درہم خرچ ہوئے۔اس کے عوض حجاج نے بارہ کروڑ درہم شاہی خزانے میں جمع کیے۔یہ نقدی اس رقم کے علاوہ تھی جو لشکریوں میں تقسیم ہوئی (6)۔دیبل کی فتح، سپاہیوں کے قتل عام اور شہر و مضافات کی لوٹ نے عوام سے مزاحمت کی ہر نشانی مثالی ڈالی اور عربوں کے لئے دیگر شہروں اور علاقوں کو فتح کرنا آسان ہو گیا۔اس لئے نیرون کوٹ، سیوستان، برہمن آباد، آرور، اور ملتان ایک ایک کر کے ہتھیار ڈالتے رہے۔

محمد بن قاسم اموی؛ ابھی ملتان میں بیٹھا ہندوستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا کہ حجاج بن یوسف 715 میں مر گیا۔اور چند ماہ بعد حجاج کا مربی خلفیہ ولید بن عبدالملک بھی اس دنیا سے چل بسا۔ولید کے بعد اس کا بھائی سلیمان بن عبدالملک (715 - 717) جو حجاج کا جانی دشمن تھا، خلیفہ بن گیا۔اس نے حجاج کے قرابت داروں سے چن چن کر بدلہ لیا۔اس دشمنی کا خمیازہ محمد بن قاسم کو بھی بھگتنا پڑا۔اور خلیفہ سلمان کے جلاد گرفتاری کا پروانہ لے کر پہنچے اور محمد بن قاسم کو کھال میں لپیٹ کر عراق روانہ ہو گئے۔وہ 21 سال کی عمر میں راستے ہی میں مر گیا۔

یہاں یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ سیوستان وہ شہر ہے جسے اب سہون کہتے ہیں۔صوبہ سیوستان میں بودھیہ، جنکان اور روجھان کی پہاڑیوں کے مضافات سے لے کر سرحد مکران تک کے تمام علاقے میں شامل تھے۔سیوستان کا علاقہ سبی سے لے کر ساحل مکران تک پھیلا ہوا تھا۔بودھیہ موجودہ ضلع لاڑکانہ کا پورا علاقہ اور ضلع جیکب آباد کا مغربی علاقہ تھا۔اور اسے یہ نام اس لئے دیا گیا کیونکہ یہاں کی آبادی کا مذہب بدھ مت تھا۔

عرب فاتحین بلوچستان کو آناً فاناً مسلمان نہ کر سکے بلکہ بلوچ بہت عرصے تک اپنے عقیدوں پر قائم رہے۔کہیں جا کر دسویں صدی کے مورخوں نے بلوچوں کا ذکر مسلمانوں کی حیثیت سے کیا ہے۔

جب عرب فاتح بن کر اس خطے میں آئے تو اس وقت رائے سلطنت، قندہار تک اپنی رعایا سے خراج وصول کرتی تھی۔عربوں نے دوسرے ٹیکسوں کے علاوہ خراج (زمین کا ٹیکس) بھی وصول کرنا شروع کیا۔مقامی قبیلے کا سربراہ اس کے لئے یہ کام کرتا تھا۔اسے وہ ''ارباب'' کہتے تھے (7)۔

عرب جب وسطی بلوچستان میں آئے تو انہوں نے دیکھا کہ خضدار اور گنداواہ کے درمیان کا علاقہ ترکوں کے پاس تھا اور کیکان (نال) اس علاقے کا اہم مقام تھا۔نال کے قریب عربوں کی بستی ''البیضہ'' کے آثار اب بھی باقی ہیں۔قصدر (خضدار)، کیکان، قندابیل اور مستنج (مستنگ) اس دور میں اہم تجارتی مرکز تھے۔

اموی خاندان کے دور حکومت (661-750) میں عربوں اور مقامی حکمران کے درمیان تعلقات میں تیزی سے اضافہ ہوا۔بعد میں اموی خلفاء نے محصولوں میں بڑے پیمانے پر اضافے کیے۔وسیع سلطنت کو چلانے کے لئے جو فوجی بجٹ درکار تھا، وہ بڑے بڑے محکم علاقوں کے استحصال سے بھی پورا نہیں کیا جا سکتا تھا۔امویوں کی وسیع سلطنت کا شیرازہ بکھرنا شروع ہوا۔فوج مختلف درجوں والے زمینداروں کے طبقے میں بدل گئی۔آٹھویں صدی کے پہلے نصف میں مفتوحہ علاقوں کے اندر سلسلے وار بغاوتیں ہوئیں۔یہ بغاوتیں بالآخر خود شام تک پہنچ گئیں۔وسطی ایشیاء میں زبردست بغاوت ہوئی جو بعد میں عراق اور ایران تک پھیل گئی اور امویوں کے زوال کا باعث ہوئی۔مگر عنانِ حکومت باغیوں کے ہاتھ نہ آئی بلکہ عباسیہ خاندان نے تخت سنبھالنے میں اس ہیجان انگیز صورتحال کا فائدہ اٹھایا۔اس خاندان کے خلفاء (750-1257) نے عراق کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔

عباسیہ خاندان کے تحت آٹھویں اور نویں صدیوں میں دنیائے عرب کی معیشت اور تہذیب نے زبردست ترقی کی، بالخصوص خلافت کے مرکز عراق نے۔یہاں ایک وسیع علاقے میں نہ صرف نسبتاً یکساں وضع کا جاگیردارانہ سماج موجود تھا۔بلکہ زراعت میں تیزی سے ترقی بھی ہوئی۔ تجارت بہت بڑھی اور دستکاریوں کی زبردست نشوونما ہوئی۔ان سب باتوں نے سماجی استحکام کو زبردست تقویت بخشی۔بلاشبہ عرب ممالک اُس زمانے میں دنیا کے سب سے ترقی یافتہ ممالک تھے۔ زمین کی تقسیم کی خصوصی صورت یہ تھی کہ غیر مزروعہ قطعات خلیفہ (بادشاہ) کی ملکیت تھے۔وہ یہ

قطعات بیوروکریسی کو اُن کی سروسز کے صلے میں دیتا تھا۔ زمین کے بہت بڑے رقبے یا تو ذاتی ملکیت میں ہوتے تھے یا پھر خلیفہ کی ملکیت میں۔ جو زمینیں سرکاری عہدے پہ منحصر ہوتی تھیں، ان کے مالکوں کو ہر حال میں فوجی سروس دینی ہوتی اور خلافت کی حکمرانی کے ایام میں انہیں اپنے ساتھ مسلح فوجی دستے لے کر جنگ میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ ان زمینوں پر کام کرنے والے کسان، سرکار کو محصول ادا کرتے تھے اور مالکوں کو لگان۔ ریاست کی آمدنی کا بڑا حصہ زمین کے محصول سے وصول ہوتا تھا۔

مگر سرکاری نوکری کے لئے عطا کردہ زمین رفتہ رفتہ ذاتی ملکیت بن گئی۔ یہ عمل نویں صدی میں رونما ہوا۔ اس عمل میں مذہبی اداروں کو دی جانے والی زمین (اوقاف) کے اضافے نے اہم کردار ادا کیا۔ کسانوں کی حالت روز بروز کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ پہلے محصول جنس کی صورت لیا جاتا تھا۔ مگر اب نقدی کی صورت میں اس کی وصولی ہونے لگی۔ جس کے نتیجے میں سودخوری آئی اور کسان مزید ابتر حالت میں زندگی گزارنے لگے۔ سلطنت کے دور دراز اور خصوصاً غیر عرب علاقوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ اور ساتھ ساتھ بڑے زمینداروں اور مرکزی حکومت کے درمیان جدوجہد شروع ہوگئی۔ یہ زمیندار معاشی اور سیاسی خودمختاری چاہتے تھے۔ اس علیحدگی پسندی کا مقابلہ کرنے کے لئے خلفاء نے کوشش کی کہ ریاستی ادارہ مضبوط ہو مگر خلیفہ کی طاقت کا سرچشمہ (مالِ غنیمت پر گزر بسر کرنے والے عرب خانہ بدوشوں کی فوج) غائب ہو چکا تھا۔ چنانچہ خلافت کی خستہ حالت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وسط ایشیاء اور ایران نے اپنی خودمختاری کا اعلان کردیا۔ بلوچستان بھی ایران کے ساتھ ہولیا۔

مامون الرشید نے (834-833) میں وفات پائی اور اس کا بیٹا ابواسحٰق محمد ہارون بادشاہ بنا اور اس نے معتصم باللہ (خدا کی پناہ کے نیچے) کا لقب اختیار کیا اس کے زمانے میں بھی سندھ اور بلوچستان میں بغاوتیں ہوئیں۔ مثلاً قلات اور، گنداواہ کے لوگوں، سندھ کے مید (ماچھی اور مہانڑے) سب نے بغاوت کی۔ جنہیں اس نے کچل دیا۔

یوں 976 تک بلوچستان میں عربوں کی حکومت کا دور رہا جس کے بعد یعقوب بن لیس صفاری نے بلوچستان میں صفاریوں کی حکومت قائم کی جو ایران کی حکومت کے تابع رہی۔ صفاریوں

کے بعد بلوچستان سلجوقیوں کے ہاتھ آیا۔

ہباری دور حکومت (855-1010) کے آخر میں ریاست مکران، ریاست مشکے اور ریاست توران خودمختار ریاستیں تھیں۔ ریاستِ مکران کا پایہ تخت کیچ تھا۔ یہاں کی سب سے بڑی پیداوار گنا تھا۔ جس سے سفید چینی بنائی جاتی تھی جسے عرب لوگ الفانید کہتے تھے اور ایرانی لوگ پانید۔ یہ چینی قریبی مما لک کو برآمد کی جاتی تھی۔ مکران کی بندرگاہ ''تیز'' تھی۔

بعد میں اس کا پایہ تخت پنجگور رہوگیا۔ اس میں ایک کچا قلعہ تھا اور اس کے اردگرد خندق تھی۔ شہر کے اردگرد نخلستان تھا۔ شہر کے دروازے دو تھے۔ ایک کا نام ''بابِ تیز'' تھا۔ جس میں سے وہ سڑک گزرتی تھی جو کہ بندرگاہ تیز کو جاتی تھی اور دوسرے کا نام ''بابِ توران'' تھا جس سے نکل کر سڑک توران (خضدار) جاتی تھی۔ جی جی سٹرینج کے مطابق یہاں کے لوگ بلوچ تھے جو نام کے مسلمان تھے۔ (8)

ریاست مشکے، ریاست مکران کے قریب ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔

نویں اور دسویں صدی کا مکران کسی صورت میں بیابان، الگ تھلگ اور پسماندہ علاقہ نہ تھا۔ جو لٹریچر ہماری دسترس میں ہے اس کے مطابق بلوچستان کے ساحل انتہائی ترقی یافتہ اور گنجان آباد شہروں اور قصبوں کے مالک علاقے تھے۔ یہاں شہری زندگانی بہت متحرک، بہت فعال تھی۔ دستکاری زبردست ترقی یافتہ تھی۔ شہروں کے اردگرد باغات اور ہرے بھرے کھیت تھے۔ یہاں زبردست ہار بر اور بندرگاہیں تھیں۔ ایرانی دنیا، وسطی ایشیاء، توران، ملتان اور سندھ کے ساتھ تجارت عروج پر ہوا کرتی تھی۔

اس زمانے میں سمندر پار تجارت کا جال Tigris اور Euphrates کے دہانوں سے لے کر، عدن اور افریقہ کے مشرقی ساحلوں، اور جنوب مشرقی ایشیاء اور چین تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بین البراعظمی تجارت کے نیٹ ورک میں بلوچستان کے ساحلی شہر اپنی یکتا اور نمایاں خصوصیت برقرار رکھے ہوئے تھے۔ متحرک زندگانی کی ہلچل تھی۔ کاسموپولیٹن اور مرکنٹائل زندگی...... جہاں مختلف تہذیبوں، نسلوں اور مذہبوں کے لوگ باہم مل جل کر رہتے بھی تھے، تجارت بھی کرتے تھے اور آباد و آزاد بھی تھے۔ (بلوچوں میں وسعت قلبی کی خصوصیت کس قدر پرانی ہے!)

یہ حقیقت ہے کہ بلوچ ساحل کی یہ بین الاقوامی حیثیت اس کی جغرافیائی پوزیشن کی وجہ سے بھی تھی کہ یہ شمال جنوب شاہراہ (جنوب میں افریقہ، شمال میں وسطی ایشیاء اور'' دھند میں لپٹے ممالک'') اور مشرق مغرب شاہراہ (مشرق میں چین اور جنوب مشرقی ایشیاء اور مغرب میں ایرانی دنیا اور بحیرۂ روم کی بندرگاہوں) کے چوک اور چوراہے پہ واقع تھا۔مگر اس کی جغرافیائی اہمیت کے ساتھ ساتھ اس کی اس حیثیت کو کم اہم نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہاں زبردست تجارتی مراکز تھے۔آبادی اور آبادکاری کی سرگرمیاں تھیں اور ترقی و ترقیاتی گہما گہمی تھی۔(9)

حوالہ جات

1۔یحییٰ امجد''وسطی عہد''صفحہ 429

2۔بروہی،عبدالرحمٰن ڈاکٹر۔بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور اُن کی حکومتیں۔1990۔زمرد پبلی کیشنز۔مستنگ۔صفحہ 27

3۔چچ نامہ۔صفحہ 108

4۔قلیچ بیگ''چچ نامہ''صفحہ 68۔

5۔یحییٰ امجد''وسطی عہد''صفحہ 435۔

6۔سبطِ حسن۔پاکستان میں تہذیب کا ارتقا۔صفحہ 152

7۔The Rise of Fudalism in Sindh کے نام ڈاکٹر فیروز احمد کا آکسفورڈ یونیورسٹی میں پڑھا گیا مقالہ۔

8۔ جی بی سٹریج / محمد جمیل الرحمٰن'' جغرافیہ خلافت مشرق'' 1987،سنگ میل پبلیکیشنز لاہور،صفحہ 294۔

9۔۔ویلوریا۔ایف پی۔
From Middle Ages to the 16th Centruey A.D Between Space and Time,1996 Italin Scientific Publishers,Naples,Page 634.

10۔غزنوی اور بلوچ

سلجوقیوں کے بعد دسویں صدی کے آخر میں ہم پر نصیرالدین سبکتگین غزنوی اور اس کے بیٹے محمود غزنوی نے حملہ کردیا۔بلوچ غزنوی حکمرانوں سے لگاتار مدبھیڑوں میں تھے۔بلوچ اور غزنوی کے تعلقات کبھی بھی پرامن نہ رہے۔توران مکران سال 77-976 میں غزنوی سبکتگین کی محدود حکمرانی میں آئے۔جب اُس نے 994 میں خضدار پر حملہ کیا تو بلوچ افواج اُس کے خلاف لڑیں۔غزنوی دسویں صدی کے اواخر تک ایران کے وسیع علاقے پر حکمران رہے۔

محمد اسماعیل ڈشتی نے اپنی کتاب''بلوچ۔تاریخ اور تہذیب'' میں ایک جگہ لکھا ہے کہ جب محمود غزنوی نے بلوچوں پر فوج کشی کی تو لشکر کی روانگی سے قبل وہ کمانڈر سے تنہائی میں ملا۔اور بلوچوں کے خلاف جنگ میں فتح کے حصول کے لئے حکمت عملی اور چال کی وضاحت کی۔اس نے اپنے کمانڈر سے کہا کہ''کرمان اور بلوچستان کے راستے میں ایک پہاڑی گھاٹی ہے۔اس گھاٹی کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر بلوچوں کا قبضہ ہے۔اس وجہ سے ہماری شکست یقینی ہے۔لہٰذا مکروفریب لازمی ہے''۔یہ کہہ کر اس نے زہر سے بھری ہوئی شیشی نکالی اور کہا''جب تم اصفہان شہر پہنچو تو اچھی اقسام کے سیب اتنی مقدار میں خریدو کہ جسے دس اونٹ اٹھا سکیں۔اور ان سیبوں کو زہرآلود کرنے کے بعد دس اونٹوں پر لادو اور بلوچستان کی طرف جانے والے تجارتی قافلوں اور ان کے سامان کے ساتھ شامل کردو''۔اسمٰعیل ڈشتی کے بقول،کمانڈر نے یہی کیا اور اس پہاڑی گھاٹی پر اپنے پہنچنے سے پہلے ان دس اونٹوں کو تھوڑی سی فوج کے ساتھ اس علاقے میں بھیج دیا۔بلوچوں نے اس فوج کو پکڑ لیا اور تمام زہرآلود سیب کھالیے۔دوسرے دن محمود غزنوی کی فوج بلوچوں کی لاشوں سے گزرتے ہوئے،بغیر کسی مزاحمت کے بلوچستان پر قابض ہوگئی۔(1)۔

غزنوی نے 977 میں ہندوستان پر حملے سے قبل جھالاوان کا علاقہ فتح کرلیا۔بہت بڑی دولت وصول کرلی اور سالانہ خراج کی رقم بھی مقرر کرکے اس نے وہاں کے مقامی حاکم کو ہی وہاں کا حکمران بنادیا۔اور خود چلا گیا۔مگر جب محمود غزنوی کو کچھ وقت تک یہ خراج ملنا بند ہوگیا تو اس نے فوراً

حملہ کردیا۔ وہ پانچ لاکھ درہم تاوان لے گیا،خراج کا سارا حساب بے باک کیا اور پندرہ ہاتھی بطور''پیشکش'' وصول فرمائے۔(2)

واضح رہے کہ وسط ایشیائی فیوڈل بادشاہوں میں محمود پہلا شخص ہے جس نے سلطان کا لقب اختیار کیا۔ 999 کے آخر میں خلیفہ نے اس کوخلعت عطا کر کے''امین الملت'' اور''یمین الدولہ''(سلطنت کا دایاں ہاتھ) کے خطابات عطا کیے۔

مکران کا حاکم بھی اس امین اور یمین،غزنوی کو مالیہ دیتا تھا۔سبی بھی گیارہویں صدی کے اوائل میں اس محمود غزنوی کے ماتحت آ گیا جس نے ملتان کا سارا علاقہ 1004 میں فتح کرلیا۔

مگراس''سلطان'' محمود نے ابھی تک تو محض ہندوستان کے دامن ہی کو چھوا تھا، جہاں مال غنیمت اتنا زیادہ نہ تھا۔ دولت تو آگے تھی جہاں ایسے ایسے مندر تھے جن پر عقیدت مند ہندوؤں کی پشت ہا پشت کی دولت چڑھائی ہوئی تھی۔سومناتھ کا مندران سب سے ممتاز تھا۔ ہندوستان کے راجاؤں نے سومناتھ کے مندر کے لئے دس ہزار گاؤں وقف کرر کھے تھے۔ وہاں ایک ہزار برہمن دن رات پوجا پاٹ میں لگے رہتے۔ مندر میں دوسومن وزنی سونے کی زنجیر لٹکتی تھی جس میں گھنٹیاں آویزاں تھیں۔500 خوش الحان گلوکار طوائفیں اور دوسو گویے ہر وقت موجود تھے۔تین سوحجام یاتریوں کی داڑھیاں اور سرمونڈنے کے لئے مقرر تھے۔کئی راجاؤں نے اپنی بیٹیاں سومناتھ پر چڑھادی تھیں جو رہتی بھی وہیں تھی۔مندر کی عمارت بہت کشادہ تھی اوراس کی چھت 56 مرصع ستونوں پر قائم تھی۔ سومناتھ کا بت پتھر کا تھا۔اسکی لمبائی پانچ گز تھی۔جس میں سے دوگز زمین میں اور تین گز باہر تھا۔ جس حجرے میں یہ بت تھا اس میں روشنی کا گزر ہرگز نہ تھا۔قندیلوں میں جواہر والماس جڑے ہوئے تھے اور انکی جگمگاہٹ سے وہاں روشنی ہوئی تھی۔

''امین،یمین اور سلطان'' محمود نے برصغیر پر 17 حملے کئے۔(ابدالی نے 9 بارحملہ کیا تھا)۔اس ترک حکمران نے کرنگر کوٹ کے مندر کو لوٹا جہاں چاندی سونے اور جواہرات کے انبار پڑے تھے۔

غزنی واپس پہنچ کرمحمود نے ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا،اور ہندوستان سے لوٹی ہوئی

دولت کی نمائش کی۔سرداروں اورامرا کو قیمتی تحفے دیے۔

چنانچہ ہر سال موسم سرما میں ہندوستان پر حملہ کرنا اُس کی عادت ہوگئی۔وہ اپنے خزانے بھرتا،فوج کو شہر میں قتل وغارت گری سے شادان کرتا اور موسم بہار میں پہلے سے زیادہ دولت لوٹ کر واپس چلا جاتا۔قیمتی مال بٹنے کی وجہ سے اس کی فوج میں ہر سال اضافہ ہوجاتا تھا جس میں ایرانی، ترک اور افغانی باشندے ہوتے تھے۔

اور بالآخر 1024ء میں اس نے سومناتھ کے مہاپوتر مندر پر حملہ کردیا جو اپنی بے شمار دولت کے سبب پورے ہندوستان میں مشہور تھا۔ول ڈیورانٹ کے بقول اس نے''شہر سومناتھ میں پچاس ہزار مکینوں کو قتل کرڈالا اوراس کی ساری دولت لوٹ لی''۔اس نے مندر کو بھی توڑ پھوڑ دیا اور اُس کے صندل کی لکڑی کے عظیم دروازے کو بھی غزنی لے گیا (3)۔اس''بت شکن'' نے بت کا کچھ حصہ تو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور باقی کو بمعہ زروجواہرات کے غزنی بھجوادیا۔ پیسہ ہی بت بنواتا ہے اور پیسہ ہی بت تڑواتا ہے!!۔

چنانچہ ہمارے پورے منطقے کی صدیوں کی جمع کردہ دولت غزنی گئی مگر وہاں پتہ نہیں کس کام آئی۔نہ بدبخت سلطان نے وہاں سڑکیں بنائیں،نہ تالاب اور،مدرسے بنوائے اور نہ ہی کوئی اور قابل ذکر عوامی فلاح کا کام کیا۔ پتہ نہیں وہ سارے ہیرے جواہرات اس نے کہاں دفن کردیے۔''سومناتھ کے مندر کے بت کا کچھ حصہ تو غزنی کے گھڑ دوڑ کے میدان میں پڑا تھا۔اور اس کا ایک حصہ غزنی کی جامع مسجد کے دروازے کے آگے ڈال دیا گیا ہے جس پر نمازی اپنے پاؤں رگڑ کر صاف کرتے ہیں''۔(4)

ہیروں اور جواہرات کے جو خزانے اُس نے اکٹھے کیے، وہ مرتے دم تک اُن کی طرف دیکھتا رہا۔مورخ فرشتہ لکھتا ہے:

''محمود غزنوی نے اپنی موت سے دوروز پہلے جواہرات اوراشرفیاں شاہی خزانے سے نکلوا کر اپنے محل میں ڈھیر کرادیں۔رنگا رنگ قیمتی ہیروں سے باغ جنت کی طرح معلوم ہورہا تھا۔وہ ان پر حسرت کی نظریں ڈال کر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا............اور اس خزانے سے کسی کو پھوٹی

کوڑی بھی نہ دی۔ پھر اس نے شاہی اصطبل سے گھوڑے، اونٹ اور ہاتھی نکلوائے۔ اُن کو دیکھ کر بھی وہ دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔

لالچ اور طمع کا یہ مرید تاریخ میں گم ہو جاتا مگر اس کی لالچ اور حرص نے اسے دنیا کی تاریخ کے صفحات میں زندہ رکھا۔ ہوا یوں کہ اس نے بہت بڑے شاعر فردوسی سے اپنی تعریف میں شاہنامہ لکھنے کی فرمائش کی اور صلے میں فی شعر ایک اشرفی دینے کا وعدہ کیا۔ تیس برس کی محنت کے بعد فردوسی ساٹھ ہزار شعر لکھ کر لایا۔ محمودِ حریص ایک کتاب کے لئے ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیاں دینے میں ہچکچایا اور سونے کی بجائے چاندی کے ساٹھ ہزار دینار دینے لگا۔ فردوسی نے دیناروں کا لینا منظور نہ کیا اور مایوس ہو کر فارس میں اپنے وطن کو چلا گیا۔ کچھ دنوں بعد محمود اپنی غلطی پہ پشیمان ہوا اور ساٹھ ہزار سونے کی اشرفیوں سے لدے اونٹوں کی قطار فردوسی کے پاس بھیج دی۔ مگر اب کیا ہوتا۔ اِدھر محمود کے لوگ اشرفیوں کی تھیلیاں لیے شہر میں داخل ہو رہے تھے اور وہاں فردوسی کا جنازہ قبرستان کی طرف چلا جا رہا تھا۔

چنانچہ محمود کو تو چار آدمیوں نے زندہ رکھا۔ ایک شاعر فردوسی نے، اور دوسرا اس کے دربار کے فلاسفر اور مورخ البیرونی نے، تیسرا جرم علامہ اقبال کے ہاتھوں سرزد ہوا۔ اقبال نے اپنے ایک شعر کے ذریعے محمود غزنوی کے ایاز نامی لڑکے سے عشق کو بھی شہرتِ دوام دے دی (نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی، نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں)۔ پھر غلام اور سلطان (ایاز، اور محمود) کو ایک ہی صف میں کھڑا کر کے بدترین غلامی کو شاعری میں بند کرنے کی کامیاب کاروائی بھی اُسی نے کی۔ لوگ صدیوں تک اُس کے ''نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز'' والے واہمے کا شکار رہیں گے.......... اگر پیداواری قوتیں اجازت دیں تو!!

محمود کا نام ایک اور بڑے انسان کو ذلیل و خوار کرنے کے باعث زندہ رہے گا۔ یہ وہ شخص تھا جو انسان کے دلیل کی طاقت پر ایمان رکھتا تھا۔ اس کی کتابوں کے دو تہائی سے زیادہ حصے مافوق الطبعیات، اخلاقیات اور منطق پر ہیں۔ اس کی اہم ترین کتاب Cannon of Medicine ہے جو فزیشن کے فریضے سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے انفرادی مریض کو سمجھنا، پھر

مریض کی تکالیف اور بیماری کی وجوہات کا تجزیہ کرنا اور اس کے بعد علاج شروع کرنا۔ اس نے پودوں اور ان سے کشید کردہ مواد کو علاج کے بطور تجویز کیا۔ اس نے تجارتی جال کا نقشہ بھی کھینچا کہ کس طرح یہ ادویات مشرق وسطی، فارس اور وسطی ایشیا میں آتی ہیں۔

یہ بڑا آدمی ابن سینا تھا جس نے گیلن اور ارسطو کے فارمولوں میں ایشیائی دنیا کے اندر موجود طبعی علم شامل کر دیا۔ ایسا فلاسفر (حکیم) بھلا توسیع پسند، جہالت پھیلانے والی بادشاہت کو کہاں گوارا ہوتا ہے۔ چنانچہ ابن سینا محمود غزنوی کی تیزی سے پھیلتی سلطنت سے فرار ہوا۔ محمود نے ابن سینا کو پناہ دینے والے بادشاہوں کو خط لکھے کہ وہ اُس فلاسفر کو اپنے دربار کا زیور بنانا چاہتا ہے، حالانکہ ابن سینا کو تو پتہ تھا کہ وہ رجعتی شخص اُسے اپنی سلطنت کا زیور تو کیا بنائے گا' اُس سلطنت کی جیل کا زیور بنائے گا۔ ابن سینا اور اس کا وفادار شاگرد جوزجانی محمود کی سلطنت کے کناروں پر ایک دارالحکومت سے دوسرے دارالحکومت میں بھٹکتے رہے۔ وہ لکھتا ہے:

''میں اتنا بڑا ہو گیا ہوں کہ کوئی شہر مجھے جگہ نہیں دے سکتا۔ مگر میری قیمت اتنی بڑھی کہ ہر خریدار نے مجھے بیچ ڈالا۔(5)

محمود نے سومناتھ کے بعد بلوچستان کے گنداواہ کو فتح کیا تھا۔ ہماری پیداواری قوتوں کی ساری بڑھوتری ایک بار پھر خاک میں مل گئی اور ہمارے طبقاتی نظام کی شکل ایک بار پھر اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف دھکیل دی گئی۔

****

آخری غزنوی بادشاہ خسرو ملک کو 87-1186 میں محمود غوری نے شکست دی اور غزنوی لٹیری سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ پھر ہم پر یہی غوری مسلط ہو گیا حتیٰ کہ 21 ویں صدی میں بھی میزائل اسی کے نام سے بنائے گئے۔ ہر لٹیرا ہمارا ہیرو بن جاتا ہے۔ ہر غزنوی، غوری، بابر عالمگیر اور سنڈیمن ہمارے شعروں اور یادگاروں کی ابدی بدنمائی پاتا رہا ہے۔ بدقسمتی اور کیا ہوتی ہے۔

غزنوی حکومت ختم کرنے کے بعد غوری والا محمود پہلے پہل تو غزنی پر قابض ہوا اور اس کے بعد دولت و شہرت کی پیاس اُسے برصغیر گھسیٹ لائی۔ اس نے ملتان، اُچ اور پشاور فتح

کر لئے۔غوری شہزادے غیاث الدین کے دور(1157-1207) میں مکران میں ہوت قبیلے کا تاج الدین حکمران تھا۔ جہلاوان بھی اسی کی کھیتی بنا۔غوریوں کے بعد نصیر الدین قباچہ قابض ہوگیا۔جس کے بعد بلوچستان ان علاقوں میں سے ایک بنا جو شمس الدین التمش کے مقبوضہ جات تھے۔ یہ بات 1225 کی ہے۔

غزنوی سلطنت کے مٹنے کے بعد سومرہ قوم کے سردار بن سو مار نے سندھ میں ایک خودمختار سلطنت قائم کی۔ بلوچستان میں کچھی کا علاقہ اس میں شامل ہوگیا۔سومرولوگوں نے تقریباً 300 برس تک سندھ پر حکومت کی۔وہ برائے نام دہلی کے سلاطین کے ماتحت تھے۔اندرونی طور پر وہ خودمختار تھے۔

حوالہ جات

1۔دشتی محمد اسماعیل/صادق بلوچ۔بلوچ۔تاریخ اور تہذیب۔1999۔فضلی سنز لمیٹڈ۔صفحہ 138

2۔جھالاوان گزیٹیئر،صفحہ 35۔

3- میکمن، جارج/انور رومان شمال مغربی پاکستان اور برطانوی سامراج 1979۔گوشہ ادب کوئٹہ۔صفحہ 67۔

4۔ پروفیسر محمد حبیب / سید جمیل حسین'' سلطان محمد غزنوی'' 1998 تخلیقات ٹمپل روڈ لاہور،صفحہ 43۔

5- سٹیورٹ، گورڈن ۔2008۔When Asia was the world۔Da Capo Press۔صفحہ 49۔53

11۔متفرق حملہ آور اور بلوچ

مشہور سیاح اور مؤرخ مارکو پولو تیرہویں صدی کے اواخر میں چین سے گزر کر بلوچستان پہنچا تھا۔اس نے لکھا'' بلوچستان ایک آزاد خطہ ہے اور یہاں کے باشندے تجارت سے وابستہ ہیں............ان کی معیشت کا زیادہ تر انحصار اشیا کی درآمد و برآمد پر ہے''۔

1223 میں چنگیز کے بیٹوں میں سے چغتائی خان مکران تک گھستا چلا آیا۔چنگیزوں کی گزر گاہ کی نشانیوں میں اب بھی نچارا، اور پندران کے درمیان ''چنگیز خان کی چٹان'' موجود ہے۔سلویا، اے میتھی سن کا دعویٰ ہے کہ بلوچوں نے مشہور ڈش ''سجی''، انہی چنگیز خان کے منگولوں سے سیکھی۔(1)

کچھ عرصہ بعد جنوبی بلوچستان دہلی کے سلطان التمش کے قبضہ میں آیا مگر یہ جلد پھر منگولوں کا ہوا۔

ادھر 1250 میں سبی کے علاقے نے خود کو ملتان کے لنگاہ قبیلے کے سربراہ رائے سہرا کے پاس دیکھا۔ جب سومرہ پر سمہ خاندان نے فتح پائی تو ان کے کسی فکری باڈی گارڈ نے انہیں عطا کر دیا جام کا لقب۔سمہ اور سومرہ دونوں حکومتیں جھالاوان پر بھی حکمران تھیں۔

چودھویں صدی کے اواخر میں 63 برس کا بڈھا امیر تیمور عراق، ایران، آذربائیجان اور آرمینیا کو فتح کرتا ہوا سمرقند میں گھس گیا۔اُسے تاراج کرنے کے بعد اسے ہندوستان کی دولت کی مقناطیس نے اپنی طرف کھینچا۔ایک کونے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنے کی بجائے اُسے قبضے کی سوجھی۔ چنانچہ دریائے اٹک کو پار کر کے وہ ستلج جا پہنچا۔ ہندوستان مار کر وہ مغرب میں روس، اور مشرق میں چین پر حملہ آور ہوا۔1393 میں اس نے بغداد قبضہ کرلیا(2)۔تیمور 1336 میں سمرقند کے جنوب میں برلاس ترکوں میں، پیدا ہوا تھا۔

تیمور کا پوتا پیر محمد 1398 میں قندہار کی جانب سے کوہِ سلیمان پہ حملہ آور ہوا۔وہ سیستان و بلوچستان کی حکمرانی کرتا ہوا مری پہاڑوں سے ہوکر ملتان پر ٹوٹ پڑا۔سلطان محمود ثانی دلی کی بادشاہی چھوڑ کر بھاگ کر کسی مسجد کا ملاّ بن گیا ہوگا اور ترکوں نے مکمل ایمانداری اور یک سوئی سے

دل کھول کر دہلی کو لوٹ لیا۔

ادھر تیمور لنگ (اسے بلوچستان نے ہی لنگڑا کر دیا تھا) کے بیٹے میران شاہ نے ایک فوجی مہم خاران اور خضدار کے راستے مکران تک بھیج دی اور وسطی اور مغربی بلوچستان فتح کر ڈالے۔ (ہائے رے شمال! تم نے کیا کیا وحشی پیدا کئے!)

ہم نے دیکھا کہ ان صدیوں میں بلوچستان کے ساحل ایک سے زیادہ خارجی حکمرانوں کے تحت رہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے خارجی حکمران تھے اور چونکہ وسطی ایشیاء سے متواتر فتوحات والی بڑی بڑی لہریں چل رہی تھیں اس لئے یہ چھوٹے حکمران مختلف فاتحوں کو خراج دینے پر مجبور تھے۔ یہ فاتح تھے: سلجوق، غزنوی، غوری اور منگول۔ ظاہر ہے کہ براعظم میں بڑھتی ہوئی اس بدنظمی اور عدم تحفظ کی وجہ سے تجارت بھی محفوظ سرزمینوں کی طرف منتقل ہوئی۔

واسکوڈی گاما کے راہنما اور مصنف احمد بن ماجد نے اس علاقے کی خوبصورت بندرگاہوں کو بیان کرنے کے لئے کئی صفحے مخصوص کئے۔

بحرین: ماہی گیری کے لئے مشہور۔ سُحر: کے اردگرد کئی گاؤں اور سرسبز درخت ہیں، مسقط: دنیا کی مشہور ترین بندرگاہ جس کا ثانی پورے جہاں میں نہیں ہے اور ''جہاں تجارت کی اتنی اچھی اشیاء ملیں گی جو اور کہیں نہیں ملتیں۔'' جہاں سندھ، مکران، ہند، ہرمز اور مغرب سے آنے والا تجارتی سامان خریدا اور بیچا جاتا ہے''۔

یہیں، اسی سرگرم سمندری ٹریفک اور زندگانی کے درمیان بلوچستان کا مکران تھا۔ جہاں'' ہندی لوگ پارس والے لوگوں کے ساتھ اکٹھے رہتے تھے''۔ اور جہاں کے ساحلوں پر عرب لوگ مشرق و مغرب سے اپنے بحری جہازوں سمیت آتے جاتے تھے۔

تیموری شہزادوں نے ایک صدی تک وسط ایشیاء اور خراسان پر حکومت کی۔ اس کے بعد شمالی ایشیا میں ازبکوں کا اٹھنے والا طوفان تیموری حکومتوں کا صفایا کر گیا۔ سلطان حسین مرزا اس تیموری خاندان کا آخری نشان تھا جس کی ہرات اور قندھار پر حکومت تھی۔ امیر ذوالنون اسی شہزادہ کی طرف سے قندھار کا حاکم تھا۔ جس نے رند اور لاشار کی جنگ میں رندوں کی طرفداری کی تھی۔

حوالہ جات

1۔ سلویا، اے میتھے سن، ٹائیگرز آف بلوچستان، 1975۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، صفحہ 139۔

2۔ رشید، احمد، The resurgence of Central Asia Islam or Nationalism
ریڈ بکس لندن۔ 1994۔ صفحہ 14۔

باب ہفت

رندو لاشار کا دور

1۔تعارف

ہم بلوچ بہت عرصے تک ایک ہزار برس قبل کے فارسی کے نامور شاعر ابوالقاسم فردوسی کے اِن اشعار کو بلوچوں کا مخزن و منبع وابتدا سمجھتے تھے:

سپا ہے زگردانِ کوچ و بلوچ
سگا لیدہ جنگند مانندِ غوچ
کسے درجہاں پُشت ایشاں نہ دید
ز آہن یک انگشت نامہ پدید
سپید ارِشاں اشکش تیز ہُش
کہ بارائے دل بودو بامغز ہُش
درفشش بیاوردہ پیکر پلنگ
ہمی از درفشش بیا ر ندجنگ

............اور آفاقیت ہماری اِس نزدیک بینی پہ قہقہے لگا کر ہنستی رہی۔ آج تک ہم بلوچ اس بحث میں پڑے رہے کہ ہماری زبان کی ساخت و پرداخت کیا ہے؟۔ پہلوی، دراوڑ............وغیرہ۔ ہم حلب سے حب چوکی آئے ہیں یا کیسپین سے کاہان؟۔

یہ بلاشبہ سائنسی اور جائز بحث تھی اور ہے۔مگر، چونکہ ہماری دسترس میں صرف پانچ سو

برس قبل کا بلوچی ادب رہا ہے اس لئے ہم چاکر رند کے عہد ہی کو اپنی اس لسانی بحث کا نقطہ آغاز گردانتے چلے آرہے ہیں۔ اُدھر مہرگڑھ تہذیب کھڑی ہماری بے علمی کو کوس رہی تھی۔ جی ہاں۔ ہم پانچ سو سال کے بجائے گیارہ ہزار سال پرانے لوگ ہیں۔ دوسری حقیقت یہ ہے کہ گو کہ انسانوں میں آنا جانا لگا رہتا ہے مگر پورا بلوچ کسی ریڑھی پر لاد کر یہاں پٹخ نہیں دیا گیا۔ بلکہ وہ یہیں کا باشندہ، باسی اور مالک ہے۔ بڑے پیمانے کی ہجرت، مہاجرت اور مہاجر تھیوری غلط ہے۔

دلچسپ یہ ہے کہ بلوچوں پر کی گئی شاعری تو قدیم زمانے سے ملتی ہے' مگر خود بلوچوں کی اپنی شاعری تاریخ کی دھند میں گم ہو چکی ہے۔ ہمیں بس رِند و لاشار عہد کی بلوچی شاعری دستیاب ہے۔ کیا زبردست شاعری ہے وہ۔ بالغ لٹریچر کا چھلکتا جام ہے یہ۔ اس قدر امیر، اس قدر متنوع، اس قدر پرمعنی، رنگین اور متغزل' کہ جی خوش ہو جائے۔ یہ بات بہت ہی غور طلب ہے کہ چاکر کے عہد میں بلوچی زبان کوئی ''گوخوئی'' (بچوں کا گھٹنوں کے بل چلنا) کے عہد میں نہ تھی بلکہ یہ تو ایک بالغ زبان تھی اور دنیا کی دیگر بڑی زبانوں کے ہم پلہ ادبی، ثقافتی اور سائنسی اظہار مکمل طور پر کر رہی تھی۔ اور یہ تو معلوم بات ہے کہ زبان بنی بنائی شکل میں انسان کو نہیں ملی بلکہ وہ تو صدیوں کی تجرباتی کوششوں سے پیدا ہونے والی نطقی روایت کے نسل در نسل منتقل اور متغیر ہوتے رہنے کا نتیجہ ہے۔ اس کے تغیر و تبدل اور تراش خراش کے دامن میں صوتی آنکھ مچولی ہی نہیں بلکہ تہذیبی سفر، نفسیاتی کرشمہ، اور سیاسی و سماجی نیرنگیوں کی داستان بھی موجود ہیں۔

چنانچہ، ہماری زبان بھی چاکر کے عہد ہی میں آسمان سے نہیں اتری بلکہ دنیا کی ساری زبانوں کی طرح اپنے سے پہلی زبانوں کے الفاظ اور فریم میں پیداواری عمل کے دوران ہزاروں برس تک بڑھتی پھلتی پھولتی رہی۔ یعنی خود چاکر کے عہد کی بلوچی ہزاروں برس پرانی ہے۔

آیئے بلوچوں کے اپنے اندر سینہ بہ سینہ چلنے والی چاکر کی کہانی سنتے ہیں، اس کی سائنسی توضیح اور تاریخی تصدیق پہ پھر کہیں بحث کریں گے:

حمزہ جو حضورؐ کا چچا تھا:

ان کا بیٹا تھا حسد، حسد کا بیٹا تھا مزر، ان کا بیٹا تھا سید، ان کا بیٹا تھا عبداللہ، عبداللہ کا بیٹا تھا

گیلو، گیلو کا بیٹا تھا ہارون، اس کا بیٹا تھا حُرّ، حُر کا بیٹا تھا حبیب، اس کا محمد، محمد کا بیٹا تھا جلالہان، اُس کا بیٹا تھا محمد جس کا بیٹا تھا شہداد جس کا بیٹا تھا شیہک جس کا بیٹا تھا سحاق، جس کا بیٹا تھا میران، اُس کا بیٹا تھا تنگو، جس کا بیٹا تھا شیھک جس کا بیٹا تھا احمد جس کا بیٹا تھا چاکر۔۔۔۔ (یہ سارے نام اور شجرۂ نسب بزرگ سن جناب وزیر خان عیسفانڑیں کو جس طرح رٹّہ کی طرح یاد تھے، میں نے اُسی طرح ٹیپ کر لیے تھے۔ بس لطف لیجیے، کہیں حوالہ نہ دیجیے کہ اس شجرے کا کوئی سائنسی ثبوت موجود نہیں ہے)۔

اسی طرح سردار خان گشکوری، رند قبیلے کا شجرہ یوں بیان کرتا ہے: ''چاکر ابن شھیک ابن امیر اسحاق امیر کالو ابن امیر منان ابن میر بیزن ابن میر بلوچ خان ابن امیر رند ابن امیر جلال خان ۔جلال خان کا عہد 1100-1185 کا بتاتے ہوئے وہ اس کی جائے وفات ایرانی بلوچستان، بمپور میں بتاتا ہے۔

میر جلالہان کا وجود تاریخ کی کسی کتاب میں تو نہیں لیکن اس کی موجودگی بلوچی زبان کی بہت مضبوط اور پکی اورل پوئٹری کی بنیاد پر یقینی ہے جس طرح دنیا کی دیگر قوموں کی تاریخ کا بڑا حصہ اورل پوئٹری کی بنیاد پر استوار ہے۔ امیر شھیک نے اپنی ایک بیٹی باہر خان پڑ رند کے عقد میں دے دی جو کہ میر عالی کا چھوٹا بھائی تھا۔ (میر عالی نلی کی جنگ میں کام آیا تھا جس کے تین بیٹے حسن مولانغ، محمد اور ہارین تھے)۔ شیہک کی اسی زوجہ کے بطن سے بیورغ پیدا ہوا۔ شیہک نے اپنے بیٹے چاکر کی شادی گل محمد رند کی بیٹی شہناز سے کر دی جس سے چاکر کے تین بیٹے ہوئے (شھزاذ، اللہ داد، اور شیہک)۔ (1)

ہمسایہ سرزمین سندھ کی زرخیزی اور سمہ حکمران کے دربار کی شان و شوکت کے بارے میں عجیب و غریب کہانیاں، ہندوستان کی دولت و ثروت کے افسانوی بیانات، اور مکران کی ویرانیت و خشک سالی وہ عوامل تھے جو مہم جوئی و حصولِ دولت و تلاش معاش کیلئے نئے مواقع ڈھونڈنے کی خاطر کچھ بلوچ طائفوں کے مکران چھوڑنے کا محرک بنے۔

یہ طائفے کلانچ سے کیچ پہنچے اور 1485ء کو انہوں نے مکران کو الوداع کہا

۔ڈیمز نے اس ہجرت کی ہمعصر شعری داستانوں میں سے ایک کو جمع کر لیا۔"ان جیالوں نے اپنی محبوب بیویوں سے کہا: اپنے ایوانوں سے نیچے اتر آؤ، اپنے غالیچوں اور خوبصورت تکیوں کو لپیٹ لو۔اپنے پیالوں اور مکرانی قدحوں کو لے آؤ۔۔۔فیاض رندوں نے اپنی قبائیں اور پگڑیاں پہن لیں۔لمبی لمبی سرخ جوتیاں پیروں میں ڈالیں۔خود، ڈھال، تیر کمان، خنجر اور جملہ ہتھیاروں سے خود کو مزین کیا۔تب 40 ہزار شہسواروں نے میر کی آواز پر لبیک کہہ کر گھوڑوں کو ایڑ لگا دی"۔

1530 میں قلات پر ارغون خاندان حکمران تھا اور قندھار اُن کا پایہ تخت تھا۔1530 میں ارغون حکمران ذالنون بیگ کو مرزا کامران نے شکست دے دی............بلوچوں کے سردار عمر خان میرواڑی نے تخت قلات پر قبضہ کرنے کے بعد مضافات پر توجہ دی۔واضح رہے کہ یہ اولین بار ہے کہ تاریخ میں ایک باقاعدہ بلوچ ریاست کا قیام عمل میں آنے کا ذکر کیا۔

میر عمر خان شبانہ روز کاوشوں سے حکومت کو مضبوط بنانے میں مصروف تھا کہ اچانک مکران و کرمان سے بلوچ سردار شیہک رند اور گوہرام لاشاری ایک لشکر کے ساتھ نمودار ہوئے اور اپنے ہی بھائیوں پر ٹوٹ پڑے۔سردار عمر خان مارا گیا اور اس کی ماں، اپنے بیٹے بجار کو مستنگ اپنے میکے لے گئی اور وہیں پالا۔(2)

رند اور لاشار سردار تخت قلات پر میر مندو خان رند کو بٹھا کر کچھی کی جانب بڑھے۔پھر وہی بجار میرواڑی جوان ہوا تو باپ کا بدلہ لینے اور تخت قلات پر قبضہ کرنے لشکر لے کر قلات پر حملہ آور ہوا۔جنگ کے بعد میر مندو (Mandav) مارا گیا۔مندو کی قبر قلات کے مستنگی گیٹ کے قریب واقع ہے۔بجار نے دشت گوران، نال، ہزار گنجی اور ناج اور وڈھ کو دوبارہ فتح کر لیا۔(3)

آخری عمر میں بجار خان گوشہ نشیں ہوا۔تخت درباری انتظامیہ کے حوالے کر کے آبائی مسکن "نغاڑ سوراب" میں جا بیٹھا اور وہیں فوت ہوا۔

اس گوشہ نشینی سے قلات کمزور ہوا اور مرزا کامران مغل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر حملہ کر کے قلات پر بلا مزاحمت قبضہ کر لیا۔ایک دلچسپ روایت بھی سنتے جائیے۔مرزا کامران نے قلات کے مقتدرہ لوگوں سے حلف لیا کہ" طرفین کسی آہنی ہتھیار، لکڑی یا پتھر وغیرہ سے ایک

دوسرے کو مالی جانی نقصان نہیں پہنچائیں گے"۔

مغلوں نے ہر بیرونی قبضہ گیر کی طرح لوگوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔لوگوں نے بغاوت کرنا چاہی۔مگر وہ حلف؟۔اُس کا کیا کرتے؟۔تب بہت سوچ بچار کے بعد ایک تدبیر کر لی گئی۔ابراہیم میرواڑی کی قیادت میں دوسو جوان ملاقات کے بہانے قلعہ میں داخل ہو گئے۔ان کے پاس "پیرزنی" روٹیاں تھیں جن میں ریت بھر بھر کر کئی دنوں تک دھوپ میں سکھا کر سخت کیا گیا تھا۔ان روٹیوں سے یہ بلوچ، مغل حکمران اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔باہر سے بھی کمک پہنچی۔اس طرح مغل حکمران کو ہلاک کر کے میرواڑی تخت پر قابض ہو گئے۔

ابراہیم نے اپنے نواسے میر حسن خان کو تخت پر بٹھایا۔وہ خانِ بلوچ کے لقب سے تخت قلات پر بیٹھا۔مگر مختصر سی مدت میں لاولد فوت ہو گیا۔تب سرداروں اور معززین نے اپنے قدیم سالا رِقافلہ میر قمبر خان کے خانوادے کو یہ منصب دینے کا فیصلہ کیا۔چنانچہ میر حسن خان کے جانشین کے طور پر قبیلہ قمبرانڑیں کے چشم و چراغ میر احمد خان کو خان بنایا۔اس طرح حکومت میرواڑیں خانوادہ سے قمبرانڑیں خانوادہ میں منتقل ہو گئی اور احمد زئی خاندان برسرِ اقتدار آ گیا۔(4)

یہ پندرہویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا جب رند درہ بولان سے نکل کر ڈھاڈر اور سیوی پر قابض ہو گئے۔اور ان کا دوسرا فرقہ لاشاری درۂ مولا کے راستے گنج آبہ (گنداواہ) اور گاجان پہ قابض ہوا۔سبی اور قلات کندہار کے جزو تھے، باقی کچھی اور گنداوہ پر سندھ کے سمہ حکمرانوں کا راج تھا۔سیوی اور کچھی کا علاقہ نہایت ہی زرخیز اور شاداب تھا۔اس خطے میں کپاس کاشت ہوتی تھی۔گنداواہ تو زرخیزی ہی کی وجہ سے گنج آبہ کہلاتا تھا۔کچھی اور سیوی کا علاقہ گھوڑوں کی ایک زبردست نسل کے لیے بھی مشہور تھا۔

چاکر کے چچازاد بھائی میرہان نے ڈھاڈر میں ہی قیام کیا۔میر عالیوں (بلیدیوں) نے میر ہیبتان کی سرکردگی میں سبی کے موجودہ علاقے گلوشہر اور بکھڑ و کے علاقوں میں اپنے خیمے نصب کئے۔بیورغ نے ڈھاڈر اور مٹھڑی کے درمیان دریائے ناڑی کے مغربی کنارے پر پڑاؤ کیا۔میر بجار پڑنے سیوی کے مشرق میں تلی کے پہاڑوں کے قریب سکونت اختیار کی۔نو حانیوں نے سردار

عومر کی قیادت میں درہ ملی کے قریب قیام کیا جو کہ گاجان کے پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے۔کھیری لوگ،کورزمین اور پلیجی کے میدانوں کی طرف گئے۔کورائی قبیلہ بھاگ منتقل ہوگیا۔اورکھوسوں نے روجھان اور ماُنجھی پور کے قریب بستیاں بسائیں۔(5)

رنداور لاشار بلوچ کنفیڈریسی کے مضبوط ستون تھے۔میرشہیک کے تدبراور بلوچ عوام کی بہادری نے جام نندہ (سمہ خاندان) سے کچھی کا علاقہ (سیوی سے لیکر کوہ سلیمان تک)اور دریائے حب تک کا سارا علاقہ فتح کرلیا تھا۔

شیہک کے مرنے کے بعد سب نے مل کر چاکر کو اپنا سردار بنالیا۔رنداور لاشار کی آپس میں رشتہ داری بھی تھی۔میر چاکر کی دو بہنیں محترمہ بانڑی اور محترمہ ندی لاشاری خاندان میں عبداللہ اورھدے خان سے منکوحہ تھیں۔

رند و لاشار تیس برس تک یہاں امن وامان میں رہے۔خوشحال لوگ تھے۔سیروشکار میں مشغول رہتے تھے۔رند جو پہلے سیوی،شوران اور ڈھاڈر تک بستے تھے اب نرمک،بارڑی،کرتہ،سنی اور شالی کچھی تک پھیل گئے۔انہوں نے شہر بسائے،قلعے تعمیر کئے۔انہوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو قتل نہ کیا بلکہ اپنے ساتھ اپنے کسان بنالیا۔

مولائی شیدائی کے بقول سبی پہنچنے پر بلوچوں کے پاس نو ہزار گھوڑے تھے (6)۔بھیڑ ،بکری اور دنبوں کا تو کچھ شمار ہی نہ تھا۔ان کی مستورات قلعوں میں رہتی تھیں۔ان کے فرش قالینوں سے رنگین تھے۔ان کے ہاں بالشت اور بستروں،چادروں کا رواج تھا۔وہ یہ سارا سامان ایران سے منگواتے تھے۔ان کے برتن زیادہ تر پیتل اور جست کے ہوتے تھے (ان دنوں مکران برتنوں کی صنعت کاری کی وجہ سے مشہور تھا)۔امیروں کے پاس سونے اور چاندی کے ظروف بھی تھے۔جنگ کے وقت ان کے پاؤں میں چمڑے کے لمبے بوٹ،بدن پر زرہ اور سر پر فولادی نوکدار ٹوپی ہوتی تھی ۔ان کے گھوڑوں کی زین پر پیتل کا عمدہ کام ہوتا تھا۔ان کے کمر بند اور چمڑے کا سامان خوشبودار چمڑے کا ہوتا تھا جس پر سبز مخمل پر زردوزی کا کام ہوتا تھا۔وہ چمڑے کا یہ سامان ہرات اور شیراز سے منگواتے تھے۔ان کے پاس تیروکمان،نیزے اور تلواریں ہوا کرتی تھیں۔شہسواری میں وہ باکمال

تھے،چست و چالاک تھے۔وہ باری باری حملہ کرتے تھے۔جب کامیاب نہ ہوتے تو ایک دم حملہ کر کے دشمن کو پریشان کرتے تھے۔ان کے گھوڑوں کو نعل لگے ہوتے تھے۔ان کے پاس گینڈے کے چمڑے کی ڈھالیں ہوتی تھیں۔جنگ سے فراغت کے زمانے میں وہ سیر کرتے تھے،شکار کھیلتے تھے ،گھڑ دوڑ کرتے تھے،عشق اور شاعری کرتے تھے،رقص اور موسیقی میں مشغول رہتے تھے۔وہ چوغے ،دستار اور کمر میں قیمتی شالیں لپیٹ کر محفل میں بیٹھتے تھے۔ان کی کمر میں خنجر آویزاں رہتے تھے۔وہ زلفوں اور کپڑوں پر عطر لگاتے تھے جو وہ قندھار سے منگواتے تھے۔ان کی محفلوں میں موسیقی ہوتی تھی،دنبیرہ اور سریندا۔ان کے اشعار زیادہ تر بہادری سے متعلق تھے۔

امیروں کی عورتیں کمخواب اور زربفت کا قیمتی لباس پہنتی تھیں۔اس دور میں عورتیں کانوں میں سچے موتی کے زیور اور ناک میں زیور پہنتی تھیں۔ہاتھوں میں مُندری،گلے میں چاندی کے طوق پہنتی تھیں۔

سردار نہایت ہی فیاض اور مہمان نواز ہونے پہ پابند تھے۔چاکر رند اور نوذبندغ لاشاری کی سخاوتیں اب بھی مشہور ہیں۔نوذبندغ کو اسی لئے ''زرزوال'' (پیسہ لٹانے والا) کہتے تھے۔

مکران والوں کے قافلے سندھ اور گجرات تک مشک ختن،ادویات اور کھجور کی تجارت کرتے تھے۔اس کے علاوہ بلوچستان چونکہ ایران اور ہندوستان کے درمیان واقع ہے اس لئے یہاں کے خطرناک پہاڑی دروں سے ان ممالک کا تجارتی سامان ہمارے خانہ بدوش ساربانوں کے قافلوں کے ذریعے چلتا تھا۔چنانچہ خراسان اور قندھار کے خشک و تر میوے یہی لوگ ہندوستان کی منڈیوں تک پہنچاتے تھے۔نقرہ وطلائی سکے ان کی گرہ میں بندھے ہوتے تھے۔

تجارت پر تو وہ آٹھویں صدی سے قابض تھے۔ابن بطوطہ کے وقت بھی قلات،کیچ ،سیوی،گنداواہ اور ملتان زبردست تجارتی منڈیاں تھیں۔شام،عراق اور مسقط کا کیچ سے بیوپار چلتا تھا۔یہاں سے بلوچ ساربان ان ممالک کی اشیاء ٹھٹھہ،گجرات بلکہ بڑودہ تک لے جاتے اور وہاں کی پیداوار سے اونٹ لاد کر لاتے۔قلات،خراسان کے میوہ جات کا مرکز تھا۔یہاں سے میوے

درہ بولان سے گزر کر ہندوستان جاتے تھے ۔سیوی میں غزنی اور قندھار کا مال (جس کا سلسلہ ہرات، سمرقند اور بخارا سے تھا) آتا تھا۔سیوی میں کپاس کی کاشت ہوتی تھی ۔ اس کے علاوہ بلوچستان کے دنبے یہاں سے ہندوستان اور سندھ کو فروخت ہونے کے لیے جاتے تھے ۔گنداواہ کے گھوڑے اور اونٹ ہندوستان میں ہاتھوں ہاتھ بکتے تھے ۔ملتان اس زمانے میں کپڑے کی تجارت کا مرکز تھا اور بلوچستان میں زیادہ تر کپڑا ملتان سے آتا تھا۔

تیر کمان اہم بنا، تلوار اہم بنی اور گھوڑا اہم بنا۔ اُس وقت کی جنگوں میں یہی ایف 16 ہوا کرتے تھے ۔ تلوار اس زمانے میں عام استعمال کا ہتھیار ہوا کرتی تھی............مصری ، ہندی ، اصفہانی ، شیرازی۔ اس طرح کی سماجی زندگی میں جہاں سماج ابھی ترقی یافتہ نہ تھا، گھوڑے کی اہمیت مرکزی تھی ۔گھوڑی جان سے بھی پیاری تھی ۔سبک رفتار گھوڑی جنگ میں فتح کا ذمہ دار تھی ۔ایرانی ، عربی (تازی)، سمند، ترکی ....ہم اُس دور کی شاعری کی بے شمار مثالیں دے سکتے ہیں ۔مشکی ، بور، کمیت ....

یمن کے ''مہرہ بن حیدان'' قبیلے کا اونٹ اپنی برق رفتاری کی وجہ سے مشہور تھا۔ اس وجہ سے سواری کے تیز رفتار اونٹ کو ابھی ابھی بلوچ ''مہری'' اونٹ کہتے ہیں۔

ہمارا کندھا اور ہمارا تیر کمان ، ہمارا کندھا اور ہماری بندوق ، ہمارا کندھا اور ہماری کلاشنکوف، ہمارا کندھا اور ہمارا راکٹ لانچر۔۔۔ ہمارے جغرافیائی مقام اور بیرونی حملہ آوروں کی حریص نگاہوں نے ہمیں جنگی دیوتا کی رعیت بنائے رکھا۔

اُس دور کی شاعری میں اِن کے علاوہ انتقام ،مہمان نوازی ،قول پہ پورا اترنا ، پناہ میں آئے ہوئے کے لیے جان دینا بہت تاکید سے استعمال ہوتے تھے ۔یہ ہمارے سماج کی قدریں بھی تھیں اور شاعری کا حصہ بھی۔

لفظ کی اہمیت کوئی بلوچوں میں دیکھے ۔ بلوچ کی Sensitivities میں جن عناصر کو اہمیت حاصل ہے ان میں لفظ اہم ترین ہے ۔ ویسے بھی انسان نے تباہی کی جتنی خطرناک چیزیں ایجاد کی ہیں ان میں سب سے خطرناک اور طاقتور چیز ''لفظ'' ہے ۔خنجر اور نیزے خون کے دھبے

چھوڑ جاتے ہیں ، تیروں کو دور سے دیکھا جا سکتا ہے، زہر آخر میں معلوم کیا جا سکتا ہے اور اس سے پرہیز کیا جا سکتا ہے مگر لفظ بغیر نشان چھوڑے تباہ و برباد کر دیتا ہے ۔ (7) اسی لیے کہتے ہیں نا کہ : دف کلائے ، دف بلائے ۔(زبان قلعہ بھی ہے، زبان بلا بھی ہے)

بلوچ تاریخ میں رندی عہد شاید سب سے متحرک دور تھا۔ اس میں انسانی حیات ایک لحاظ سے ہمہ پہلو لپک جھپٹ میں نظر آتی ہے ۔سرگرم زندگانی نے ہر شعبہ کو گرم کیے رکھا تھا۔ اُس زمانہ میں اس کے باوجود کہ دفتری زبان فارسی ہی رہی مگر شعر وسخن کی زبان بلوچی تھی ۔ بہت سی تحریروں میں یہ دعویٰ موجود ہے کہ میر چاکر کا بیٹا شہداد بلوچی کا شاعر تھا، محترمہ مہناز شاعر تھی ۔ اسی طرح بیورغ کمال کا شاعر تھا۔ اور شعر وسخن اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ اس کے علاوہ اس زمانہ میں رند و لاشار کے جتنے بھی مدبر تھے (فیروز شاہ، ریہان، جاڑو اور بجار) وہ سب بلوچی اشعار کے خالق تھے ۔ ایک عمومی ماحول تھا شعر وسخن کا۔ ہمیں وہاں ہر واقعہ، ہر بڑے دربار اور اکٹھ کا بحث مباحثہ، عشق و محبت یا جنگ و جدال ایک رواں تبصرے کی صورت میں شاعری میں ملتی ہے ۔ کہیں کہیں یہ شاعری ڈرامہ کے انداز میں ہوتی ہے ۔ جہاں ہر کردار اپنا موقف شاعری میں بیان کرتا ہے ۔

اپنے ڈکشن کے اعتبار سے بھی اس عہد کی کلاسیکل شاعری کسی ایک یا دو چار افراد کی شاعری نہیں ہے بلکہ بہت سے لوگوں کی ہے ۔ بڑی حد تک ہماری تہذیب و تاریخ اس عہد کی خوبصورت شاعری پہ کھڑی ہے ۔

یہ زمانہ وہ تھا جب بلوچ' اپنے بڑے بڑے رم، ریوڑ اور گائیوں اونٹوں کے رم (گورم اور بگ) کے ساتھ زرخیز زمینوں اور سرسبز چراگاہوں کے علاقوں میں آباد کاری کر چکے تھے ۔ اور خانہ بدوشی والی مویشی بانی کے ساتھ ساتھ زراعت پر مبنی مویشی بانی بھی اختیار کر چکے تھے ۔ ہم پندرہویں صدی کی بات کر رہے ہیں ۔ ایک طرف گنداواہ کی زرخیز زمین تھی اور دوسری طرف سبی و ڈھاڈر کا دریائے بولان کا دہانہ تھا۔ گندم کی فراوانی تھی اور سبزے کی بہتات ۔ بھیڑوں کی افزائش خوب تھی اور شیر و روغن فراوان ۔ سجی، شکار، تیراندازی، گھڑ دوڑ ، اکٹھ، محفل دربار........... یہ سب کچھ ادب کی ترقی کیلئے ایندھن تھا۔

کہتے ہیں کہ سبی میں چاکر کے قلعے پر دھامہ (یا بڑا ڈھول) دن میں دو بار بجایا جاتا تھا۔

چاکر نے بلوچوں کی یہ خود مختیار حکومت قلات، کچھی اور پنجاب کے ملحقہ علاقوں تک پھیلا دی تھیں۔

ہماری پوری چاکری تاریخ اُس دور کے نوجوانوں کے اُس قول پر کھڑی ہے جو ہر ایک نے دے رکھا تھا اور آگے اُسے پالنے اور اس پر پورا اترنے میں اپنے سر و مال قربان کر دیے:

* ہیوتان نے قول دیا کہ اگر کسی کا اونٹ میرے اونٹوں کے جھنڈ میں آ جائے تو میں اسے واپس نہیں کروں گا۔

* جاڑو نے قول دیا کہ: اگر کسی نے میری داڑھی کو ہاتھ لگایا تو میں اُسے جان سے ماردوں گا۔

* نوذبندغ سخی نے قول دیا تھا کہ: اگر کسی نے میرے شانوں کو ہاتھ لگایا تو میں اسے قتل کر دوں گا۔

* شہ مرید کا عہد تھا کہ جمعرات کو صبح سویرے بھکاری مجھ سے جو بھی مانگے گا' دے دوں گا۔

ایک خوبصورت ادب تخلیق کر کے ہمیں بتلا دیا گیا کہ یہ پوری صدی انہی قولوں کی پاسداری کی صدی تھی۔

یہ دور دراصل ہماری کلاسیکل داستانوں کے عروج کا دور ہے۔ بلوچ کی ڈیڑھ درجن سے زائد عالمی سطح کی داستانوں کا نصف اسی پندرھویں سولہویں صدی سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ غنی اور دھنی کلاسیکل داستانیں میں نے اپنی کتاب ''بلوچی زبان وادب'' میں تفصیل سے دی ہیں۔ یہاں چلتے چلاتے، بس ایک آدھ فقرہ دیکھتے جایئے:

اس دور میں ہانی اور شہ مرید کی عشقیہ داستان بلوچی کلاسیک کی انگوٹھی کا نگینہ ہے۔ ایسی حسین، روان، رنگین اور دلکش داستان کہ بس سنتے ہی جائیں' بس پڑھتے ہی جائیں۔

اسی طرح گوہر جتنڑیں بلوچ تاریخ کی ایک فقید المثال خاتون ہے۔ قبائلی منافرتوں کو

بھڑکانے نہ دینے میں اس کی شعوری کاوشیں رہی ہیں۔ ہمارا کلاسیکی ادب محترمہ گوہر کے بغیر بالکل تشنہ اور نامکمل سمجھی جائے گی۔

قویل جت کے زمانے یعنی پندرہویں صدی کا یہی بلوچ سماج، نہ صرف یہ کہ طبقاتی تھا بلکہ اِسی طبقاتی بنیاد پر ذات پات کا کریہہ نظام بھی قائم ہو چکا تھا۔ یہاں ایسے کئی پیشے تھے جن سے وابستہ لوگوں کو دوسرے درجے کا بلوچ سمجھا جاتا تھا۔ اس ذات پات کے نظام کے خلاف قویل جت کی چیخ وفریاد پر مبنی بہت ہی خوبصورت شاعری ہے۔

ھَیوتاں میرالی رند تھا۔ اس دور کے بہت ہی حیران کن قول دینے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ اگر کسی کا اونٹ اُس کے اونٹوں کے گلے (بگ) میں آ جائے تو وہ اسے واپس نہیں کرے گا۔ اور پھر چاکر کا اونٹ اُس کے بگ میں۔ مگر چھڑتی جنگ کو ہانی روک دیتی ہے۔ ایک بہت بڑی بدامنی، خیرسگالی اور بھائی بندی میں بدل جاتی ہے۔

اِس فیوڈل عہد میں ایک بہت ہی نمایاں رول بیورغ کا رہا ہے۔ چاکر کا بھانجا بیورغ شمشیر و رباب و شباب کا دھنی تھا۔ رواج و روایت کا پاسباں۔ شجاعت و تدبر کا نشاں۔ فہم و تدبیر کا ماہر۔ ایسے لگتا ہے کہ چاکر کا ابھار اور زوال بیورغ کے وجود کے گراف کے ساتھ ساتھ زیر اور بم رہا ہے۔

بیورغ نے اپنی محبوبہ سے وصل کے لیے اُس کے پہریداروں کو سونے کی اشرفیاں بطور رشوت دی تھیں۔ اسی زمانے میں ایک اور جگہ بھی سکّے کا ذکر آیا ہے جب شہداد اپنی بیوی مہناز کو طلاق دیتا ہے تو کنکروں کے بجائے جیب سے تین اشرافیاں نکال کر بطور طلاق مہناز کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس خود کفیل اور اجناس کے تبادلے والے معاشرے میں کسی طور کرنسی بھی داخل ہو چکی تھی۔ یہ سکہ کیا تھا، کس کا تھا یہ تو معلوم نہیں۔ مگر اِس کا بلوچ معاشرے میں (ثانوی طور پر ہی سہی) آ جانا بذاتِ خود بڑی بات تھی۔ ظاہر ہے وہ سونے یا چاندی کا سکہ ہی ہو گا جو بیرونی اقوام سے تجارت میں استعمال ہوتا ہوگا۔ خود بلوچ کرنسی تو ڈیڑھ دو سو سال بعد میں دستیاب ہونا تھا۔ شاید خوانینِ بلوچ سے قبل تاریخ دانوں کو بلوچ سکہ نہ ملا ہوگا۔ خوانینِ قلات میں

زر کا اچھا خاصا رواج ہو گیا۔ اسی لئے تو تجارت کہیں سے کہیں پہنچ گئی تھی ۔ اب تو خیر سکّے بھی ضروری نہیں رہی ۔لوگ محض اشارے استعمال کرنے لگے یعنی کاغذ (نوٹ یا چیک یا کارڈ) کا ایک ٹکڑا جس پر کہ ادا کرنے کا وعدہ درج ہوتا ہے، کافی سمجھا جانے لگا۔لیکن شاید یہ بھی میں پرانی دقیانوسی بات کر رہا ہوں۔ اب تو ای بنکنگ اور موبائل بنکنگ کا چلن شروع ہو چکا اور میری اس کتاب کے چھپ جانے تک معلوم نہیں پھر کیا کرنسی چل پڑے گی۔

اسی طرح اس دور کا ایک کلاسیک شلی وحسن مولانغ کے نام سے ہے جس کی سٹوری اور شاعری نہایت دلکش اور دلگیر ہے۔ جو محض عشقیہ نہیں، تلخ ترین رزم کی رپورتاژ بھی ہے۔ رشتوں کی گداز اور فنی شاہکار داستان!۔

بلوچ کلاسیک میں دل مَلِخ کا ذکر ہمیشہ پشیمانی، افسوس اور احساس زِیاں کے ساتھ آتا ہے۔ وہ ایک مجسم بلوچ تھا، شکاروعشق و جنگ وشاعری کا دلدادہ۔ وجاہت میں کوئی ثانی نہیں۔ یہ لاجواب رند نوجوان، جوئے بازی کی بری لت میں پڑ گیا۔اور آہستہ آہستہ بہت ہی دولت مند دل مَلِخ کنگال ہو جاتا ہے۔

شہداد ومہناز کی داستان والی مہناز بلوچ تاریخ میں عورت کی طرف سے ناانصاف مردانہ سماج سے ٹکر لینے اور قبائلی نظام کی ناروائیوں سے مزاحمت کرنے کی علامت اور سمبل ہے۔ مردانہ سماج کے خلاف اس کی لازوال جدوجہد کو خوبصورت شاعری کے ذریعے امر کر دیا گیا۔

یہیں ہمیں غلام داری سماج کی موجودگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اُن سے نہ صرف گھریلو کام کاج کروانا دستور تھا بلکہ انہیں ڈنڈوں چابکوں سے مارنے کا رواج بھی موجود تھا۔

یہ بہت ہی غورطلب اور دلچسپ بات ہے کہ بلوچ کلاسیکل شاعری میں جتنی بھی خواتین کا ذکر آیا ہے، مثبت انداز میں آیا ہے۔ ہانی لے لیں، گوہر لے لیں، گراناز لے لیں، حتیٰ کہ شلی کو لے لیں سب کے سب آپ کو مثبت کردار ادا کرتی نظر آتی ہیں۔ یہ بہت ہی ممتاز حقیقت ہے۔

دوستین وشیریں: ایک بہت ہی حسین کلاسیک جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔شاعری بھی زبردست ہے۔

بالاچ Balaach: یہ سولھویں صدی کا نہایت ہی دلکش داستان ہے۔ بالاچ گوریلا گیری شروع کرتا ہے اور دشمنوں کو ایک ایک کر کے قتل کرتا جاتا ہے۔

اس طرح بالاچ، 61 آدمی مار کر مر جاتا ہے۔ اس کی قبر بگٹی علاقے کے اندر سنگسیلا میں ہے۔ اور اس کے بھائی دودا کی قبر ڈیرہ بگٹی شہر کے شمال مشرقی کنارے پر۔ مکمل داستان میری کتاب ''بلوچی زبان وادب'' میں موجود ہے۔

ایسا خوبصورت عہد جو ابد تک بلوچ آسمان پر قطب کے ستارے کی مانند دمکتا رہے گا۔ بلوچ کو صرف اُسی وقت تباہ کیا جا سکے گا جب پندرھویں سولھویں صدی کا اُس کا ادب اُس کی زندگی سے ہذف کیا جائے

............مگر کیا یہ ممکن ہے؟

حوالہ جات

1۔گشکوری، سردار خان۔ چاکرِ اعظم۔1988۔ایم ایم ٹریڈرز کوئٹہ۔صفحہ 115

2۔خان، احمد یار خان۔مختصر تاریخ بلوچ وخوانین بلوچ۔1972۔ایوانِ بلوچ۔کراچی۔صفحہ 34

3۔ایضاً۔صفحہ 35

4۔ایضاً۔صفحہ 36

5۔گشکوری، سردار خان۔ چاکرِ اعظم۔صفحہ 126

6۔مولائی شیدائی۔سرزمینِ بلوچ۔صفحہ 295

7۔کوئہلو پاؤلو۔دی ففتھ ماؤنٹین۔1998۔ہارپر کولنز پبلشرز۔نیویارک صفحہ 64

2۔خانہ جنگی

یہیں پہ چاکر و گہرام کی خون آشام جنگیں شروع ہوئیں ۔ان کے درمیان کل 25لڑائیاں ہوئیں جن میں دس بار لاشاری کو اور پندرہ بار رندوں کو فتح ہوئی۔(1)(مگر فتح کیا ہونا تھا، ایک دوسرے کی جڑیں کھود کھود کر دونوں برباد ہو گئے)۔ اس تباہ کن جنگ کی بڑی وجوہات درج ذیل ہیں:

1۔ لاشار اور رند قبائل کے درمیان سبی اور گنداواہ کی زرخیز زمینوں کی تقسیم پر باہمی کشمکش اور ہنگامہ خیزی نے اختلافات کی صورت اختیار کر لی۔

2- ایک اور بڑی وجہ چراگاہوں والے علاقوں کی کمی تھی۔

3- ایک فروعی بات گوہر جتنی کی بھی کی جاتی ہے۔

4- بلوچستان کی دو ہمسایہ طاقتوں، یعنی قندھار کے ارغون اور سندھ کے سمہ کی حریصانہ مداخلت۔1470 واضح رہے کہ ء میں ترک وار لارڈ' سلطان حسین مرزا نے کوئٹہ پشین اور سیوی کو امیر شجاع الدین ذنوں (ارغون) کیلئے قبضہ کرلیا۔

چنانچہ چاکر نے لاشاری کو زیر کرنے کے لئے ہرات کے سلطان حسین سے مدد کی درخواست کر ڈالی۔

یوں ان نعمتوں کے حصول اور توسیع کی تگ و دو میں سیوی کی سرزمین پر دو فیوڈل قبائلی گروہوں کے مابین تیس سالہ جنگ لڑی گئی۔

اس طرح سلطان حسین نے پہلے تو لاشاریوں کا قتل عام کر کے ان کی فوجی قوت ختم کر دی اور کچھی کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔اس کے فوراً بعد ہی اس نے سیوی پر قبضہ کر کے رندوں کے اقتدار کو بھی ختم کر ڈالا۔سلطان حسین والی ہرات نے 1470ء میں بلوچستان پر قبضہ کرلیا۔چاکر تباہ، گوئہرام تباہ۔وطن چھن گیا اور پوری قوم دربدر ہوگئی۔بلوچ شاعروں نے وطن بدر ہونے کی کیفیات اس قدر دل ہلا دینے والے انداز میں بیان کی ہیں کہ ان کے سامنے بڑے سے بڑے عالمی مرثیے بھی ہیچ ہیں۔

1480ء میں سلطان حسین نے قندھار، شال، پشنگ، سیوی اور مستنگ وغیرہ کے علاقوں پر شجاع الدین ذوالنوں بیگ ارغون کو گورنر مقرر کیا۔ذوالنوں کی موت کے بعد اس کا بیٹا شاہ بیگ ارغون اس علاقے کا حکمران بنا۔ظہیر الدین بابر کے اس علاقے کے سیاسی میدان میں آتے ہی ارغونوں نے اس کی اطاعت قبول کر لی اور یوں یہ علاقہ مغلوں کے قبضے میں آ گیا۔

چاکر اس تیس سالہ جنگ اور لاشاریوں کو تباہ کرنے کے بعد خود بھی نڈھال و کمزور و بے وقعت ہو کر علاقہ بدر ہو گیا۔وہ 1512ء کے آغاز میں سبی سے براستہ موجودہ مری علاقہ ملتان چلا گیا اور اس راستے میں چاکرہ کور، چاکرہ میہاگ' چاکرہ پوش نامی جگہیں اس کے سفر کے سنگ میل بن گئیں۔بلوچستان میں سے گوئہرام لاشاری بھی تباہ اور گم ہو گیا اور گجرات کا ٹھیاواڑ کی جانب ہجرت کر گیا۔

حوالہ جات

1۔عطائی، محمد ابراہیم۔ د بلوچ ملی آزادی بخشونکو جنبشونو تہ یوہ کتنہ۔اکیڈمی آف سائنسز۔کابل
صفحہ 14

3۔وطن بدر چاکر

ہم بات کر رہے تھے کہ چاکر نے سبی سے موجودہ مری قبیلے کے علاقے کو اپنی وطن بدری کا راہ گزر بنا لیا۔بجار اور اس کا گروہ بجار وڈھ نامی مقام پہ چاکر سے جدا ہو گیا تھا۔چاکر باقی ماندہ لوگوں کے ساتھ کاہان کے قریب بار بوژ نامی درے سے مری بگٹی علاقے سے موجودہ پنجاب کی جانب نکل گیا(1)۔

اُس کے زمانے میں مری کے علاقے میں آبادی بہت کم تھی۔ماوند، کاہان اور بابر کچھ کے اردگرد ہی آبادی تھی۔اسی دوران ہی اس آبادی کا' نام مری پڑ گیا۔بجار کی سربراہی میں رند کے کچھ گھرانے بھی دریائے لہڑی کے کنارے سے لے کر ماوند کی وسعتوں میں آباد ہو گئے(2)۔

سمہ حکمرانی کا عروج نظام الدین کے عہد میں تھا جسے عرف عام میں ''جام نندہ'' کہتے ہیں جو 1461ء میں حاکم بن کر 48 برس تک حکومت کرتا رہا۔اس کی حکمرانی کے آخر میں ارغون (ترک) سندھ میں نمودار ہوئے اور ارغون چیف ذوالنوں بیگ نے پشین اور مستنگ فتح کر لئے ۔ازبکوں سے لڑائی میں ذوالنوں بیگ کے قتل ہو جانے کے بعد شاہ بیگ نے حکومت سنبھالی۔اُسے ایک اور ترک، بابر کے مقابلے میں قندہار کو بچانا مشکل ہو گیا اور وہ 1511ء میں سیوی پر قبضہ کرنے روانہ ہو گیا۔تین ہزار بلوچوں نے مقابلہ کیا۔مگر شاہ بیگ کی فوج کو مکمل طور پر فتح ہو گئی۔وہ مرزا عیسیٰ خان ترخان کو گورنر بنا کر قندہار واپس لوٹا۔شاہ بیگ نے 1517ء میں جھالاوان پر بھی قبضہ کر لیا(3)۔مگر 1512ء میں بابر نے بڑی فوج کے ساتھ قندہار پر قبضہ کر لیا۔1518ء میں شاہ بیگ نے سلطان علی ارغون اور ذبیک ترخان کو سیوی اور گنداواہ کے قلعوں کی حفاظت کیلئے چھوڑا اور 1520ء تک سمہ حکمرانوں کا مکمل صفایا کر کے سندھ پر قابض ہو گیا(4)۔

شاہ بیگ 1522ء میں مر گیا اور اس کا بیٹا شاہ حسین 1554ء تک بادشاہی کے مزے لوٹتا رہا۔اس کی موت کے ساتھ ہی ارغون کی خانی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا علاقہ ٹھٹھہ کے گورنر مرزا عیسیٰ خان ترخان اور بکھر کے سلطان محمد کے مابین تقسیم ہو گیا۔

اُدھر چاکر بلوچستان سے وطن بدر ہونے کے بعد کئی قبائل کے ساتھ ملتان کے صوبے میں آباد ہو گیا۔مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں پہلے بلوچ آباد نہ تھے۔تاریخ ہمیں یہاں حضرت عمر کے زمانے میں بھی بلوچوں کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔

چاکر کے آنے سے ملتان کے لنگاہ حکمرانوں کو ایک ریڈی میڈ لڑاکا فورس مل گئی جنہیں اپنے اغراض کی خاطر بڑی بڑی جاگیریں عطا کی گئیں۔یہ تھا سلطان شاہ محمود ابنِ سلطان فیروز شاہ ابنِ سلطان حسین لنگاہ(5)۔

دوسرے لفظوں میں بلوچستان کا سابقہ فیوڈل حکمران چاکر اب مہاجر چاکر بنا' اور اس کے بعد پھر ایک بار مستحکم فیوڈل بنا۔پہلے سیوی کی پانی والی زمین تھی، اب ملتان کی زرخیز زمین تھی ۔افرادی قوت رکھنے والا سردار جہاں جائے اسے جاگیر اور زمین ملنی یقینی ہوتی ہے۔دوسرے لفظوں

میں قبیلہ سردار کیلئے بذاتِ خود کرنسی کا کام دیتا ہے۔یہ ایک ٹریولنگ چیک ہے جسے سردار جب چاہے کیش کرالے۔

لنگاہ کے بارے میں بھی دو ایک باتیں ہو جائیں۔لنگاہ نویں صدی میں موجودہ بلوچستان کے سیوی علاقہ میں حکومت کرتے تھے۔جب بلوچوں نے ان کو پیچھے سے دھکا دے کر بھگا دیا تو وہ سندھ کی جانب بڑھے۔لنگاہ سردار رائے سہارا نے شیخ یوسف سے جو ملتان میں حکومت کرتا تھا، اپنی لڑکی کی شادی کر کے دوستی کر لی اور بعد ازاں ملتان پر قبضہ کر لیا۔رائے سہارا نے ''قطب الدین'' کا لقب اختیار کیا۔اور پانچ سال (1554-1550) تک ملتان میں حکومت کی۔(پتہ چلا کہ ''مردِ مومن، مردِ حق'' نے ہی مذہب کو اپنے اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا بلکہ اس سے چارسو سال قبل بھی حاکم خود کو ''قطب الدین'' قرار دے کر حکمرانی کرتے تھے۔ملتان کے قرب و جوار میں بلوچوں کا تسلط تھا۔چنانچہ قطب الدین سلطان کے وارث سلطان حسین کو کئی مرتبہ اُن سے لڑنا پڑا۔اس نے راوی کے کنارے شمال پر واقع شورکوٹ پر حملہ کیا جو غازی خان بلوچ کی حکومت میں تھا۔بلوچ امیروں نے شورکوٹ کے شمال میں اور شمال مغرب میں بھیرا، خوشاب اور موجود جھنگ ضلع میں چنیوٹ تک کا علاقہ آپس میں تقسیم کر لیا تھا۔

سلطان حسین لنگاہ نے اپنی جارحانہ کارروائی جاری رکھی اور دھن کوٹ سے کوٹ کہروڑ تک کے تمام علاقے پر قبضہ کر لیا۔بہلول لودھی نے اپنے لڑکے بایزید اور اپنے سپہ سالار تاتارخان کو ملتان فتح کرنے کیلئے بھیجا۔۔۔افغانوں سے خوفزدہ ہو کر لنگاہ سرداروں نے نووارد بلوچ قبیلوں سے مدد مانگی۔یہ وہ وقت تھا جب گنداواہ اور مکران سے ملک سہراب دودائی اور اس کے دونوں لڑکے اسمٰعیل اور فتح خان بمعہ اپنے تمام قبیلے اور عیال و اطفال کے دریائے سندھ کو عبور کر کے شمال کی جانب بھٹکتے ہوئے پہنچے تھے۔سلطان حسین لنگاہ نے ملک سہراب اور اس کے لڑکوں کو دھن کوٹ سے کہروڑ تک کا علاقہ جاگیر دے دیا(6)۔

سلطان حسین لنگاہ کی حکومت 1460 سے اسی صدی کے آخر تک رہی۔سلطان حسین لنگاہ کے بعد 26 سال کے عرصہ میں دو حکمران ہوئے، فیروز شاہ اور محمود۔سلطان محمود کے زمانے

میں شورش زیادہ تھی۔ جام بایزید نے ملتان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر سلطان محمود نے اسے شکست دے دی جس کے بعد جام بایزید دریائے راوی پہ واقع شورکوٹ کے قلعے چلا گیا۔اور وہاں سلطان سکندر لودھی کے نام کا خطبہ پڑھنے لگا۔اس نے لنگاہ سلطان محمود کے خلاف سکندر لودھی سے مدد کی اپیل کی۔ جب سلطان محمود لنگاہ نے شورکوٹ پر حملہ کیا تو سکندر لودھی نے پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی کو جام بایزید کی مدد کرنے کا حکم دے دیا۔دولت خان نے سلطان محمود لنگاہ کو مجبور کر دیا کہ وہ شورکوٹ کا قلعہ دہلی کے سلطان کے حوالے کر دے اور دریائے راوی کے نیچے کے حصہ کو دونوں سلطانوں کے درمیان سرحد مان لے۔ چونکہ لنگاہ ریاست میں دودائی بلوچ بہت زیادہ طاقتور ہو گئے تھے۔اس لئے جام بایزید نے ان کے جدی پشتی دشمنوں یعنی رند بلوچوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے سردار چاکر رند کی رہنمائی میں اپنے قبیلے کے ساتھ ملتان ہجرت کر جائیں۔ چنانچہ میر چاکر اپنے دو لڑکوں یعنی اللہ داذ اور شاہ ذاذ کے ساتھ سیوی کی جانب سے ملتان آ گیا(7)۔

یوں چاکر کا متحرک عہد اس طرح ختم ہوا کہ برادرکشی اِس عہد کی علامت بن گئی۔اور بربادی اِس کا نتیجہ۔

حوالہ جات

1۔گشکوری، سردار خان۔چاکرِ اعظم۔1988۔صفحہ 139

2۔مری، خدا بخش، ''دی بلوچیز تھرو سنچریز''، 1964، اسلامیہ پریس کوئٹہ صفحہ نمبر 129۔

3۔جھالاوان گزیٹیئر۔صفحہ 37

4۔گزیٹیئر۔کوئٹہ پشین۔صفحہ 33

5۔احمد، خواجہ نظام الدین۔طبقاتِ اکبری۔جلد سوئم۔صفحہ 521

6۔قانون گو، کالکارجن۔شیر شاہ سوری اور اس کا عہد۔1996۔تخلیقات لاہور۔صفحہ 464

7۔ایضاً۔صفحہ 466

4۔ بلوچ اور مغل

ظہیر الدین بابر، تیمور لنگ اور چنانچہ چنگیز خان کی اولاد میں سے تھا۔اُسے سمرقند میں ایک صوبہ ورثے میں ملا تھا۔مگر اس کے بھائی نے اس کا تختہ الٹ کر اُسے وہاں سے بھگا دیا۔اس وسطِ ایشیائی کم سن مفرور اور بھگوڑے وارلارڈ نے 1504 میں کابل فتح کر لیا۔ پھر اس نے اسے اپنا مضبوط مرکز بنا لیا اور وہاں سے وہ آس پاس فتوحات کرنے کی تدبیریں کرنے لگا۔اس کی مستقل نگاہ غنیمت کے حتمی مال، یعنی دہلی پر تھی۔

سمرقند پر دوبارہ قبضہ کی کئی ناکام کوششوں کے بعد بابر نے اپنی توجہ جنوب کی طرف کر دی اور پانچویں کوشش پہ ابراہیم لودھی کی فوج کو پانی پت کے میدان میں شکست دیدی۔اس طرح ابراہیم ہندوستان میں،لودھی سلسلے کا آخری،اور بابر،مغلیہ سلسلے کا پہلا حکمران بنا۔

جب وہ ابھی کابل میں تھا تو پنجاب کے صوبیدار دولت خان لودھی کی جانب سے ایک وفد نے اس سے ملاقات کر کے اسے پنجاب آنے کی دعوت دی۔ جب دہلی کے بادشاہ کو دولت خان کی وفاداری پر شک ہوا تو اس نے اُسے لاہور سے نکال دیا۔اور وہ سابق حاکمِ لاہور بلوچوں کے پاس پناہ لینے پر مجبور ہوا۔ بابر پنجاب روانہ ہوا تو دیپالپور کے مقام پر دولت خان جو بلوچوں کی پناہ میں تھا ،بابر کے ساتھ مل گیا(1)۔ بابر نے سیوی واپس بلوچوں کے حوالے کر دیا۔(بلوچوں کی حمایت لینے کی تگ و دو بابر سے لے کر آج تک کے ہر حکمران کی مجبوری رہی ہے)۔

بابر کی دیسی زبان ترکی تھی مگر وہ فارسی کا طرفدار تھا۔ظاہر ہے کہ ہر بادشاہ کی طرح بابر کی بھی بہت سی خواہشات اور بہت سے پروگرام تھے۔اور اِن ساری خواہشات کی تکمیل وہ ہندوستان فتح کرنے کے بعد کر سکتا تھا۔مگر کہیں سے منڈلاتی موت نے آ کر اُسے ہمیشہ کیلئے فطرت کی بیکراں ہستی میں جذب کر لیا۔اور اُس کی خالی کردہ چوکی پر ہمایوں کو ''ظلِ سبحانی'' بنا دیا۔اسی تخت کی کرسی کے بطن سے شیر شاہ نامی ایک اور وارلارڈ نے ہمایوں کی دوڑ لگوا دی۔ چنانچہ ایک اور ظلِ الٰہی وجود میں آیا،ایک اور بادشاہ بنا' اور استحصال کی ایک اور شکل سامنے آئی۔

ملتان کے بلوچوں کے متعلق شیر شاہ کی پالیسی کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلے دور یعنی 1541ء میں شیر شاہ نے یہ کوشش کی کہ حالات بدستور حسبِ سابق رہیں۔ بابر نے لکھا:'' بھیرا، لودی سلطنت سے باہر تھا۔اس کے مغربی علاقہ میں جاٹ، گوجر اور بلوچ لوگ آباد تھے نہ کہ افغان۔شیر شاہ نے یہ دیکھا کہ بھیرا اور خوشاب میں دو دائی بلوچ آباد ہیں اور یہی بلوچ یہاں کے حکمران ہیں۔وہ بلوچوں کے معاملے میں دست اندازی پسند نہیں کرتا تھا۔کیونکہ اگر وہ لوگ اس کے مخالف ہو گئے تو وہ کسی کو بھی پانچ ہزار گھڑ سواروں کی فوج بہ آسانی فراہم کر سکتے تھے۔

بلوچ سردار فتح خان دودائی، اسماعیل خان اور غازی خان نے ہمایوں کا تعاقب کرنے میں اس کی مدد کی تھی۔شیر شاہ نے خوشاب علاقہ میں ان کی جاگیریں بحال رکھیں۔وجہ یہ تھی کہ وہ باجور سے لے کر بھیرا تک کا پہاڑی علاقہ اسماعیل خان بلوچ کی امداد کے بغیر اپنے تسلط میں نہیں رکھ سکتا تھا۔لہذا اس نے اسماعیل خان کی فوج کو اپنی فہرستِ سپاہیان میں شامل کر لیا...... پوری پندرہویں صدی میں بلوچوں کے دو دائی اور ہوت قبائل شمال کی سمت میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے خانہ بدوشوں کی طرح گھومتے رہے۔وہ اس وقت بولان کے دہانے سے لے کر گومل کے درے تک اس تمام علاقہ پر قابض تھے جو کوہِ سلیمان کے سلسلے کے جنوب میں تھا۔بلوچوں کا رند قبیلہ چناب، راوی اور ستلج کے میدانوں میں بس گیا(2)۔

بلوچوں کے بارے میں شیر شاہ کی پالیسی کا دوسرا دور 1543ء سے شروع ہوتا ہے جب ہیبت خان نیازی کی کمان میں فتح و توسیع کی کیفیت رہی۔1541ء میں شیر شاہ اس حالت میں نہیں تھا کہ بلوچوں کے ساتھ سختی کر سکتا۔وہ اگر اس موقع پر بلوچوں پر سختی کر کے ان کی جاگیریں ضبط کر لیتا اور وہاں دست اندازی کرتا تو ممکن تھا کہ تمام بلوچ متحد ہو کر اس کے خلاف محاذ بنا لیتے۔۔۔۔ شیر شاہ نے مدبرانہ انداز میں بات کو سلجھایا۔اس نے لنگاہوں کو جن کا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا یہ امید دلائی کہ وہ ارغونوں سے انتقام لینے میں ان کی مدد کرے گا۔۔۔۔شیر شاہ نے غازی خان اور اسمٰعیل خان بلوچوں کا اپنے اپنے علاقہ پر قبضہ تسلیم کر لیا۔۔۔۔اس نے فتح خان دودائی کو

ملتان میں اپنا فوج دار مقرر کر دیا۔اسی طرح دوسری کئی رعایتیں بھی بلوچ سرداروں کو دیں(3)۔

لیکن بعد میں شیر شاہ نے اپنی پالیسی بدل لی۔اس نے ملتان کے بلوچوں پر حملہ کرنے کیلئے 1543ء کا سال چنا۔شیر شاہ کے حکم سے ہیبت خان نیازی نے فوج کشی کی۔

اس سے قبل 1539ء میں شیر شاہ کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد ہمایوں بھاگ کر لاہور چلا گیا اور وہاں سے ملتان جا کر دم لیا۔جب وہ اوکاڑہ کے قریب قصبہ سرگودھا پہنچا تو اس کی خوراک کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔اور اس نے چاکر کے امراء میں سے ایک، بخشو بلوچ سے مدد طلب کی۔بخشو نے آٹے سے بھری ہوئی 100 کشتیاں شکست خوردہ بادشاہ کو امداد کے بطور فراہم کیں۔بعد ازاں انہی کشتیوں پر سوار ہو کر بادشاہ نے دریا عبور کیا۔ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم، بخشو کی اس امداد و کمک کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتی ہے:''اللہ تعالیٰ اپنا رحم و کرم بخشو پر نازل کرے جس نے سخت مشکل کی گھڑی میں شہنشاہ کی خدمت کی''(4)۔

ہمایوں وہاں سے پناہ گزیں کے بطور ڈیرہ غازیخان آ کر بلوچوں کی سجی اور کاک سے لطف اندوز ہوا۔تنزلی کے اس سفر میں اس نے اپنے دو چار شناساؤں کے دروازے ضرور کھٹکھٹائے مگر جب انسان کی آنکھیں بدل جاتی ہیں تو اس کی روایتیں اور ثقافتی اقدار بھی بدل جاتی ہیں۔بالآخر شال و مستنگ کے بلوچ سردار لونگ خان نے اسے باہوٹ بنا لیا۔یہ واقعہ 1545ء کا ہے۔بلوچستان سے گزرتے ہوئے وہ نوشکی میں رکا جہاں سردار ملک خطی نے اس کی مدد کی۔جسے ابوالفضل نے''صحرا کے رہزنوں کے سرخیل'' کا نام دیا تھا۔وہاں سے اُسے بلوچوں نے گرم سیل کے راستے سیستان ایران تک پہنچایا۔وہاں ایران کی مدد سے اس نے قندھار فتح کر لیا اور آگے کی فتوحات کے لئے پھر بلوچوں سے مدد کی اپیل کی۔بلوچ جوق در جوق مری علاقے سے روانہ ہوئے اور ڈیرہ غازی خان میں خود کو منظم کرنے لگے۔لاہور کے مقام پر بلوچ لشکر اُس سے آن ملا۔1555ء میں سرہند کے میدان میں میر چاکر کی ہمشیرہ بانڑی کے اکسانے اور جوش دلانے کی ٹیکٹیک نے بلوچوں کو فیصلہ کن جنگ پر ابھارا۔اور اُن کی بہادری اور بے لوث جنگ کے نتیجے میں اُن کے اتحادی ہمایوں کو تخت نصیب ہوا(5)۔بلوچ سرداروں میں شہزاد، نوہک اور النڑ چاکر خان کے ساتھ تھے۔رندوں کے

تین سو جوان مارے گئے مگر بلیدی بہت قتل ہوئے ۔ ہمایوں نے کچھ بلوچوں کو پنجاب کے علاقہ دو آبہ میں جاگیریں دیں اور ٹالپروں کو کوہ سلیمان کے دامن میں ۔ (یہ ٹالپر بعد میں وہاں نہ ٹکے اور سندھ میں بس گئے)۔

اس طرح ہزار گنج والے دلی پر ہمایوں اور اس کے اتحادیوں نے قبضہ کرلیا۔ دہلی کی فتح کے بعد رندوں کے ہزاروں خاندان دارالسلطنت کے مضافات میں آباد ہوگئے ۔ بعد ازاں ان میں سے کئی آگرہ کی جانب منتقل ہوگئے اور ''بلوچ پورہ'' بسائی (6)۔ ہمایوں نے شال اور مستنگ لونگ خان بلوچ کو دے دیے (7)۔

ہمایوں کے بعد اکبر کی حکمرانی پورے شمالی ہندوستان اور جنوبی ہندوستان کے نصف (شمالی) حصے پر تھی۔ پنجاب کے بلوچوں نے 1586 میں اس کے دربار میں اس کی حکمرانی مانی (8)۔ اس نے بلوچستان کے تین شہروں،شال، مستنج ،قلات انجیرہ پر خراج عائد کیا جس کی تفصیلات آئین اکبری میں یوں بیان کی گئی ہیں:

اسمائے محال	تومان	دینار	گوسفند،اسپ	خروارغلہ	سوار	پیادہ
قلات نجیرہ	......	......	اسپ 36،اشتر 36	......	500	500
مستنج یا مستنگ	10	8000	......	470	100	500
شال	41/2	......	940 گوسفند	780	100	100

آئین اکبری کے مطابق سبی اکبر بادشاہ کے تحت ملتان کے صوبے میں بکھر کی سرکار کا ایک ضلع تھا اور اسے 13 لاکھ 81 ہزار 9 سو 30 دام (dam) دیتے تھے اور 500 کی کیولری اور 1500 پیادہ فوج دیتی تھی۔ کچھی کا علاقہ بھی اسی میں شامل تھا۔ فتح پور اور گاجان بالترتیب 4 لاکھ 70 ہزار 8 سو 59 اور 6 لاکھ 45 ہزار 2 سو 5 دام دیتے تھے۔ اور ہر ایک 200 گھڑسوار اور 1000 پیادہ دیا کرتے تھے۔ (9)۔

بلوچوں کی پیدا کردہ بدامنی نے شہنشاہ شاہ جہاں کو مجبور کردیا کہ وہ صوبہ ملتان کے انتظامی معاملات کی نگرانی اپنے بیٹے'' شہزادہ'' اورنگ زیب کے سپرد کردے۔ 1106 ہجری میں

اورنگ زیب نے بلوچوں پر حملہ کردیا۔ (شہزادہ کس بات کا؟ از خود شاہزادہ، سردارزادہ، نواب زادہ !!!۔ فرغانہ کے اکھڑے لٹیرے ہمارے بادشاہ بن بیٹھے)۔

مغل دورِ حکومت تک ہمارے ہاں کی وسیع و عریض زمین کی کوئی خاص اہمیت نہ ہوتی تھی۔ کسان کی ملکیت کے بطور تخم اور بیل اہمیت رکھتے تھے۔ قبیلہ اور برادری کی چوکھاٹ میں کسانوں کا معاشرہ تھا۔ کسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے دستکار موجود تھے۔ کسان انہیں جنس کی صورت میں معاوضہ دیا کرتے تھے۔

مغلوں نے ہمارے معاشرے میں جاگیرداروں کا ایک مضبوط طبقہ پیدا کیا۔ ہمارا یہ اوپری طبقہ مغل مرکزی ریاست کی خدمت میں لگ گیا۔ مغل عہد میں یہاں تاجر طبقہ بھی بھرپور انداز میں موجود تھا۔ بابر کی خودنوشت میں لکھا ہے کہ جب بابر کا امیر مہدی کوکلتاش درہ بولان کے راستے سندھ سے ہوکر ملتان جارہا تھا تو شالکوٹ کے مقام پر اس کے کارندوں نے دکانداروں سے معاوضہ دیے بغیر راشن لینے کی کوشش کی جس پر بلوچوں نے ہنگامہ برپا کردیا اور معاہدے کے بعد ہی مغل اور بلوچ تاجروں کے تعلقات بہتر ہوگئے۔

اس عہد میں یہاں زبردست معاشی ترقی ہوئی۔ کھیتی باڑی کو فروغ حاصل ہوا۔ دستکاریاں فروغ پاگئیں اور جاگیرداری نظام مضبوط تر ہوتا گیا۔ گوکہ غلام داری موجود تھی مگر یہ زیادہ تر گھریلو غلامی تھی۔ اگر ایک طرف سکھ مذہب کا ابھار تھا اور مہدوی تحریک کا فروغ تھا تو ہمارے شمال مغرب میں روشان تحریک تھی۔ روشان تحریک کے حامیوں نے جاگیردار طبقے کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ اس زبردست کسان تحریک کو کہیں جاکر سترھویں صدی میں ختم کیا جاسکا۔

فوجی خدمت کے عوض جاگیر عطا کرنے کا جو نظام بلوچوں میں مغلوں نے رائج کیا تھا، اس سے طاقتور باجگزار سردار داخلی طور پر مزید طاقتور ہوگئے۔ یہ مقامی حاکموں کی حیثیت رکھتے تھے مگر تھے مغل ملازم۔ انہوں نے آگے بڑھ کر خودمختار حکمران بننا تھا، اور پھر انہی کے آل اولاد نے جاگیرداری سے ترقی کرکے بورژوا سماج میں داخل ہونا تھا۔

مگر سچی بات یہ کہ جاگیرداری نظام موجود رہا اور یہی نظام طاقتور ہوتا گیا۔ اس کے لئے

بلوچستان میں دو بڑی وجوہات بنیں۔ ایک تو ہمارا کمبخت خود کفیل دیہی معاشرہ آگے نہ جاتا تھا، اور دوسرا یہ کہ جب بھی ہماری یہ خود کفالت ذرا سی آگے کو حرکت کرتی تو پھر کسی غیر ملکی حملہ آور کا ڈنڈا ہم پہ پڑ جاتا۔ ہماری معاشی اور طبقاتی ترقی دوبارہ معکوس ہو جاتی۔ ہم جاگیرداری کے مندر کے گرد ہی طواف کرتے رہے۔

ہم اس دور کے بارے میں بس دو تین فقرے اور لکھیں گے۔ اس کے زمانے میں نچلا طبقہ تین مختلف حصوں پر مشتمل تھا:

(1) کسان (2) تاجر، دستکار اور موسیقار (3) غلام۔

سارے مشقتی خدمات غلاموں کو بجالانے تھے۔ تاجروں، دستکاروں اور موسیقاروں کے پیشے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان پیشوں سے وابستہ لوگ ہندو، لوہار اور ڈومب ہوا کرتے تھے جو غلاموں کے برعکس آزاد تھے (10)۔

حوالہ جات

1۔ لطیف، ''تاریخ پنجاب''، صفحہ نمبر 273۔

2۔ قانون گو، کالکا رنجن۔ شیر شاہ سوری اور اس کا عہد۔ 1996 تخلیقات۔ لاہور۔ صفحہ 459

3۔ قانون گو، صفحہ نمبر 469۔

4۔ گلبدن بیگم / پروفیسر سید حسن، ''ہمایوں نامہ''، صفحہ نمبر 56۔

5۔ ڈیمز، ل۔ و، ''پاپولر پوئٹری آف بلوچیز'' صفحہ نمبر 33۔

6۔ گشکوری، ''چاکر اعظم''، صفحہ نمبر 183۔

7۔ گزیٹیئر کوئٹہ پشین، 1986، گوشۂ ادب کوئٹہ، صفحہ نمبر 33۔

8۔ پال ٹائیٹس، Tribalism, Ethinicity, and the state in Pakistan Balochistan, December 1991 صفحہ نمبر 60۔

9۔ کچھی گزیٹیئر، صفحہ نمبر 136۔

10۔ شلز، فریڈ۔ نومیڈزم اینڈ کالونیلزم۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس 2002۔ صفحہ 59

5۔ باغار سر

موجودہ مری بگٹی علاقے میں ایک زمانے میں گورگیژ، کلمتی اور بلیدی رہتے تھے۔ کلمتی اب مغربی بلوچستان میں رہتے ہیں۔ اُن کے بارے میں یا تو لوگ سینہ بہ سینہ والی باتیں دہراتے ہیں یا پھر ماوند کے قریب ''باغار سر'' نامی جگہ پر ان کی نشانیاں اور آثار اُن کی ہستی کا ثبوت دیتی ہیں۔ لیکن اب تو وہ آثار بھی پچھلے برسوں زراعت والے بلڈوزر نے ملیا میٹ کر دیئے ہیں۔ (اس پاپی پیٹ کو اللہ ہی معاف کر سکتا ہے، غفار اور رحیم جو ہے)۔

بلوچ کلاسیک میں یہ کلمتی قبیلہ ایک اور قبیلے سے لڑ پڑتا ہے جسے ہماری شاعری میں ''بلمتی'' کہا گیا ہے مگر اس نام کا کوئی قبیلہ آج میری معلومات میں موجود نہیں ہے۔ گمان یہ ہے کہ یہ ''بلفتی'' ہونگے۔ یہ لوگ بھی اب مری بگٹی میں نہیں ہیں بلکہ لسبیلہ میں رہائش پذیر ہیں۔ کلمتی اور بلمتی ''باغار'' نامی رینگنے والے جانور کے اوپر آپس میں لڑے تو ہیں مگر وہ ماوند میں لڑے ہیں مکران میں نہیں۔ اس لئے کہ ایک پورا علاقہ اُن کی جائے رہائش اور پھر ''باغار'' کے اوپر لڑائی کی وجہ سے ''باغار سر'' کے نام سے آج بھی موجود ہے، ماوند میں۔ مگر یہ دونوں قبیلے مشرقی بلوچستان سے گم ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ باغار نامی جانور پر ان دونوں قبیلوں کی جنگ لسبیلہ میں ہوئی تھی اور یہ کہ یہ جڑواں قبیلے کلمتی اور بلفتی تھے۔ سردار خان گشکوری کے حساب کتاب میں یہ لڑائی چاکر کی بلوچستان سے روانگی سے تقریباً 40 برس بعد سندھ کے ارغون حکمران شاہ حسین ولد شاہ بیگ کے دور میں لڑی گئی (1)۔ اس لڑائی میں سو افراد مارے گئے۔ دونوں تھک گئے، وطن چھوڑ دیا۔ اٹھارویں صدی کے ایک گمنام شاعر نے اس قصہ کو شاعری میں بیان کیا تھا (دیکھیے کتاب، بلوچی زبان و ادب)۔

حوالہ جات

1۔ بلوچ، سردار خان۔ 1977۔ لٹریری ہسٹری آف دی بلوچ۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ جلد نمبر 1۔ صفحہ 401

باب ہشت

سرقبیلوی نظام کے پیٹ میں فیوڈل ازم کا فروغ

(ریاست کی باقاعدہ تشکیل)

1۔ احمدزئی

پندرہویں صدی سے لے کراٹھارویں صدی تک بلوچ سماج ایک ایسی تبدیلی سے گزرا جس میں کہ زراعت، شخصی ملکیت میں چلی گئی اور قبیلوں کے حاکم لوگ قبیلے کی قوت وتنظیم کی سیڑھیاں استعمال کرتے ہوئے فیوڈل لارڈز میں ڈھلنے لگے۔

بلوچ قبیلوں کی جانب سے زمین پرآباد ہوجانے کا عمل سولہویں صدی کے آخر تک مکمل ہوا اور زرعی معیشت متشکل ہونے لگی۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خانہ بدوشی یا سرقبیلوی نظام مشینی انداز میں یکدم مکمل طور پر ختم ہوا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ زمین پرآباد ہونے والوں میں بھی ،اور مالداری میں مشغول بلوچوں میں بھی ، بہت عرصہ تک (اور کچھ حالتوں میں آج تک)خانہ بدوشی جاری تھی۔

قلات میں تیرہویں صدی کے وسط تک مغلوں کے نائب' حکومت چلاتے رہے ۔1666 میں میرواڑی قبیلے کے فیوڈل ان کیخلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کے گیریزن تباہ کر کے قلات پر قابض ہو گئے ۔اس قبیلے کے میر احمد نے اقتدار سنبھال لیا اور یہاں احمدزئیوں کی حکومت قائم کی۔

بلوچستان میں خان کا خطاب دراصل منگولوں سے آیا۔منگول کے حاکم قاآن (کاغان ،خاکان)یا خان کہلاتے تھے ۔ بعد میں جب منگول بادشاہی بڑھ گئی تو صوبوں کے حاکم خودکوال

خان (نائب خان) کہلانے لگے۔

خانی کے عہد میں (1666-1840) قلات ایک موثر آزاد خانی سلطنت میں ڈھل گیا ۔اس عبور میں ایک ایسی مقامی ارسٹوکریسی شامل تھی جس کی معاشی بنیاد تو بڑھتی ہوئی زراعت تھی مگر جس کے نمایاں ہونے کے ذرائع قبائلی طور پر منظّم کردہ خانہ بدوش مویشی بانی پر مبنی تھے ۔(1) اس دور میں خان اور سرداروں کے درمیان رشتہ بہت ہی ڈھیلا ڈھالا اور کمزور تھا۔ ہم کچھ اہم خوانین کا تذکرہ کریں گا، مگر بلوچ تاریخ کا اپنا سفر جاری رکھیں گے:

میر احمد(1666-1695): میر احمد ثانی نے عدالتی اخراجات کے نام پر ''مالی'' نام کا ایک ٹیکس جاری کیا۔ جس کے تحت ہر شادی شدہ شخص پانچ روپے سالانہ یا اس کے برابر اناج یا مال مویشی کی صورت میں اپنے قبیلے کے سردار کے پاس جمع کروائے۔(2) (اُس وقت کے پانچ روپے!!)

قلات کے اس خان نے زراعت کو ترقی دینے میں خصوصی دلچسپی لی ۔اس نے کاریزات کو ترقی دی۔ خضدار کی ندی سے کئی نالے نکال کر پانی کو بنجر زمینوں تک پہنچایا۔ اس نے اپنے دورِ حکمرانی میں موضع کوہنگ قلات میں کاریز ملاورد، کاریز یوسف اور کاریز عثمان کھدوائے۔

اسی خان کے دورِ حکومت میں خشکابہ زمین کے مالکانہ حقوق پر مالک اور کاشتکاروں کے درمیان ایک جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ جھگڑا یہ تھا کہ اراضی کی آمدن سے فیوڈل کو کتنا حصہ ملے اور کسان کو کتنا ۔خان نے خشکابہ بندات کی آبادکاری کے چھ حصے مقرر کر دیے: ایک حصہ پانی، ایک حصہ زمین کی دیکھ بحال، ایک حصہ تخم، ایک حصہ ہل' ایک نگرانی اور ایک حصہ حق مالکانہ۔ چونکہ بندات کی کاشت میں پانی دینا، بندوں کی دیکھ بحال' تخم ریزی، ہل چلانا اور فصل کی نگرانی یہ سارے پانچوں کام کسان کے تھے، اس لئے پانچ حصے اُس کے ہوگئے اور مالک مفت میں ایک حصہ لیتا تھا جسے انہوں نے حق مالکانہ قرار دیا تھا۔(3) اسی چھٹے حصے کو بدنامِ زمانہ ''ششک'' کہتے ہیں۔(بلوچی میں شش چھ کو کہتے ہیں)۔

میر احمد نے 1667 کو گورنر قندہار، آغا جعفر مغل کو شکست دی اور مستنگ، کوئٹہ اور پشین کو

مغلوں سے چھین کر اپنی مملکت میں شامل کرلیا۔ اس کے دورِ حکومت میں ریاست پشین کوئٹہ مستنگ خاران کے علاقوں، کچھی کے شمالی علاقوں، نوشکی اور جھالاوان پر مشتمل تھی۔(4)

اِس میر احمد خان اول نے 29 سال حکومت کی اور 1695 میں قلات میں وفات پائی۔(5)

خان میر احمد اور سبی و کچھی کے پٹے دار حاکم جیند خان باروزئی (لقب نواب بختیار خان) کے درمیان 18 لڑائیاں ہوئیں ۔ یہ لڑائیاں 1669ء میں شروع ہوئیں اور 1687ء تک جاری رہیں۔(6) بالآخر 29 مارچ 1687ء میں قلات میں صلح ہوئی، جس میں یہ بات شامل تھی کہ موسم سرما میں بلوچستان کے پہاڑی علاقوں سے آئے ہوئے لوگوں کو سیبی اور کچھی کے میدانی علاقوں میں مال چرائی کی اجازت ہوگی۔ باروزئی خان قلات کا وفادار اور خیر خواہ ہوگا۔ بیرونی حملہ آور کی صورت میں خان کی مدد کرے گا۔

محراب خان: میر احمد خان کے بعد اس کا بیٹا محراب خان تخت پر بیٹھا۔ اس نے دو سال حکومت کی اور 1697 میں کلہوڑوں کے ساتھ لڑتا ہوا ''کرخ'' کے مقام پر قتل ہوگیا۔

سخی سمندر خان: محراب خان کے بعد اُس کے بھتیجے سمندر خان کو خان بنایا گیا۔ اُس کی حکومت 1714 تک رہی۔ چونکہ وہ بہت سخی تھا اس لئے اسے ''سخی سمند خان'' کہتے تھے۔

اُسی خان کے زمانے میں شہنشاہ ایران نے بلوچ ریاست کو اپنے ملک کا حصہ سمجھنے کے زعم میں اپنے سپاہ سالار طہماسپ بیگ کو 25 ہزار کا لشکر دیکر چڑھائی پہ بھیجا۔ میر سمندر خان نے سریاب و مستنگ کے درمیان ہزار گنجی کے مقام پر خوفناک جنگ کے بعد ایرانی لشکر کو شکست دی اور طہماسپ بیگ کو اپنی تلوار سے قتل کیا۔

سخی سمندر خان اٹھارہ سال حکومت کرنے کے بعد 1714 میں قلات میں وفات پا گیا۔(7)

عبداللہ قہار سخی سمندر کے بعد عبداللہ (1714 ......1734) خان بنا۔ وہ قوی الجثہ

بہادر اور خوبصورت جوان تھا۔ انگریز اسے'' عبداللہ دی کنکرر''، کہتے تھے جبکہ میدانی لوگ اسے'' پہاڑی عقاب''، اور شاعر اُسے'' قہار'' کے لقب سے جانتے ہیں۔(8)

میر گل خان نے لکھا کہ تین خان (عبداللہ خان، محبت خان اور نصیر خان اول) بلوچی کے مشہور شاعر رہے۔ خان عبداللہ خان کے یہ اشعار تو ہر عام وخاص کو زبانی یاد ہیں:

کوہنگ و اے کوھیں کلات
کسی پشہ میراث نیاں
ما پہ سغاراں گپتغاں

ترجمہ:

کوہنگ اور یہ پہاڑ جو قلعے ہیں
کسی کے باپ کی ملکیت نہیں ہیں
ہم نے انہیں تلواروں سے حاصل کیا ہے (9)

خطہ بلوچستان میں سے ایک مستقل بین الاقوامی تجارتی شاہراہ گزرتی تھی۔ ایک تجارتی راستہ جنوبی افغانستان کے شہر قندھار سے' اور دوسرا تجارتی راستہ مشرقی ایران سیستان سے بلوچستان کے دارالخلافہ قلات میں آ کر ملتے تھے۔ یہاں سے یہ تجارتی راستہ خضدار، وڈھ اور بیلہ سے ہوتا ہوا سونمیانی کی بندرگاہ پر اختتام پذیر ہوتا تھا۔ لہٰذا بلوچستان کے اپنے تجارتی مال کے علاوہ جنوبی افغانستان اور مشرقی ایران کا تجارتی مال اسی راستے سے دنیا کے کونے کونے میں جاتا تھا اور وہاں کا مال اسی راستے سے جنوبی افغانستان اور مشرقی ایران جاتا تھا۔ اس بین الاقوامی راستے پر سال کے بارہ مہینے تجارتی قافلوں کی ریل پیل رہتی تھی اور اسی راستہ کی ریل پیل ہی کو جاری رکھنے کیلئے جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔

جب مغل اقتدار زوال پذیر ہوا تو قلات کے احمد زئی فرمانرواؤں نے خود کو کسی حد تک بیرونی مداخلت سے آزاد پایا۔ عبداللہ جو کہ نور محمد کلہوڑا کا ہم عصر تھا، نے کچھی کی طرف توجہ کی اور ایک فوج جمع کر کے کچھی پر حملہ کر دیا جو کہ کلہوڑوں کی سلطنت کا حصہ تھا اور ان کے نائب مراد گنجاہ

کے تحت تھا۔ جھالاوان کے لوگوں اور التازئیوں کو درۂ مولا کے ذریعے گنداواہ پر حملہ کرنے کا حکم تھا جبکہ میر عبداللہ خود بولان کے ذریعے کچھی کے میدانوں میں اترا۔ ڈھاڈر فتح کیا گیا اور لوٹا گیا۔ اور خان سنی کے قریب'' جندری ہڑ'' نامی مقام کی طرف بڑھا۔ جھالاوان کی فوج کے آن ملنے سے قبل ہی گنداواہ کا نائب اس کے مقابلے میں آیا جس کے پاس سندھ اور کچھی کی موجود ساری فوج تھی۔ جندری ھڑ میں زبردست لڑائی ہوئی اور خان مارا گیا۔ یہ 31-1730 کا واقعہ ہے۔

یہاں قلات کی فوجی ساخت کے بارے میں یہ ذکر ضروری ہے کہ خان میر واول نے 1410ء میں بلوچ قبائل پر مشتمل اولین فوج تشکیل دی جس کے تین دستے تھے۔ سراوان دستہ' جھلاوان دستہ' اور خاص دستہ۔ اس فوج کا تیسرا حصہ باری باری تین مہینے کیلئے قلات (جو کہ دارالخلافہ تھا) کی حفاظت کیلئے آ کر اپنا کام سنبھالتا (10)۔

خوانین قلات میں پہلی شاہی مہر میر عبداللہ خان نے رائج کی۔ اس کی مہر پہ یہ شعر کندہ تھا:

حاکم وقت ظل سبحانی
عبداللہ خان سکندر ثانی (11)

اس وقت تک یعنی اٹھارویں صدی تک بلوچ سر قبیلوی نظام کی چوکھاٹ میں ایک طبقاتی فیوڈل معاشرہ وجود میں آ گیا۔ اب ہزاروں لوگ دیہی مزدور بن گئے تاکہ زائد پیداوار کر سکیں۔ ایک قبائلی گھرانہ پورے قبیلے کیلئے ہمیشہ سربراہ مہیا کرتے رہنے کا گھرانہ بن گیا۔ اس فرقے کا ایک شخص تو سردار ہوتا ہی تھا مگر اس کے عزیز و اقارب اور فرقے کے دیگر ممبر بھی حکمران ہوتے تھے۔ وہ سردار کیلئے ٹیکس، عطیات اور ریونیو اکٹھا کرتے تھے۔ اس طرح انتظامی بالائی ڈھانچہ کی اجارہ داری بن گئی۔ اسی انتظامی بالائی ڈھانچہ نے قبائلی طرز پیداوار سے فیوڈل نظام پیداوار کی طرف عبور کی نگرانی کی۔ گو کہ عبور کی یہ رفتار بہت سست تھی۔

محبت خان: (1737 تا 1749): میر عبداللہ خان کا بڑا بیٹا تھا، لہٰذا وہی خان کہلایا۔

2۔ نادرشاہ افشار اور بلوچ

اٹھارویں صدی کے پہلے حصے میں نادر شاہ اور پھر احمد شاہ نے بلوچستان پر (اور یا بلوچستان میں سے ہوکر) کئی مہمات سر کیں، جن کے نتیجے میں دور دور تک ان کی سلطنت قائم ہوئی۔

نادر قلی کا تعلق ایک ترکمن قبیلے، افشار سے تھا۔ وہ 1688ء میں خراسان کے دارالحکومت مشہد کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام امام قلی تھا جو افشار قبیلے کا سردار اور مذکورہ قلعے کا حاکم تھا۔ نادر قلی کا باپ اُس کی کم سنی میں مرگیا تو اس کے چچا نے قلعے کی کمان سنبھالی۔ مگر جب نادر بڑا ہوا تو اس کے چچا نے اس کا موروثی حق یعنی کمان اس کے حوالے نہ کی۔ تب نادر مشہد چلا گیا۔ وہ وہاں بیگلر بیگ کی ملازمت میں بحیثیت ''نائب منتظم تقریبات'' شامل ہوا۔(12)۔

نادر نے اپنے اولین حملوں میں مشہد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے خراسان کو ابدالیوں سے بازیاب کرالیا......مہم جو نادر نے جائز وارث طہماسپ کے سر پر بادشاہی تاج رکھ دیا۔ خدمات کے صلے میں اسے خراسان، مازندران، سیستان اور کرمان کی صوبیداری عطا کی گئی۔ نادر نے ''خان'' کے اضافی نام کے ساتھ قلی (طہماسپ کا غلام) کا لقب اختیار کیا۔

1721ء میں چار ہزار بلوچوں نے بندر عباس پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے وہاں پر انگریزی اور ولندیزی فیکٹریوں میں گھسنے کی کوشش کی مگر انہیں بری طرح مار بھگا دیا گیا۔ اور بلوچ شہہ سوار بہت سی لاشیں چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوئے۔(13)۔ 1736ء کے موسم خزاں تک نادر شاہ مسلسل کبھی ترکی کے ساتھ محاذ آرائی میں اور کبھی محمد خان بلوچ کی بغاوتیں کچلنے میں مصروف رہا۔(14)

جب نادر شاہ کی فوجیں پیر محمد اور الماس خان کی سرکردگی میں 1736ء میں بندر عباس اور مکران کے ساحل سے بلوچستان میں داخل ہوئیں تو خانِ قلات میر عبداللہ خان کے بڑے بیٹے میر محبت خان نے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر اسے شکست ہوگئی۔ دونوں ایرانی جرنیل اس کے بعد شال (کوئٹہ) پہنچے۔ وہاں سے انہوں نے قلات کا رخ کیا۔ ان کی فوج کو اس دفعہ پانی کی قلت کا سامنا رہا۔ لیکن پیاسے ایرانیوں نے بڑی بے جگری سے میر محبت خان کی فوج کو ایک بار پھر شکست دی۔ اب محبت خان اپنے قلعے مستنگ کو فرار ہو گیا اور مزید مزاحمت ترک کر دی(15)

اس دوران نادرشاہ نے قندھار فتح کر لیا۔ حملہ آوروں کی مزاحمت کا خیال چھوڑ کر محبت خان نادرشاہ کے پاس قندھار جا کر سلامی ہوا۔ نادرشاہ نے محبت خان کو قلات کا ناظم مقرر کیا اور اس کیلئے سب سے بڑے خطرے یعنی التاز خان اور اس کے کم سن بھائی نصیر خان اور اس کی والدہ مریم اور ان کے طرفداروں کو بطور یرغمال ایرانی دربار میں رکھنے پر تیار ہوگیا۔(16) تاکہ میر محبت خان ان مخالفین سے ہمیشہ کیلئے چھٹکارا حاصل کرے۔ اُن کے علاوہ سلطان زہرو خان بنگلزئی اور ملا محمد علی بھی یرغمال ہوکر نادرشاہ کے پاس پہنچا دیے گئے۔

ن دونوں بھائیوں کی اطاعت کے باوجود بلوچستان میں مزاحمت کم نہ ہوئی اور پیر محمد اور الماس خان کو مزید کچھ عرصہ وہاں مصروف پیکار رہنا پڑا۔ ایک طویل محاصرے کے بعد قلعہ جالک فتح ہوا۔(17) چنانچہ 1738ء کے اوائل تک بلوچستان کا بہت بڑا علاقہ پوری طرح زیرنگیں ہو چکا تھا (18)۔

1739ء میں نادر شاہ نے اپنے جنرل، تقی خان کو مکران کے راستے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ گوادر بلیدیوں سے چھن کر ملک دینار گچکی کے ہاتھوں میں آ گیا۔ گچکی بلیدیوں کی طرح ذکری ہی تھے۔ وہ علاقے کے مالک ہو گئے۔ ایک شاخ نے پنجگور سنبھال لیا اور دوسری کیچ اور گوادر کا حاکم بنی۔

فروری 1739ء میں کرنال کے مقام پر ایرانی اور ہندوستانی فوجوں کے درمیان لڑائی میں نادرشاہ جیتا اور دہلی پہنچ گیا۔ دہلی میں قتل عام کے بعد غارتگری اور لوٹ مار کا طوفان مچا۔ شاہی خزانہ نادرشاہ نے لوٹ لیا۔ سرسری اندازے کے مطابق لوٹ مال کی مالیت یہ تھی:

1۔ نقد ساٹھ لاکھ

2۔ سنہری اور روپہلی ظروف مالیت ایک کروڑ

3۔ جواہرات پچاس کروڑ

امرا، جن سے روپیہ لیا گیا:

1۔ اعتمادالدولہ وزیراعظم 30 لاکھ

2۔ آصف جاہ 30 لاکھ

3۔ سعادت خان ایک کروڑ

تاریخی نوادرات میں دو چیزیں شامل تھیں:

1۔ کوہِ نور

2۔ تختِ طاؤس (19)

جب اگلے سال یعنی 8 مارچ 1740ء میں نادرشاہ افشار لاڑکانہ پہنچا تو بی بی مریم نے نادرشاہ کی خدمت میں عرض کیا کہ کلہوڑہ امیر، میاں نور محمد خان نے اس کے خاوند امیر عبداللہ کو ناجائز قتل کیا۔ اس کا خون بہا دلایا جائے۔ نادرشاہ نے کچھی اور سیوی کا علاقہ عبداللہ خان کے خون بہا میں میر محبت خان کو دے دیا۔ اس طرح کچھی اور سیوی کا سیاسی تعلق اور انتظامی بندوبست واپس بلوچستان کو منتقل ہو گیا۔ چونکہ میر عبداللہ خان کے ساتھ سراوان دستہ کے کئی ایک سردار اور ان کے قبائل کے لوگ 11 فروری 1731ء کی جنگ بمقام چندری ہڑ کام آئے تھے، لہٰذا ان سب کا خون بہا دینا لازمی تھا۔ اس لئے محبت خان نے کچھی کو تین حصوں میں تقسیم کر دیا:

(i) ایک حصہ خان عبداللہ خان کے خون بہا میں عبداللہ خان کی ملکیت قرار دیا۔

(ii) دوسرا حصہ اُن قبائل کیلئے مخصوص کر دیا گیا جنہوں نے اگرچہ اس لڑائی میں عبداللہ خان کے ساتھ شرکت نہیں کی تھی مگر ان کی گذشتہ خدمات زبردست تھیں۔ یہ حصہ بھی خان کے قبضہ میں رہا جسے خان اپنی صوابدید کے مطابق دوسرے سرداروں اور ان کے قبائل یا خاص افراد کو وقتاً فوقتاً ان کی اہم جنگی خدمات کے صلے میں انعام کے بطور دیتا رہا۔

(iii) تیسرے حصہ کو بطریقِ ذیل قبائل سراوان پر تقسیم کیا گیا۔

کیوں کہ خان عبداللہ کے ساتھ اس آخری جنگ میں صرف سراوان کے قبائل تھے۔ جھالاوانی لشکر آخری دم تک کچھی نہیں پہنچ سکا تھا، اس لئے قبائلِ جھالاوان کو کوئی زمین بعوض خون بہا نہیں دی گئی۔ خان محبت خان نے سراوان قبائل میں کچھی کا علاقہ اس طرح تقسیم کیا:

1۔ قبیلہ رئیسانڑیں کے خون بہا میں موضع مٹھڑی

2۔ شاہوانڑیں کے خون بہا میں موضع حاجی

3۔ قبیلہ لہڑی کے خون بہا میں موضع ہانبی

4۔ قبیلہ بنگلزئی کے خون بہا میں موضع چندڑ

5۔ قبیلہ رودینی کے خون بہا میں موضع تاج

6۔ قبیلہ محمد حسنی کے خون بہا میں کوگڑو

7۔ محمد شہی کے خون بہا میں موضع زرداد

پانچ ہزار میل کے اس نئے علاقے نے قلات میں گویا ایک معاشی انقلاب برپا کر دیا۔ زرعی اجناس کی صورت میں قلات کو زبردست آمدن حاصل ہوتی رہی اور خانی بہت مضبوط ہوتی گئی۔ اس کے علاوہ زراعت میں ایک اہم نوع در آئی۔ کچھی میں دریاؤں پر بند باندھ لئے جاتے تھے جبکہ خود قلات میں سیلابی نالوں کے علاوہ ''کاریز'' آبپاشی کے بڑے ذرائع تھے۔

کچھی میں سیلابی پانی سے آبپاشی ہوتی تھی۔ دریا کے کناروں پر آباد ہر گاؤں نے مٹی کا ایک بند باندھ رکھا تھا تاکہ سیلابی پانی کو روکا جائے۔ جب ان کی زمینیں سراب ہوتی تھیں تو وہ یہ بند توڑ دیتے تھے تاکہ نچلے گاؤں کے زمینداروں کا بند بھر جائے اور وہ بھی نالے نکال کر اپنی زمینوں کو سراب کر سکیں۔ یہ زبردست محنت کا کام تھا۔ 100 جوڑے بیل پورا ماہ کام کرتے تھے۔ اس سالانہ عمل کی نگرانی گاؤں کے بڑے افسر کرتے تھے جن کے پاس بڑی بڑی زمینیں تھیں۔ یہ افسر موروثی ہوا کرتے تھے۔

کچھی میں کئی فصلیں کاشت ہوتی تھیں۔ سیلابی زمینوں پر تو کپاس، دالیں اور تیل کا بیج کاشت ہوتے تھے۔ جبکہ کپاس، نیل، گندم، جوار اور میوہ وسبزیاں محدود مستقل پانی والے علاقوں میں ہوتی تھیں۔ تقسیمِ کار اور تقسیم پیداوار بہت پیچیدہ اور مختلف ہوا کرتا تھا۔ خرچے کی بابت عموماً کسان بیج بھی دیتا تھا، ایک بیل کا جوڑا بھی اور جانوروں کی غذا بھی۔ فصل کی پیداوار تین حصوں میں یعنی فرمانروا، زمین کے مالک اور کسان میں تقسیم ہوتی تھی۔ فرمانرواؤں میں احمد زئی 'قبائلی سردار' اور قبیلے کے فرقوں کے بڑے آتے تھے۔

چھوٹے قطعات پر زمین کا مالک خود ہی کاشت کیا کرتا مگر بڑی بڑی زمینوں والے لوگ بزگر رکھا کرتے تھے۔ ارباب اور رئیسوں کے علاقے میں جٹ، کاشتکار ہوتے تھے۔

بہت سی صورتوں میں ملکیت کے حقوق بلوچوں کو منتقل ہوئے یا انہوں نے قوت سے حاصل کیے۔ لہٰذا ڈومبکی اور مغیری بالترتیب لہڑی اور بھاگ کے قریب جلال خان کے علاقے کے مالک بنے، کہیری چھتر پلیجی کی ملکیت کا دعویٰ کرنے لگے اور مگسی سردار اپنے قبائلی علاقے کا واحد دعوے دار بنا۔ چنانچہ مالک نے دیکھا کہ اس کے پاس خود کاشت کرنے سے زیادہ زمین آ گئی ہے اور بڑے بڑے بند باندھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ چنانچہ یوں ہونے لگا کہ مالکوں نے زمین کاشتکاروں کو دی جنہیں آبادکار، راھک یا لٹ بند کسان کہتے تھے۔ ان کے ساتھ معاہدہ اس وقت تک رہتا جب تک وہ بند یا گنڈھا سلامت رہتا۔ اس کے ٹوٹنے پر معاہدہ بھی ختم ہو جاتا تھا۔(20)

اس محنت طلب نظام آبپاشی نے ہر گاؤں کو ایک اجتماعی پیداواری یونٹ بنا دیا تھا۔ اس کی بنیاد پر اناج کی تقسیم (بٹائی) ہوتی تھی۔ جہاں بڑے بڑے حصے تو حاکم لوگوں مالکوں اور کاشتکار کے ہوتے تھے مگر آبپاشی کے خرچ کا حصہ، ریونیو حکام کا حصہ اور گاؤں کے سپیشلسٹوں کا حصہ بھی الگ کیا جاتا تھا۔ حاکم لوگ فصل میں سے اپنا حصہ پہلے لیتے تھے۔ اس طرح انتظامیہ اور آبپاشی کا خرچہ گاؤں والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔

یوں کچھی نے خانی کو قبائلی کی بہ نسبت ایک فیوڈل سلطنت کی طرف دھکیلنے میں فیصلہ کن کردار ادا کیا۔

3۔ پیٹر دی گریٹ، نصیر خان نوری

18 جولائی 1783 میں قندھار میں نادر ترکمن کی یرغمالی کے دوران ہی اھلتاز خان اور نصیر خان کے درمیان دربار کے اندر ایک مسئلہ پر تلوار سونت لینے کی نوبت آئی اور ایلتاز خان خود اپنے بھائی نصیر خان کی تلوار سے قتل ہوا۔ درباریوں کی سفارش کی بدولت نادر نے نصیر خان کو معاف

کیا۔ 9 سال تک میر نصیر خان نادر شاہ کے سفر وحضر میں اس کا خاص آدمی تھا۔ اسی دوران احمد خان ابدالی بھی نادر شاہ کے حضور میں ایک معتبر شخص تھا۔

ہندوستان سے واپسی کا سفر نادر شاہ نے گنداواہ اور سبی کے راستے درۂ بولان کی طرف سے کیا۔ ہولناک دشتِ بے دولت، شال اور پشین سے ہوتے ہوئے نادر اپنے ہیڈ کوارٹر کو چلا گیا۔(21)

نادر شاہ کے دربار میں گیارہ سال (1736-1747) گزارنے کے دوران نصیر خان نے بہت کچھ سیکھا۔ وہ اس کی فتوحات میں اس کے ساتھ رہا۔ اس کے ساتھ اس نے بے شمار مصائب جھیلے۔ ان مصائب نے اسے جفاکش اور مستقل مزاج بنا دیا۔ اس نے محمد شاہ رنگیلا کی ذلت' دہلی کا قتل عام، جنگ میں نادر شاہ کی بہادری اور ٹیکنیک، اور اس کی فوجوں کی ساخت کا اچھی طرح مشاہدہ کیا۔ یہیں پر وہ احمد خان ابدالی اور شاہ ولی خان سے واقف ہوا۔ شاہ ولی خان جو احمد کی حکمرانی کے زمانوں میں مقتدر وزیر اور ''اشراف الوزرا'' کے لقب سے نوازا گیا تھا، میر نصیر خان کا بہت بڑا حامی تھا۔(22)

دراصل 17 ویں صدی کے آخری نصف سے جب میر احمد خان نے کنفیڈریسی کی بنیاد رکھی تھی تو بلوچ سماج میں ایک سیاسی صورت وجود میں آ گئی تھی۔ اس طرح قبیلوی ارسٹوکریسی کے عنصر نے بڑھنا شروع کر دیا۔ قبیلوی ڈیموکریسی کمزور ہوتی گئی اور اس کی جگہ پر سرداری نظام مستحکم ہوتا گیا۔ بلوچ سماج میں فیوڈل نظام کی عظیم الشان بلوغت نے سارے بلوچ عوام کو نا ترسی کے ساتھ دولت پیدا کرنے پر لگا دیا۔ میر احمد خان کے نواسے میر نصیر خان کو سرمایہ کے اسی ارتکاز نے زبردست حاکم بنوایا۔ اسی دولت اور سرمایہ پر ایسی ہی فیوڈل ریاست ابھرنی تھی۔ اس نے احمد شاہ کے ساتھ مل کر ہندوستان فتح کر لیا اور بلوچستان کو خوب ترقی دی۔

یہاں احمد شاہ ابدالی کا تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا۔ احمد خان، سدوزئی قبیلے کے سربراہ زماں خان ابدالی کا بیٹا تھا۔ وہ 1722ء میں ملتان میں پیدا ہوا۔ جوان ہو کر نادر شاہ کا آلہ کار بنتے ہوئے وہ اس کی ملک گیری و توسیع پسندی کی ہوس میں سرگرم حصہ لیتا رہا۔ اس کی بے پناہ وفاداری سے متاثر ہو کر نادر شاہ نے اسے اپنے پرسنل سٹاف میں شامل کر دیا۔ جس کے بعد احمد خان کو شاہ کے

ذاتی محافظوں کا سربراہ بنا دیا گیا۔اس نے اپنے آقا کی خدمت اس قدر وفاداری، جان نثاری اور دلسوزی سے کی کہ نادر شاہ نے اسے اپنے شاہی حرم سرا کے دروازے پر متعین کیا۔(23)

نادر شاہ افشار کو جون 1747ء میں قتل کر دیا گیا۔اس کی موت کے بعد جب اس کے سپہ سالار ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے تھے تو میر نصیر خان، امیر کمال خان التازئی، سردار زہرو خان بنگلزئی، داروغہ مہر علی، اور علی خان داروغہ اپنے دیگر تین چار سو بلوچ یرغمالیوں کے ساتھ مشہد سے شیراز کی طرف روانہ ہوئے۔وہاں سے کیچ اور آب ندی میں پڑاؤ کیا۔نصیر خان بلوچستان میں اپنے بھائی محبت خان کی جگہ تخت پر بیٹھا۔

ادھر احمد خان نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد خراسان کے ایک بہت بڑے علاقے میں سے زبردستی راستہ بنایا اور قندہار کے مضافاتی علاقوں کو تاخت وتاراج کیا۔وہاں 30 لاکھ روپے کا خزانہ جو نادر شاہ کے ہمراہ تھا اس کے ہاتھ لگا۔1747 میں ابدالی، قزلباش، بلوچ اور ہزارہ سرداروں کے تعاون سے 23 برس کی عمر میں ''احمد خان'' نے ''احمد شاہ'' کے لقب سے قندہار کے بادشاہ کے طور پر اپنی تاجپوشی کروادی۔پھر اس نے غزنی میں نادر کے زمانے کے حاکم کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔کابل اور پشاور فتح کرنے کے بعد اس نے پھرتی سے دریائے سندھ کو عبور کیا اور شاہی فوجوں کو اٹک اور پنچ سے نکال باہر کر دیا۔(24)

اپنے 26 سالہ عہدِ حکومت میں احمد شاہ نے اپنی سلطنت کو ہندوستان پر سات یا آٹھ حملوں کے ذریعے مضبوط بنایا۔ان حملوں سے اس کے خزانوں میں دولت آئی، مزید حملوں کے مواقع ملے اور سلطنت وسیع ہوتی گئی۔

نصیر خان اِن سارے تجربات سے گزر کر کندن بن چکا تھا۔بالخصوص عسکری امور میں اس نے کمال حاصل کیا تھا۔

قلات خانیٹ میں غمِ لشکر ایک مقرر کردہ فوجی امداد کو کہتے تھے جو ایک حکومت اپنے قبائل سے جمع کر کے بوقتِ جنگ امداد کی صورت میں سپر پاور کو دیا کرتی تھی۔''سان'' اس غمِ لشکر کا بارہواں حصہ ہوتا تھا جو ہر وقت سپر پاور حکومت کی خدمت میں حاضر رہا کرتا تھا۔ہر قبیلے کے دستہ سان کے

ساتھ اس قبیلے کے سردار کے بیٹے، بھائی یا کسی اور رشتہ دار کا جانا ضروری ہوتا تھا جو اپنے آدمیوں کا ہر طرح سے ذمہ دار ہوتا تھا۔یہ دستے سال بسال انہی قبیلوں کے افراد سے تبدیل ہوا کرتے تھے۔

نصیر خان کی فوجی تنظیم

1۔دستۂ خاص: اس دستے کو اس نے قیامِ امن اور ہنگامی ضرورتوں کیلئے اپنی قوت کے طور پر براہ راست اپنے ماتحت رکھا۔

2۔دستۂ سراوان: اس فوج میں تمام جنگی افراد قبائلِ سراوان سے ہوتے تھے۔دستۂ سراوان کا سپہ سالار پہلے شہوانڑیں کا سردار ہوتا تھا لیکن بعد میں اس کی جگہ رئیسانڑیں کے سردار کو اس دستے کا سپہ سالار بنایا گیا۔

3۔دستۂ جہلاوان: اس دستہ میں جہلاوان کے قبائل شامل ہوتے تھے۔پہلے اس کا سپہ سالار التازئی قبیلے کا سردار ہوا کرتا تھا بعد میں زہری کے سردار کو اس کا سپہ سالار بنا دیا گیا۔

سرِ سرداراں کے ماتحت اس علاقے (صوبے) کے تمام سردار اور ان کے قبائل ہوتے تھے۔ہر سردار کا قبیلہ منتخب ٹکروں، پاڑوں اور پاذغوں میں تقسیم تھا۔ہر ٹکر پر ایک ٹکری، ہر پاڑہ پر ایک معتبر، ہر پاذغ پر ایک سفید ریش مقرر ہوتا تھا۔اس طرح ہر دستہ مختلف قبائل اور ہر قبیلہ مختلف گروپوں میں تقسیم ہوتا تھا۔تمام سفید ریش اپنے معتبروں کے اور تمام معتبر اپنے ٹکریوں کے اور تمام ٹکری اپنے قبیلے کے سردار کے اور تمام سردار اپنے علاقے کے سرِ سرداران کے ماتحت ہوتے تھے۔سرِ سرداران اپنے ماتحت سرداروں اور قبائل کے متعلق خان کو جواب دہ ہوتا تھا۔جس طرح کہ خان نے اپنی طاقت کو محسوس کرانے کی خاطر ایک دستہ خاص براہِ راست اپنے ماتحت رکھا تھا اسی طرح قبائلی سردار کے پاس اس کے اپنے قبیلہ کی طاقت بھی ہوتی تھی۔

غمِ لشکر کے تناسب سے ہر قبیلہ کو جدا جدا غمی اراضیات دی گئی تھیں۔یہ غمی اراضیات قبائل کی ملکیت نہیں ہوتی تھیں۔اس لئے قبائل کو ان کے بیچنے اور تقسیم کرنے کا اختیار نہ تھا۔بلکہ یہ ایک

قسم کی مشترکہ قبائلی جائیداداوں کی صورت میں تھی۔ ہر سردار اپنے قبیلہ سے اور سرِ سرداران اپنے صوبے سے عندالطلب مقررہ تعداد کا عمّی لشکر جمع کرنے کا ذمہ دار تھا۔اس لشکر کا بارھواں حصہ بطور سان ہر وقت خان کے پاس موجود ہوتا تھا۔

دستۂ خاص خان کے پاس دارالحکومت میں موجود رہتا تھا۔اس کی کل نفری بارہ سو ہوتی تھی۔لشکر کشی کے وقت مندرجہ ذیل قبائل اپنے حصہ رسدی لشکر کشی کے لئے شامل ہوتے تھے۔

دستہ ء خاص

قبیلہ	تعداد	قبیلہ	تعداد
مینگل	ایک ہزار	کمبرانڑیں	پچاس
لاسی	ایک ہزار	التازی	پچاس
خارانی	ایک ہزار	گرگناڑی	ایک سو
سنجرانڑیں	ایک ہزار	سمالانڑی	دو سو
مری	ایک ہزار	دہوارکلات	ساٹھ
بگٹی	ایک ہزار	جمالی	دو سو
دیرجاتی	دو ہزار	رودینی	دو سو
مکرانی	ایک ہزار	کلندرانڑیں	ایک سو
میروانڑیں	ایک ہزار		

دستہء سراوان

قبیلہ	تعداد
رئیسانڑیں	تین سو
کچھی کے مختلف قبائل	تین ہزار
بنگلزئی	سات سو
دہوارمستنگ	پچاس
محمد شہی	تین سو
خان گڑھ کے مختلف قبائل	پانچ سو
لہڑی	سات سو
نصیرآباد کے بلوچ	پانچ سو
لانگو	سات سو
ساتک زئی	چالیس
شاہوانڑیں	آٹھ سو
کوڑد	پانچ سو
سرپرہ	تین سو
رند	ایک ہزار
پرکانڑیں	ایک سو پچاس

دستہ ء جھلاوان

قبیلہ	تعداد
زہری	ایک ہزار
ساسولی	تین سو
محمد حسنی	آٹھ سو
خدرانڑیں	ایک سو
بزنجو	تین سو
نیچاری	ایک سو
مینگل	ایک ہزار
جتک	ایک سو
مگسی	ایک ہزار
باجوئی	ایک سو
ساجدی	ایک سو
پندرانڑیں	ایک سو
دینارزئی	ایک سو
لاشاری	ایک سو

دستہ سراوان اور جہلاوان اندرونی طور پر پھر تین تین چھوٹے دستوں میں تقسیم تھے اور جو جو قبائلی ان چھوٹے دستوں میں شریک تھے ان کو ''پلوشریک'' کہا جاتا تھا۔

دستہِ سراوان کے تین چھوٹے دستے اور ان دستوں کے پلوشریک معہ تعداد لشکر حسب ذیل تھے:۔

اول، دستہ رئیسانڑیں: (پلوشرخ)

قبیلہ رئیسانڑیں تین سو، قبیلہ کوڑد پانچ سو، ساتکزئی چالیس، لانگو سات سو۔

دوم، دستہ شاہوانڑیں: (پلوشریک)

شاہوانڑیں آٹھ سو، محمد شہی تین سو، سرپرہ تین سو۔

سوم، دستہ بنگلزئی: (پلوشریک)

لہڑی سات سو، بنگلزئی سات سو، رند ایک ہزار۔

دستہ جہلاوان کے تین چھوٹے دستے اور ان کے دستوں کے پلوشریک معہ تعداد لشکر حسب ذیل تھے:۔

اول، دستہ زہری: (پلوشرخ) زہری ایک ہزار، قبیلہ نیچاری ایک ہزار، جتک ایک سو، ساسولی تین سو۔

دوم دستہ مینگل (پلوشرخ) مینگل ایک ہزار، بزنجو تین سو، خدرانی ایک سو، ساجدی ایک سو، محمد حسنی آٹھ سو

سوم، دستہ مگسی: (پلوشریک) مگسی ایک ہزار، دینارزئی ایک سو، لاشاری ایک سو

دستہ خاص: (پلو شریک) میروانڑیں ایک ہزار، کمبرانی پچاس، ذگر مینگل ایک ہزار، گرگناڑی ایک سو، کلندرانی ایک سو، سمالانی دوسو، رودینی دوسو

دوران جنگ لشکریوں کو آٹا اور ان کے گھوڑوں کو بھوسہ اور دانہ خان کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ سرداروں کو جیرہ (راشن) ملتا تھا۔

مذہبی نصیر خان

نصیر خان ''دی گریٹ'' کے پاس دو مُہریں تھیں۔ ان میں سے ایک مہر وہ تھی جس میں کہ اس کا نام بھی آتا تھا:

حسبنا اللہ نعم الوکیل

ونعم المولی و نعم النصیر

1175ھ

دوسری مہر درباری زبان فارسی میں تھی:

جو لطف خدا دستگیرِ من است

محمد براعد النصیرِ من است

(25)

جیسے کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ میر نصیر خان نے دستہ خاص کے نام سے ایک فوج دائمی طور پر مرکز میں اپنے پاس رکھی۔ اس کے علاوہ ہر قبیلہ پابند تھا کہ خان کی طلبی پر ایک مقررہ تعداد میں فوج اسے دے دے۔ مالیہ جمع کرنے کے لئے اس نے منظّم دفتر قائم کئے۔ اس نے سرداری کو دربار کے تابع کر دیا۔ سارے چھوٹے فیوڈل (قبائلی سردار) ایک بڑے فیوڈل (خان) کی حاکمی کے زیر اثر تھے۔ قبیلوں کے مابین جھگڑوں کے فیصلوں کا قطعی اختیار خان کو حاصل تھا۔

نوری نصیر خان بنیاد پرستی کی حد تک مذہبی شخص تھا۔ اس نے اقتدار اور عقیدہ کی اس طرح باہمی یاری کرادی کہ اگلے 500 برس تک ہمارے پورے منطقے پر ہر مسلط حاکم یہی کلیہ استعمال کرتا رہا۔ اس نے ذگری فرقے کو مارا۔ ان اقدامات سے متاثر ہو کر خلافت ترکیہ نے اس کو ''غازی دین'' اور ''ناصر ملت محمدیہ'' کے خطابات دیے۔

اب دیکھیے نا، مندرجہ ذیل فرمان نصیر نوری نے جاری کیا جو انگریز دور تک برابر بلوچ ریاست میں نافذ رہا۔ آپ اسے پڑھیں گے تو اندازہ ہوگا کہ یہ مذہبی پن نہ تھا یہ تو صریحاً بنیاد پرستی تھی۔

میں جب مندرجہ ذیل احکامات دیکھتا ہوں تو حیران ہو جاتا ہوں اور جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ تو بلوچ حاکم کے فرمودات ہیں تو مزید حیران ہو جاتا ہوں:

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

فرمان ھدایت خانِ اعظم میر نصیر خان نوری در 1159ھ

1۔ سرود وطنبورونے وچنگ ودف وغیرہ سرود ہا در بدعت خانہائی فقیراں وشادی وسنت نہ شود۔

2۔ مردان وزنان در عروسی بازی رقص نہ کنند۔

3۔ بنج وچرس وغیرہ مسکرات نہ خورند وزراعت بنج ہم نہ کنند۔

4۔ ضعیف (زنان) روبرہنہ در بازار وکوچہا نہ گردند۔

5۔ سیر وصحبت کہ جوانان جمع شدہ در تکیہ ہا وغیرہ جاء ہا گوسفند کشتہ جشن می کنند سر بدعت آں است احدے نہ کنند۔

6۔ سودائے برید کہ بیع سلم است بغیر ا ہفت شرط شریعت نہ کنند۔

7۔ مردانِ وزنانِ مسلماناں در ماتم ہا سر برنہ کردہ روی وجان نخراشیدہ وخون نہ کردہ نوحہ نہ نمایند۔

8۔ در دائرہ فقیران مسلمان رانشستن نہ گزارند ومردم مسلمانان زلف نہ گزارند۔

9۔ نماز جمعہ را استوار داشتہ در شہر ہا ناغہ نہ کنند وہر کس بہ مسجد ہا ناں پختہ ہر محلّہ ملا ہائے مساجد خود را بد ہند ونماز ہا در اول وقت خواندہ تبنگ وقت نہ گزارند

10۔ مردان وزنان را تہمت ناحق بہ زنا می دہند ہشتاد درہ بہ تہمت دہندہ زدہ بہ سخنش باور نہ کنند پسر ودختر را بے گناہ ایذا نہ رسانند۔

11۔ شیخ ہا کہ بر سر موی می گزارند وبر سر بیمار ایشاں را می برند وسر موئی آنہاں را تراشیدہ وبر سر بیمار بروں نہ گزارند وبہ گفتہ ایشاں باور نہ کنند۔

12۔ گوسفند بر سر قبرستان وسنگ وآستانہ نہ کشتہ در دی خونی فرزند وعروسی واسپ وغیرہ نہ کنند وگوشت آں حرام مطلق است۔

13۔ از مال زکواۃ چہل یک بد ہند ودر زینہار کسی خراج نمی دہند دہ یک زکواۃ بد ہند

14۔ مسلمان وہندوان را سود گرفتن نہ گزارند

15۔ خیالات ہر یک ملا نگاہ داشتہ بہ او خیرات دادہ نماز با جماعت بکنند استوار بودہ احدے وفردے

قدم از دائرہ شریعت بیرون نہ گزاشتہ موجب دلالت ومنبع فضیلت پناہ مشارُالیہ بعمل آوردہ ہیچ تخلف و انحراف نہ درزیدہ دریں باب تاکیدا کیدوقدغن بلیغ دانستہ حسب المقرر داشتہ درعہدہ شاسند۔

تحریر فی التاریخ 25 جمادی الثانی 1159ھ

مہر شریف

حسبی اللہ ونعم الوکیل

نعم المولی ونعم النصیر

(26)

نصیر خان احمد شاہ ابدالی کی طرح دینی عالموں سے میٹنگیں کرتا تھا، ان سے صلاح و مشورہ کرتا تھا اور اس طرح ان کے مشوروں کو اپنے اثر میں لا کر اپنی مرضی اور مفاد کے اقدام کرتا تھا ۔ جہاں بغاوت ہوتی وہاں وہ بے رحم حاکم بن کر اس کی جڑ اکھاڑتا تھا۔ اس نے اٹھارویں صدی کی پانچویں دھائی میں ذکری فرقے کو نابود کرنے کے بہانے مکران میں اختلاف رائے کی بیخ کنی کی۔

واضح رہے کہ قلات کے احمد زئی خانوں کی توسیع پسند نگاہیں پہلے ہی مکران پر تھیں اور بہت عرصہ قبل میر عبداللہ نے 1723ء میں یہاں حملہ کیا تھا اور اس کے بھائی اور جانشین میر نصیر خان (جسے ذکریوں سے سخت نفرت تھی) نے اس علاقے پر 9 حملے کیے ۔ نصیر خان نے پنجگور زیر کر لیا ۔ پھر اس نے کیچ پر توجہ کی اور ناصر آباد پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد گچکیوں کی طرف سے احمد شاہ درانی کی مدد طلب کی گئی اور نصیر خان نے افغان بادشاہ کے حکم سے فوراً قلات پسپائی اختیار کی۔ جلد ہی ایک اور فوج ملک دینار کیخلاف بھیج دی گئی، جس کے نتیجے میں ملک دینار کو گرفتار کر کے قلات لایا گیا جہاں اسے درندگی کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔

کہتے ہیں کہ جب مکران کا سربراہ دینار خان گرفتار ہو کر خان کے سامنے پیش کیا گیا تو خان نے اسے کہا کہ نماز پڑھو۔ اس نے انکار کر دیا تو خان نے وہیں اس کا سر قلم کروا دیا۔ کیچ و پنجگور پر قبضہ کر لیا۔ کسر قند تک پیش قدمی کی اور دیزک اور خاران کے راستے قلات واپس آیا۔ مکران کے

حاکم گچکی سردار مجبور ہوئے کہ اپنے لگان کا آدھا حصہ اس کے حوالے کر دیں۔ اس طرح میر نصیر خان نے مرکزیت والی ایک فیوڈل حکومت بنا ڈالی۔

نصیر خان نے مکران پر ذکریوں کا قلع قمع کرنے کے بہانے دھاوا بول دیا تھا۔

4۔غلاموں کی تجارت

نصیر خان کی حکمرانی دراصل ایک فیوڈل انقلاب کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ عہد بہت شاندار تو تھا مگر ایک پڑھے لکھے جہاندیدہ اور عوام کے نبض شناس خان کی طرف سے مکمل فیوڈل طریقے سے شاندار تھا۔ نصیر خان نوری کی حکمرانی بلوچ معاشرے کی قبائلی تنظیم کی چوٹی پر کھڑی تھی جس میں زرعی غلامی (سرف) بھی تھی اور منقولہ جائیداد کی طرح منقولہ غلامی پہلے ہی سے مروج تھیں۔ نصیر خان کی فتوحات نے بلوچستان میں غلامی کی دوسری شکلیں بھی متعارف کرا دیں۔

غلامی پورے بلوچستان میں عام تھی اور کوئی بھی ایسا قابل ذکر خاندان نہ تھا جس کے پاس، غلام مرد یا غلام عورت نہ ہو۔ یہ غلام عام طور پر شیدی یا نیگرو ہوتے تھے جنہیں ساحلی شہر کراچی سے خریدا جاتا تھا۔(27)

بلوچستان (مکران) کا ایک حصہ اومان کے سلطان کے پاس 1783ء سے لے کر 1958ء تک رہا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدیوں میں اومان زنجبار (تنزانیہ) پر بھی حکمرانی کرتا تھا ۔ جو کہ غلاموں کی بہت بڑی منڈی تھی ۔ یہ غلام اومان اور ایران کے راستے مکران کے ساحل پر لائے جاتے تھے ۔ غلامی اور غلاموں کی خرید وفروخت باقاعدہ رواج کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ صرف شہروں میں غلام رکھے جاتے تھے بلکہ کراچی کو اندرونی علاقوں میں غلام مہیا کرنے کے لئے ایک بڑی منڈی کی حیثیت حاصل تھی ۔ سالانہ چھ سے سات سو تک غلام درآمد کیے جاتے تھے جن میں تین چوتھائی عورتیں ہوتیں تھیں ۔(28) علاوہ ازیں یہ غلام افغانستان تک لے جائے جاتے تھے ۔ افغانستان میں، 1923ء میں غلامی کے خاتمے تک، قندہار بلوچستان کے خاران سے لائے گئے غلاموں کی مشہور منڈی ہوا کرتا تھا۔ غلاموں کی مانگ اس لیے بڑھ گئی تھی کہ بلوچ فیوڈلوں (سندھ

میں تالپر اور بلوچستان میں خوانینِ قلات) نے بلوچ جنگجو سرداروں کو جاگیروں کے ساتھ غلام اور لونڈیاں بھی عطا کرنی شروع کی تھی۔ ان غلاموں سے زراعت وغیرہ جیسے پیداواری کام نہیں لئے جاتے تھے بلکہ فیوڈل انہیں زیادہ تر محلات کے محافظ بناتے تھے یا گھریلو ملازم رکھتے تھے۔ اشرافیۂ زمینداروں اور تاجروں کے گھروں میں بیگمات کی خدمت کے لئے نوعمر افریقی لڑکیوں کی بہت مانگ تھی۔ اس کے علاوہ سردار، سفر کے دوران ان غلاموں کو ساتھ رکھتے تھے۔ وہ وفادار ہوا کرتے تھے اس لئے کہ بھاگنے کا نہ تو راستہ معلوم تھا اور نہ آزادی کا کوئی آسرا تھا۔ یہی غلامی ہی ان کا مقدر اور فیوڈل کا گھر' ان کی جائے پناہ تھی۔ پھر بھی بھگوڑا پن سے روکنے کی خاطر غلام اور لونڈیوں کے سر کے بال اتارے جاتے تھے۔ اس کام کے لئے وہ سوکھا چونا (جس چونے پر پانی نہ ڈالا گیا ہو) استعمال کرتے تھے۔ اس وحشیانہ اقدام کے بعد بال دوبارہ اگتے ہی نہ تھے۔ انہیں خصی البتہ نہیں کیا جاتا تھا بلکہ لونڈیوں کے ساتھ بیاہ دیا جاتا تھا۔ غلاموں کی خوراک اور لباس کا اختیار آقا کو حاصل تھا۔(29)

گوکہ یہ عناصر، اب بلوچ معاشرے میں، عام بلوچ کے ہم پلہ اور برابر کے ہیں مگر اب بھی کچھ علاقوں میں انہیں کم ذات سمجھا جاتا ہے۔

اومان کے حکمرانوں نے بلوچوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے کھجوروں کے باغات میں کام کرنے والے افریقی غلاموں کے علاوہ ان کی فوج میں بھی افریقی غلام بطور سپاہی شامل تھے۔ 1872ء میں قلات کے حکمران نے گوادر اور اس سے ملحق ساحلی علاقوں کا کنٹرول اومان کے حوالے کر دیا۔ اس طرح افریقی غلاموں کی بلوچستان میں بہتات ہوگئی۔

چارلس میسن نے قلات میں بلوچ اور افغان نسل کے کچھ غلام بھی دیکھے تھے، مگر ان کی حالت نیگرو غلاموں سے بہتر تھی۔ غلاموں کے کپڑوں اور خوراک کے بارے میں کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ خانہ زاد (وہ غلام جو اپنے مالکوں کے خاندان میں پیدا ہوتے تھے) غلاموں کا زیادہ خیال رکھا جاتا تھا۔ شاغاسی نور محمد، داروغہ گل محمد اور رحیم داد سب خانہ زاد تھے (30)۔ آقا اپنے غلاموں کی زندگی اور موت پر قدرت رکھتے تھے۔

بلوچستان کے کراچی کے علاوہ، اس کی دوسرے ساحلوں پر بھی غلاموں کی تجارت ہوتی تھی۔ عرب لوگ، مشرقی افریقہ کی بندرگاہوں سے غلام حاصل کر کے انہیں بحر ہند میں سے سیدھا مسقط واومان لاتے اور گوادر، پسنی اور جیونی کی بندگاہوں پر لا کر بیچتے۔

زرخرید غلاموں کے علاوہ جنگی قیدی بھی غلام ہوتے تھے، جو افریقہ، پارس، انڈیا اور افغانستان سے تعلق رکھتے تھے۔ مریٹہ کے بارے میں خیال ہے کہ وہ مرہٹوں کی اولاد ہیں جو احمد شاہ کی جنگ میں پکڑے گئے تھے۔ مری اور بگٹی غلاموں کی اکثریت مریٹہ تھی۔ یہ صرف احمد شاہ ابدالی کی جنگ میں حاصل نہیں کئے گئے بلکہ سلویا میتھی سن کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ بہت پہلے ہمایوں نے جب دوبارہ تخت دہلی پر قبضہ کیا تھا تو بلوچوں کے حصے میں چالیس ہزار قیدی آئے تھے۔ وہ اُن کے جنگجوؤں نے آپس میں بانٹ لئے جن میں مری اور بگٹی بھی شامل تھے۔(31)

اسی طرح ہزارہ قبیلے کے لوگ غلاموں کی صورت میں بلوچوں میں موجود تھے، جنہیں افغانستان کے ہزارہ جات کے علاقے سے لایا گیا تھا(32)۔

سرداروں کی حامی ساری بستیاں انہی غلاموں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ سردار کی خدمت گزاری اُن کا اہم ترین فریضہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ سردار کے محافظ بھی ہوتے ہیں۔ نیز یہ غلام سرداروں کے مخالفوں اور مشکوک وفاداریاں رکھنے والوں سے بھی نمٹتے تھے(33)۔

شخصی غلامی کے درمیان ایسا بھی ہوتا تھا کہ کئی مالک مل کر ایک مشترک غلام رکھیں۔ غلام عورتوں کو غلاموں سے بھی شادی کی اجازت تھی اور کبھی کبھی آزاد افراد بھی ان سے شادی کر لیتے تھے مگر خود مالک ان عورتوں سے شادی کرنے کا مجاز نہ تھا(34)۔

مکران کے اندرونی علاقوں میں جہاں ماضی میں کچھ افریقی غلاموں سے کھجور کے کھیتوں میں کام کرایا جاتا تھا، بہت سے افریقی نژاد باشندے بیگار کے مزدوروں (Bonded lobour) کے بطور آج بھی کام کرتے ہیں۔ باں کلینک نامی دالوں کی پھلیوں کی بھوسی الگ کرنے کا کام نہایت قلیل اجرت پر سیاہ فام باشندوں ہی سے کرایا جاتا ہے۔ اگرچہ خان قلات نے ہندوستان کی انگریزی حکومت کے دباؤ پر غلامی کا نظام 1914ء میں قانونی طور پر ممنوع کر دیا تھا مگر

1950 کی دہائی تک صاحبِ حیثیت گھرانوں میں غلام رکھنے کا رواج موجود تھا(35)۔

میں ابراہیم عطائی کی اس بات سے متفق ہوں کہ مغل (چاکری) عہد سے پہلے بلوچوں میں غلام نہیں تھے۔(36) اس لئے کہ اس وقت وہ اپنے جنگی قیدی قتل کرتے تھے۔

قلات کی تجارت اور فنانس میں ہندوؤں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ یہ شمالی سندھ، اور ملتان اور ڈیرہ غازی خان سے آئے ہوئے تاجر پیشہ لوگ تھے۔ اور بلوچستان کے ہر علاقے میں پائے جاتے تھے۔ وہ سردار اور خان کو مختلف ٹیکس دیتے تھے اس لئے انہیں مقتدرہ حلقوں کی طرف سے مکمل حفاظت حاصل تھی۔

5۔بیگلر بیگی (بیگوں کا بیگ)

سولہویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی کے اوائل تک بلوچستان میں کئی ریاستوں کی تشکیل ہوئی جن میں، قبیلوں کے جاگیردار بنتے ہوئے اشرافیہ نے، حکومت سنبھالی۔ یہ دراصل بلوچستان میں کنفیڈریشن کا عہد تھا جس میں فوجی کارروائیاں کی گئیں، اتحاد بنائے گئے اور بالآخر قلات کو ایک لحاظ سے ایک مرکزی مقام حاصل ہوا۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک نادر شاہ کی سلطنت کے تحلیل ہونے، اور مغلوں کے کمزور ہونے کے نتیجے میں پورے بلوچستان کے لئے ایسے حالات پک گئے کہ وہ ایک واحد فیوڈل ریاست کی چوکھاٹ میں متحد ہو جائے۔ اس اتحاد نے خانیوں میں سب سے طاقتور خانی یعنی قلات کے حکمران کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ عہد خانی کو مضبوط بنانے اور اسے توسیع بخشنے کا عہد تھا۔ یاد رہے کہ کچھی کے عظیم زرعی وسائل قلات کی خانی کی پشت پر تھے۔

بلاشبہ بلوچستان کا بیگلر بیگی (بیگوں کا بیگ) یعنی نصیر خان (1750-1795) بلوچوں کا سب سے طاقتور حکمران ہو گزرا ہے۔ ''بیگلر بیگی'' دراصل ترک لفظ ہے۔ ''بیگ'' کے پاس انتظامی اتھارٹی ہوا کرتی تھی۔ وقار کی علامت کے بطور اسے سلطان کی طرف سے ایک standard (سنجاق) ملتی تھی۔ جس ضلعے کا وہ حاکم ہوتا ہے اس ضلعے کو بھی سنجاق کہا جاتا تھا۔ اور خود

اُسے ''سنجاق بیگی'' کہا جاتا تھا۔

ایک ''بیگلر بیگی'' (جسے بعد میں والی بھی کہا جانے لگا) بہت سارے سنجاق بیگیوں کے اوپر قائم ہوتا۔ ایک ایسا یونٹ جو بہت سارے سنجاقوں پہ حکمرانی کرتا تھا۔ اس پورے علاقے کو'' بیگلر بیگی بیک'' یا'' ایالات'' کہتے تھے۔(37)۔

نصیر خان کی سلطنت میں مغربی سمت پہ بمپور، جاسک، دیزک۔ شمال میں شال، شمال مشرق میں ڈیرہ غازی خان، داجل اور ہڑند شامل تھے جبکہ مشرق میں اس کا علاقہ سندھ کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ جنوب میں لسبیلہ اور کیچ اس کی سلطنت میں شامل تھے۔ کراچی کا عظیم بندرگاہ تو تھا ہی۔

میر نصیر خان نے احمد شاہ کی بالادستی 1757 تک قبول کئے رکھی۔ مگر 1758 میں اس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ ظاہر ہے کہ سپر پاور احمد شاہ کو یہ گوارا نہ ہوا۔ چنانچہ اس نے بلوچستان پر حملہ کر دیا۔ قلات سے 70 میل شمال میں پڑنگووڑ کے مقام پر جنگ ہوئی اور بلوچوں نے احمد شاہ کی فوجوں کو شکست دی۔ احمد شاہ نے خود دوبارہ بڑی فوج جمع کی اور پہلی لڑائی سے 3 میل کے فاصلے پر مستنگ میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ خان عمدہ صورت میں قلات پسپا ہوا جہاں اس نے پہلے ہی سے شدید مزاحمت والی لڑائی کی تیاری کر رکھی تھی۔ تین دفعہ حملوں کے بعد جب حملہ گر، قلات کو حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوا تو اس نے مذاکرات کی دعوت دی اور اِس طرح ایک سمجھوتہ ہوا۔(38)

معاہدے میں صرف ایک شق ایسی تھی جس میں کہ اس کی بالادستی کی بُو آتی ہے۔ اس کے تحت اگر احمد شاہ دشمنوں سے لڑے تو بلوچ مدد کی علامت کے بطور ایک فوجی دستہ روانہ کریں گے، وہ بھی اس شرط پر کہ احمد شاہ ایک لاکھ روپیہ سالانہ فوجی ہتھیاروں اور اخراجات کے بطور خان قلات کو دیتا رہے گا۔ احمد شاہ نے نصیر خان کی آزادی کو یوں تسلیم کیا'' قلات خدا نے تمہیں بخشا ہے اور تمہارے پاس ہی رہے گا''۔(39)

1769ء کے جنگِ مشہد میں نصیر خان نوری نے ایرانی فوجوں کے مقابلے میں افغان بلوچ متحدہ افواج کی کمان کی۔ اس جنگ کی فتح پر احمد شاہ ابدالی نے بے اختیار ہو کر میر نصیر خان کو ''سردارِ وفادار'' کہہ کر گلے سے لگایا۔(40)

اس سے پہلے 1761ء میں احمد شاہ ابدالی نے مرہٹہ کے خلاف پانی پت کی تیسری جنگ لڑی۔خان قلات نے دس ہزار کی تعداد میں بلوچ فوج، پرائے علاقے کو فتح کرنے بھیجی جو احمد شاہ کے ساتھ راولپنڈی کے مقام پر جا ملی۔نصیر خان خود پندرہ ہزار فوج لے کر ابدالی کے ساتھ پانی پت میں جا ملا۔اس پچیس ہزار بلوچ نے پانی پت کی جنگ میں اہم رول ادا کیا اور مرہٹہ کو شکست دی ۔عبدالقدوس شرارتاً اس فتح کو مرہٹہ پر مسلمانوں کی فتح قرار دیتا ہے ۔(41)۔(اس سے بڑھ کر ذہنی بیماری کا اظہار اور کیا ہوگا ؟ ہمارا دانشور واقعی نفسیاتی بیمار ہے۔مگر اُس سے بھی بڑھ کر ہمارا حکمران تاریخی طور پر بہت چالاک اور روباہ صفت رہا ہے۔احمد شاہ اور نصیر خان ہوں یا غزنی کا محمود، لُوٹ مار کی ہر لڑائی کو عقیدہ کا جامہ پہنایا کرتے تھے)۔

اسی طرح جب لاہور اور ملتان میں سکھوں کی آزادی اور سرہند اور جالندھر دوآب کے ہاتھ سے نکل جانے کی خبر احمد شاہ نے سنی تو اس نے پنجاب کی طرف کوچ کرنے کا قصد کیا۔اس نے اپنے بلوچ حلیف میر نصیر خان کو بھی سکھوں کے خلاف جہاد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔نصیر خان کے نام اس کے خط میں ہمیں اس کی سامراجیت، قبضہ گیری اور نو آبادیاتی ذہنیت صاف نظر آئے گی۔خط یوں ہے:

’’مجھے ملتان اور ڈیرہ جات سے اطلاع ملی ہے کہ یہ ملعون کتے اور لالچی کافر، مسلمانوں کو شکست دے کر ملتان کے علاقے پر قابض ہو گئے ہیں ۔انہوں نے لاتعداد مسجدیں شہید کر دی ہیں اور مسلمانوں کو قیدی بنا کر لے گئے ہیں ۔اس صورت میں جبکہ یہ لعنتی فرقہ ایسے مظالم ڈھا رہا ہے، آپ کیسے حج پر جانے کا ارادہ کر سکتے ہیں ؟ آپ کو چاہیے کہ آپ قلات سے پنجاب کا رخ کریں ۔میں اِدھر سے روانہ ہو رہا ہوں اور ہم دونوں مل کر ان سرکش لوگوں کی مکمل بیخ کنی کر دیں گے ۔یقین جانو کہ ان بت پرستوں کے خلاف جہاد، حج سے افضل ہے۔تم میرے بیٹے کا درجہ رکھتے ہو اور مسلمان بھائی بھی ہو اس لئے فوراً آؤ تا کہ ہم ان کفار کا جلد سے جلد خاتمہ کر دیں‘‘(42)۔اس طرح نصیر خان نے حج کا اپنا پروگرام ملتوی کر دیا، تکلفاً ملاؤں سے جہاد کا فتویٰ حاصل کر لیا اور ’’کافر مارنے‘‘ پر تیار ہوا۔اسلام کے یہ دونوں سپاہی نہایت اخلاص کے ساتھ اسلام

کا جھنڈا لے کر نگر نگر فتح کرتے چلے گئے۔فتوحات کے موقع پر مفتوح کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے، یہاں بھی وہی کچھ ہوتا رہا۔پھر بھی احمد شاہ کو احمد شاہ ’’بابا‘‘ اور نصیر خان کو ’’نوری‘‘ کہا جاتا ہے ۔اور ان کے نام پہ عظمت کی پرچی لگا کر آج بھی سیاست گری ہوتی ہے۔

الغرض احمد شاہ اٹھارہ ہزار آدمی افغانستان سے لیکر چلا۔اس کا اتحادی نصیر خان بارہ ہزار سپاہی لے کر ایمن آباد میں اس سے آن ملا۔سکھوں کی راہنمائی سردار چڑھت سنگھ کر رہا تھا۔اس نے بلوچ ہراول دستے کو بے خبری میں آن لیا جس کی سربراہی سردار گوہرام خان اور احمد خان بلیدی کر رہے تھے۔حملہ اتنا سخت تھا کہ احمد خان بلیدی اور اس کا بیٹا پہلے ہی حملے میں مارے گئے۔اس لڑائی میں مزار محمد، غلام حسین ہنگلزئی، بہادر ساسولی اور میر عبدالنبی رئیسانڑیں نے نمایاں کردار ادا کیا(43)۔جنگ کے خاتمے پر دونوں حلیفوں نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔احمد شاہ نے شال (کوئٹہ) کا علاقہ اُسے دے دیا۔اس نے نصیر خان کو چناب، جھنگ اور ملتان کے علاقے بھی دینا چاہے مگر نصیر خان نے قبول نہ کیا(44)۔

یہ تو ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ میر نصیر خان نے گوادر 1784ء میں فتح کر لیا تھا۔اس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں خاران پر بھی قبضہ کر لیا اور وہاں کا حکمران عباس خان نوشیروانی اپنی آمدنی کا کچھ حصہ اُسے دیتا تھا۔نوشیروانی کی آمدنی کا پچھتر فیصد حصہ کسانوں اور خانہ بدوش مالداروں کی آمدن کے مالیہ سے حاصل ہوتا تھا اور پچیس فیصد اُن کاروانوں سے کسٹم کی صورت میں ملتے تھے جو خاران کے علاقے سے گزرتے تھے۔

نصیر خان نے جب ریاست لسبیلہ پر قبضہ کر لیا تو اس وقت وہاں کسانوں اور ماہی گیروں کے ایک سو پچاس گاؤں تھے ۔لسبیلہ کے جام (حاکم) اپنی آمدن کا نصف حصہ خان کو دیتے تھے ۔یہاں مالیہ کی شرح مستقل پانی والی زمینوں سے پیداوار کا تیسرا حصہ اور سیلابی پانی والی زمینوں سے پانچواں حصہ ہوتا تھا۔یہاں اشیاء کی قیمتِ فروخت کے ایک فیصد کے حساب سے چونگی لیا جاتا تھا۔

خانی کا ایک جھنڈا تھا جو اوپر کی طرف سرخ تھا اور جس کے جنوب کا حصہ سبز تھا۔سرخ

حصے کو جنگ اور آزادی کی علامت سمجھا جاتا تھا اور سبز حصہ امن وانصاف کا نشان تھا(45) (حیدر آباد میں تالپور بلوچ فیوڈل ریاست کے جھنڈے میں یکے بعد دیگرے چھ سات سرخ اور سفید پٹیاں تھیں)۔

خان کے دربار کی تحریری زبان فارسی تھی اور خارجہ امور فارسی میں نمٹائے جاتے تھے ۔بلوچی عوامی زبان تھی۔مباحثے اور کانفرنسیں بلوچی میں ہوتی تھیں۔

خانی والی ریاست کی اپنی کرنسی ہوتی تھی جسے ''نصیر شاہی یا کرم شاہی'' کہتے تھے۔اس پر نصیر خان کا نام کندہ ہوتا تھا۔اس میں کاپر کے 48 پائی ہوا کرتے تھے۔یہ ''شاہی'' اس وقت پڑوسی افغان کرنسی کے برابر ہوتی تھی، جسے ''احمد شاہی'' کہتے تھے۔بلوچ کرنسی کے یہ سکے قلات ہی میں بنائے جاتے تھے۔

میر نصیر خان نوری تاریخ میں پہلا بلوچ خان تھا جس نے اپنی قوم کے لئے ایک باقاعدہ نظامِ حکومت قائم کیا۔اس نے اپنے زیر اثر تمام قبائل کو بلوچ کنفیڈریسی کی شکل دی اور سربراہان پر مشتمل بلوچی مجلس (پارلیمنٹ) کی بنیاد رکھی۔وہ چونکہ سخت مذہبی شخص تھا اس لئے ملک میں محکمہ قضا کا قیام جاری کردیا۔طوران کے بجائے وطن کا نام بلوچستان رکھا اور اسے ایک آزاد اور خودمختار ملک کی حیثیت سے دیگر مما لک سے تسلیم کروایا۔

میر نصیر خان فیصلے فرمان کی شکل میں جاری کرتا تھا۔چونکہ اس کا معاشرہ بہت حد تک ٹھیٹ قبیلوی رواجوں پر تکیہ کرتا تھا اس لئے اس کا فیوڈلزم قبیلوی رشتوں کے زیر اثر رہا۔بلوچستان میں جاسوسی کے لئے آنے والے ایک انگریز، پوٹنگر نے 1810ء میں نصیر خان کی تعریف یوں کی تھی:

''اگر ہم نصیر خان کے کردار کو جانچیں (خواہ سپاہی کی حیثیت سے، ایک حکمران کی حیثیت سے، یا ایک شہزادے کی حیثیت سے) تو ہمیں معلوم ہوگا کہ وہ تمام فرائض کے لیے ضروری خوبیوں کا غیر معمولی مجسم مجموعہ تھا۔اس نے اپنا پیشہ خود اپنے بھائی کو قتل کرنے سے شروع کیا ۔۔۔اسے دولت کی خواہش ڈانواں ڈول نہیں کرسکتی تھی۔اس لئے کہ اس نے اپنے خادموں سے زیادہ بہتر لائف سٹائل کبھی نہیں گزاری۔اُسے خزانے کی کوئی پرواہ نہ تھی، سوائے اس کے کہ اس کی

رعیت کی حالت بہتر بنائی جائے۔۔۔۔نصیر خان نے ایک روشن فکر قوم پہ حکمرانی کی۔۔۔وہ لبرل تھا، بہادر، منصف اور معاف کرنے والا، برے اور ناموزوں حالات میں صابر تھا۔وہ اپنے قول کا اس قدر پابند تھا کہ کبھی کسی نے اسے وعدہ توڑتے ہوئے یا اپنی بات سے ذرا بھی ادھر اُدھر ہوتے نہیں پایا''۔(46)

نصیر خان کی سیاسی بصارت، اندرونی سیاسی قبائلی اقتدار کے میکنزم پر پوری طرح حاوی تھی۔اس نے نہ اپنی تلوار کو میان میں رکھا اور نہ اپنے سرداروں اور لشکریوں کی تلوار کو میان میں رہنے دیا۔اس میں ذہانت، چابک دستی اور فراست کے علاوہ کردار کا کرشمہ بھی موجود تھا جو ایک اچھے لیڈر، حکمران اور کمانڈر کی کامیابی، استحکام اور ہر دلعزیزی کی اساس ہے۔اس نے اپنی 45 سالہ دورِ حکمرانی میں اندرونی اور بیرونی تمام قوتوں کے درمیان ایسا توازن برقرار رکھا جو اس کی کامیابیوں کو استحکام اور خوشحالی میں بدلنے کا موجب بنتا رہا۔(47)

مگر یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ خواتین کو ورثہ دینے کا شرعی حق اسی نصیر خان نوری ہی نے منسوخ کردیا۔(48)

جیسے کہ ذکر ہو چکا ہے کہ نصیر خان نے اپنی باقاعدہ فوج (800 گھڑسوار) رکھنے کے علاوہ ''سرِ سردارانِ ساراوان'' اور ''سرِ سردارانِ جھلاوان'' نامی دو ایسے عہدے قائم کئے جن سے ان دونوں جغرافیائی حصوں کے سارے سردار انہی دو سرداروں کے ماتحت آ گئے۔اور محض دو آدمیوں سے معاملہ کرنا بہت آسان تھا۔وہ ان دونوں کو کونسل میں اپنے ساتھ بٹھاتا اور انہیں قیمتی انعامات سے نوازتا۔مثلاً اس نے ان نئے عہدوں پر فائز دونوں سرداروں کو سونے کا ایک ایک خنجر دیا، چاندی کے ساز وسامان سے لدا ہوا ایک ایک گھوڑا دیا اور ایک کمخواب وزربفت کا لباس عطا کیا۔

وہ اپنے پیش روؤں کی طرح سرداری رشتوں کو القاب، تحفوں اور احسانات کے ذریعے استعمال کرتا تھا۔اس نے کنفیڈریسی کی کمزور ہیرارکی کو خود اپنے گرد ادارے کی حیثیت سے کامیابی کے ساتھ ڈھال دیا۔اس نے کچھی کے حصے وفادار قبائل کو بخش دیے۔خان کی طرح ان قبائل کے سرداروں نے بھی زمین کے زرخیز ٹکڑے اپنے لئے رکھ لئے اور بقیہ زمین قبائل میں بانٹ دی

۔سردار کو مالکِ اعلیٰ والے حقوق حاصل تھے ۔دوسرے لفظوں میں کچھی کی زمینیں سرداری اور جاگیرداری نظام کے لئے زبردست مالی منفعت ثابت ہوئیں ۔عوام کے لئے تو بس اتنی پیداوار بچ جاتی کہ وہ اگلے دن کی مشقت کے لیے زندہ رہ سکیں ۔

کچھی کی زرخیز زمینوں پر فرمانروا کے حقوق ملنے سے ارسٹوکریسی زبردست طور پر مضبوط ہوئی جس میں احمد زئی خاندان کے علاوہ قبائلی سرداروں کے خاندان بھی شامل تھے ۔زمین کی بخشش ''شادی غم'' کے فلسفے کا حصہ تھی اور ان زمینوں کو ''غم زمینیں'' کہا جاتا تھا ۔درحقیقت یہاں میر نصیر خان نے مستقل پانی رکھنے والی زمینیں اپنے پاس رکھ کر ایک نئی ریاست کے قیام کا آغاز کیا ۔

نصیر خان نے قلات شہر کی خوبصورتی پہ خصوصی توجہ دی ۔اس نے قلعہ تعمیر کرایا، وادی میں کابل اور پارس سے لائے ہوئے درختوں کے باغ لگوائے ۔(49) جب بھی کوئی دستکار اُسے اپنی کوئی دستکاری کا عمدہ نمونہ پیش کرتا تو وہ اُسے اس کی قیمت کا دس سے بارہ گنا زیادہ دیا کرتا تھا ۔

نصیر کا سینئر پارٹنر، احمد شاہ اپنی فعال اور واقعات سے بھرپور حکمرانی کے اواخر میں ایک تکلیف دہ بیماری میں مبتلا ہوا ۔اس کے چہرے کے بالائی حصے کو ایک خوفناک پھوڑے (Ulcer) نے تباہ کر دیا ۔وہ غزنی کے جنوب میں ماروف نامی قلعے میں واپس ہوا اور وہیں مر گیا ۔اس کا بیٹا تیمور شاہ تخت نشین ہوا مگر اس کی بیس سالہ حکمرانی ، باپ کی اکٹھی کی ہوئی سلطنت کے ٹکڑے ہونے والی حکمرانی تھی ۔بلوچوں میں سندھ کے اندر تالپور اور بلوچستان کے اندر قمبرانڑیں زبردست قوت کے بطور ابھرے ۔(50)

کچھ ہی عرصہ میں مشرقی بلوچستان کے پہاڑوں میں حسنڑیں نام کا ایک قبیلہ بہت طاقتور بنا ۔یہ موجودہ مری قبیلے کا تقریباً سارا علاقہ فتح کر کے دوسرے پڑوسی قبائل میں اپنی دست اندازیاں جاری رکھے ہوئے تھا ۔اُس وقت اُس قبیلے کے سربراہ کا نام نور محمد تھا جو محمد کا بیٹا تھا ۔اور محمد ، سردار حسن کا بیٹا تھا ۔نور محمد بیس سال تک حسنڑیں کی سرداری کرتا رہا ۔اس کی موت کے بعد صادق اس قبیلے کا سردار بنا ۔صادق نے مری قبیلے کو کاہان نامی علاقے میں ایک قلعہ بنانے اور ہمسایہ کے بطور رہنے کی اجازت دی ۔مری یہیں پہ مرکوز ہونا شروع ہو گئے اور پیلا وغ میں حسنڑیں کے

خلاف جنگ کی جہاں 200 مری اور 100 حسنڑیں قتل ہوئے ۔صلح ہو گئی مگر ایک سال بعد زمین کے ٹکڑے پر دوبارہ لڑائی ہوئی ۔حسنڑیں کچھی اور آس پاس کے علاقوں پر ڈاکے مارتے رہتے تھے ۔سبی کے باروزئی اُن سے شکست کھا کر کمزور پڑ گئے تھے ۔میر صادق کچھی کو ویران کرنے کے بعد تلّی کے علاقے میں رہائش پذیر تھا ۔مری، بگٹی اور کھیتر ان سب کے سب حسنڑیں سے نالاں تھے ۔ڈیرہ غازی خان اُن کے گھڑسواروں کی گرد میں غرق و غلطاں تھا ۔رند بلوچ سے تعلق رکھنے والا یہ قبیلہ بہت جنگجو تھا ۔

جس وقت ھڑند اور داجل میر نصیر خان نوری کے تاج تلے آئے تو اس کے سواروں اور افسروں کو اکثر قلات سے ھڑند اور داجل جانا ہوتا تھا ۔مگر ان کے راستے میں غرّاتے ہوئے حسنڑیں آتے تھے ۔تنگ آ کر میر نصیر خان ، حسنڑیں کی جڑ اکھاڑنے پر تیار ہو گیا ۔ادھر مری قبیلہ حسنڑیں کے خلاف نبرد آزما تھا ۔ماوند کا شادیھان اُس وقت مری کا لیڈر تھا اور قبیلے کی طرف سے ننگ و جنگ اُسی کی رکھوالی میں تھے ۔اس نے نصیر خان نوری سے فوجی مدد مانگی ۔کہتے ہیں کہ وہ بہت عرصہ وہاں قلات میں پڑا رہا مگر خان فوجی امداد میں پس و پیش کر رہا تھا ۔ایک دن جب وہ دربار میں بیٹھے تھے تو چھت سے ایک سانپ نیچے گر گیا ۔خان بمعہ مصاحبین کے فوری طور پر باہر نکل گیا مگر شادیہان وہیں بیٹھا رہا ۔سانپ اُس کی طرف بڑھنے لگا اور وہ آرام سے بیٹھا رہا ۔جب سانپ بہت قریب آیا تو اس نے خنجر نکالی اور بیٹھے بیٹھے وہیں اُسے مار دیا ۔

خان مصاحبین سمیت جب واپس آیا تو اس پر بہت غصہ ہوا کہ آئے ہو فوج مانگنے اور بہادری دکھاتے ہو ۔ہم سب بھاگے تم بیٹھے رہے ۔کہتے ہیں کہ حاضر جواب شادیہان نے فوراً اپنا کرتہ اتار لیا ۔اور تلواروں کے بے شمار تازہ و پرانے زخم اُسے دکھائے ' کہ اس قدر لڑائی و تباہی کے باوجود میں فوجی مدد لینے ، عرصے سے دربار میں پڑا ہوں مگر جب آپ فوج نہیں دے رہے تو سوچا بہتر ہے یہیں تمہارے دربار میں مر جاؤں ۔مگر جب سانپ میری جانب نزدیک آیا تو اچانک خیال آیا کہ لوگ تو کہیں گے کہ مری ہکا بکا سٹی گم ڈر کے مارے حرکت کیے بنا بیٹھا رہا اور سانپ نے آکر اُسے ڈس لیا ۔اس لئے میں نے اسے مار دیا ۔

خان اس قدر متاثر ہوا کہ فوج اُسے دے دی۔شادیھان نے قلات سے فوج لیکر حسنی پر چڑھائی کی۔حسنی نے مری اور خان کی مشترکہ افواج سے شکست کھائی اور کوھلو کی طرف پسپا ہوا جہاں اس وقت زرکون آباد تھے۔یہ 1780ء کی بات ہے۔

دوبارہ لڑائی دولانگا کے مقام پر ہوئی جہاں میر صادق مارا گیا اور حسنڑیں کی طاقت مکمل طور پر کچل دی گئی۔اس جگہ کا نام صادق ونگا پڑ گیا۔

سردار صادق کے دونوں ہاتھ کہنیوں تک کاٹ کر اس کی ماں کو پکڑا دیے گئے۔اور اس سے کہا گیا کہ انہیں چھڑی سمجھ کر ان سے گائے ہانکے۔

اس حالت میں اُس بوڑھی ماں سے سوال کیا گیا کہ ''کیا انسان پہ اِس سے بھی برا وقت آسکتا ہے؟'' تو اس نے جواب دیا ''ہاں ایک حالت اس تباہ کن حالت سے بھی بدتر ہے۔اور وہ ہے بھوک۔'' (مارکس کا سارا فلسفہ اس معمر بلوچ خاتون کے اسی ایک فقرے پر قربان ہو)۔واضح ہو کہ مارکس نے اس بزرگ خاتون کے سو سال بعد اپنا فلسفہ دیا۔

صادق کا بیٹا لونڑیں قبیلے کی مدد سے مریوں سے لڑتا رہا مگر اسے شکست ہوگئی۔شاید مری کے ساتھ خان کا تعارف بھی اسی زمانے میں ہوا۔اور یہ تعلق بڑھتے بڑھتے بالآخر رعایا اور بادشاہ کے تعلقات بن گئے۔یہ فیوڈل شاہی مشرقی قبائل پر اس قدر سخت تو نہ تھی لیکن حکمرانی تو بہر حال حکمرانی ہوتی ہے۔اس فیوڈل ریاست کی کنفیڈریسی کے تحت مشرق بلوچستان کے قبائل بہر حال اپنی نزدیک بین دید سے باہر نکلے اور قبیلوی تنگ نظری سے نکل کر کسی نہ کسی طور بلوچ کے عمومی لنگ و لاغر کارواں کی سُست گرہ میں بندھ گئے۔

خان اور مری کی مشترکہ افواج نے حسنڑیں کو شکست دے کر اسے اس علاقہ یعنی ماوند ،جنتلی ،نیساؤ، پیلاوغ، کنل اور کوھلو سے باہر نکال دیا۔حسنڑیں تتر بتر ہو گئے۔ایک ٹولی کھیتران کے زیرِ سایہ رڑکنڑ جا بسی ،ایک گروپ دکی میں تل نامی علاقے میں شادوزئی کی پناہ میں گیا اور ایک حصہ گرتے پڑتے سیوی کے میدانوں میں جا بیٹھا۔باقی حصہ متفرق طور پر دیگر تمنات میں شامل ہو گیا۔پیھرسن ان کی تباہی کے سال کو 1830ء بتاتا ہے۔

مری نے قبضہ کی ہوئی ان کی ساری زمین اپنے قبیلے کے نرینہ افراد (بشمول نوزائیدہ بچے) میں تقسیم کی۔ماوند، ڈھل اور ونگا سر، تک کا سارا علاقہ مری کا ہوا۔رقبہ وحدود کی وسعت اپنے ساتھ شکم سیری اور سُکھ بھی لائی۔مری قبیلہ سرسبز اور پر گنج چراگاہوں، حیات آفریں چشموں ندیوں ،ہوادار چوٹیوں' طویل دریاؤں، غنیمت میں ملی اونٹنیوں اور خمدار تلواروں جیسی بے شمار نعمتوں کا مالک بن گیا۔حسنڑیں اور زرکون کاشتکاری میں مہارت رکھتے تھے۔مگر مری نے اس مہارت سے بہت کم فائدہ اٹھایا۔اسے وسیع زمین اور کاشتکاری کی بجائے اپنی بھیڑ بکریاں، پہاڑ پر محبوب گیت اور مویشیوں کے گلے میں بندھی گھنٹیاں زیادہ بھلی لگیں۔یہی خوش الحان گھنٹی بعد میں ہمارے اپنے گلے کی گھنٹی بن گئی اور صدیوں تک انگریز اور پاکستان سے لے کر مقامی فیوڈل اور معتبر اسی گھنٹی کی گرہ تنگ کرتے رہے۔

صادق کے بعد عظمت خان اور اس کے بعد سید خان، حسنڑیں کے سردار بنے۔اس کے بعد عیسیٰ خان اور محمد خان بالترتیب سردار ہوئے۔

6۔ نصیر خان کا دورِ عروج

نصیر خان کی زراعت کا حال یہ تھا کہ خان کی شخصی اراضی کے اجارہ گر خان کو پیداوار کا مالیہ عموماً زمینوں کو پانی دینے کے طریقوں کے حوالے سے دیتے تھے۔یہ تین طریقے (اور لہٰذا مالیہ کے تین درجے) یہ تھے:۔

1۔ کنوؤں یا کاریزوں سے سیراب ہونے والی زمینوں سے پیداوار کا بیسواں حصہ لیا جاتا تھا۔کنوؤں اور کاریزوں کو جاری وساری رکھنے کیلئے بہت محنت کرنی پڑتی تھی، اس لئے ان کسانوں کو پیداوار کا بیسواں حصہ دینا ہوتا تھا۔

2۔ بارانی زمینوں سے پیداوار کا دسواں (کبھی کبھی پندرھواں) حصہ بطور مالیہ لیا جاتا تھا۔

3۔ باغوں سے پیداوار کا پانچواں حصہ مالیے کی شکل میں لیا جاتا تھا۔

میر نصیر خان اجناس کی پیداوار کو وسعت دینے میں بہت دلچسپی رکھتا تھا۔کپاس، نیل اور

گھی کی پیداوار خوب بڑھی۔ وہ خود بھی قندہار اور ہندوستان سے مختلف فصلوں اور درختوں کے بیج اور نہال جمع کر کے لاتا رہتا تھا۔ اس کے پچاس سالہ دور حکومت میں تجارت کو زبردست فروغ ملا۔ بحر ہند کی کئی بندرگاہیں اور تجارتی راہیں قلات اور وہاں سے قندہار تک کُھلیں۔ گویا ہندوستان اور وسطی ایشیاء کے درمیان قلات کی حیثیت ایک تجارتی مرکز کی ہوگئی تھی۔ سونمیانی کی بندرگاہ ایک تجارتی وصنعتی مرکز بن گئی۔ خصوصاً کپڑے اور قالین کی پیداوار میں۔ گھوڑے بمبئی کو برآمد کئے جاتے تھے۔ رنگ کا سامان اور چمڑے کا سامان مسقط برآمد ہوتے تھے۔ ہندو تاجر کاروانوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔ چیزوں سے قیمتِ فروخت کا 0.5 فیصد کے حساب سے چنگی لیا جاتا تھا۔ شاہراہیں استعمال کرنے پر کاروانوں سے پانچ روپیہ فی اونٹ کے حساب سے محصول وصول کیا جاتا تھا۔

خانی کی درآمدات یہ تھیں:

ہندوستان سے لوہا، ٹن، جست، فولاد، کاپر، نیل ''Cochineal'' میکسیکو کے وہ خشک کیڑے جن سے قرمزی رنگ بنایا جاتا ہے، مصالحہ جات Beetel-nuts، ریشم، کمخاب، سونا، کپڑے اور چھینٹ۔

خراسان سے میوہ جات،

سیستان سے فولاد اور تانبہ،

شکارپور سندھ اور ملتان سے سفید کپڑا، چھینٹ، لنگیاں، پگڑیاں، اور نمک۔ (51)

عظیم بلوچ مملکت کا یہ ''پیٹر دی گریٹ'' جون 1795ء میں بہت خوش اور زبردست حکمرانی کے بعد سو سال کی عمر میں بمقام گنداواہ وفات پا گیا۔ (52) اسے قلات میں دفن کیا گیا۔ اس کے جنازے میں افغانستان اور اومان کے نمائندے موجود تھے۔ استنبول میں ''خلیفۂ اسلام'' اور شاہ ایران نے تعزیتی پیغام بھیجے۔ شاہ ایران نے خان کو ''شاہِ بلوچستان'' کہہ کر خطاب کیا۔

7۔ نصیر خان کی موت اور ریاست

نصیر خان اعظم کے بعد اس کا بڑا بیٹا محمود اول سات برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ ایک تو نوری نصیر خان کی موت ہوگئی، اور دوسری حقیقت یہ تھی کہ بلوچ قبیلوں کے سرداروں کی حکمرانی میں فیوڈل ریاستوں کا زبردست ارتقاء ہوا، چنانچہ بلوچستان عملی طور پر رجواڑوں میں تحلیل ہو گیا۔ ریاست کی تحلیل میں ایک اہم عنصر یہ تھا کہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں کی خواہش تھی کہ مجموعی فیوڈل آمدن میں بلوچستان کے سربراہ (خان) کا حصہ کم کر دیا جائے اور خود اپنا حصہ بڑھا دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جبکہ نصیر خان نوری کا سالانہ ریونیو تیس لاکھ روپے سے تجاوز کر چکا تھا مگر اس کے بیٹے محمود خان کی سالانہ آمدنی محض تین لاکھ روپے رہ گئی۔ اس لئے کہ کیچ، پنجگور، لس، دیزک اور خاران کے فیوڈل حکمرانوں نے ان علاقوں کے عوام پر عائد زرعی ٹیکس اپنے قبضے میں رکھ لیے۔

سندھ کے امیروں نے نصیر خان کی موت کے بعد بلوچوں کے کراچی شہر کے بندرگاہ پر قبضہ کر لیا۔ (53)

میر نصیر خان کی صورت میں ایک مرکزی طاقت کے منظر سے ہٹ جانے کے بعد فیوڈلوں کے مابین پیدا شدہ نفاق اور بدنظمی سے تمام مشرقی قبائل نے فائدہ اٹھایا اور خود کو قلات کی خانی سے الگ کر دیا۔ یہ قبائل انگریز کے آنے تک اپنی خود مختاری چلاتے رہے۔

نصیر خان کی موت کے بعد قلات کی خانی کا سیاسی بحران معاشی مشکلات کی وجہ سے مزید شدید ہو گیا۔ ریونیو کم سے کم ہو رہا تھا جبکہ دربار کے اخراجات شاہانہ ہی رہے۔ علاقے بھی خانی سے کٹتے رہے اور آپسی مناقشے بھی جاری تھے۔ تجارتی تنظیم موضوعی طور پر بھی بہت زیادہ منظّم نہ تھی۔ تاجر، ارسٹوکریسی کو قرضے اور تعیش کا سامان دیتے تھے۔ تقریباً سارا تاجر طبقہ ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ بلوچ سماج میں ہندوؤں کو بطور مذہب کبھی بھی امتیازی سلوک سے دوچار ہونا نہ پڑا۔ آج بھی ہمیں لسبیلہ، کچھی، سبی، قلات اور خاران میں مسجدوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے مندر بڑی شان سے میناریں بلند کیے ملیں گے۔ رواج کے مطابق البتہ وہ پگڑی نہیں پہنتے تھے اور گھوڑے پر سوار نہیں

ہوتے تھے۔

نصیر خان اول نے اپنا اسلام کچھ عرصہ تک ہندوؤں پر بھی جاری کیا جس کے تحت انہیں پیشانی پر ٹکہ کا نشان لازماً لگانا تھا اور مسلمانوں سے پیچھے چلنے کا حکم تھا۔ مگر ہندو تو بلوچ سماج کا ایک لازمی حصہ تھا اور زندہ سماج کو کبھی بھی جامد رکھا نہیں جا سکتا۔ یہ ہندو ایک طرف تو وسطی بلوچستان کے پہاڑی علاقوں میں سامان کے تبادلے کو منظم کرتے تھے تو دوسری طرف سندھ، کچھی، سبی اور لسبیلہ کے میدانی خطوں میں تجارت کرتے تھے۔ پہاڑی علاقوں میں اناج، پشم، قالین، چمڑا، تمباکو، پوٹاش، کھجور اور خشک میوے برآمد ہوتے تھے۔ جبکہ میدانی علاقوں سے درآمدی اشیا میں ٹیکسٹائل، تیل جوتے، لوہے کے برتن، مصالحہ جات، نمک اور جانور شامل تھے۔ جب حالات خراب ہوئے تو تاجر کراچی بھاگ گئے۔ سرداروں نے تجارتی شاہراہوں پر ٹیکس بڑھا دیے تو تاجروں نے متبادل راستے ڈھونڈ نکالے۔

حوالہ جات

1۔ نائنا سوائڈلر، قلات دی پولیٹیکل اکانومی آف اے ٹرائبل چیف ڈم''، امریکن ایتھنولوجسٹ، 19(3)1992، صفحہ نمبر 553۔

2۔ آغا نصیر احمد زئی، ''تاریخ بلوچستان'' جلد چہارم، صفحہ نمبر 295

3۔ ایضاً صفحہ نمبر 303۔

4۔ خان، احمد یار خان۔ مختصر تاریخ۔ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ 1972۔ صفحہ نمبر 37۔ ایوان بلوچ کراچی

5۔ خان، احمد یار خان۔ مختصر تاریخ۔ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ 1972۔ صفحہ نمبر 38۔ ایوان بلوچ کراچی

6۔ آغا نصیر خان، جلد پنجم، صفحہ نمبر 9

7۔ ہتو رام، ''تاریخ بلوچستان''، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، صفحہ نمبر 107

8۔ خان، احمد یار خان۔ مختصر تاریخ۔ قوم بلوچ وخوانین بلوچ۔ 1972۔ صفحہ نمبر 39۔ ایوان بلوچ کراچی

9۔ نصیر، گل خان۔ کوچ و بلوچ۔ 1969۔ بلوچی پبلیکیشنز لیاری کراچی۔ صفحہ نمبر 5

10۔ آغا نصیر خان، جلد پنجم، صفحہ نمبر 161

11۔ ایضاً صفحہ نمبر 149

12۔ گنڈا سنگھ، ''احمد شاہ ابدالی''، 1993، تخلیقات لاہور، صفحہ نمبر 14۔

13۔ لارنس، لاک ہارک/ طاہر منصور فاروقی۔ نادر شاہ۔ تخلیقات لاہور۔ صفحہ 14

14۔ گنڈا سنگھ، صفحہ نمبر 160

15۔ ایضاً صفحہ نمبر 166

16۔ عطائی، محمد ابراہیم، ''دَ بلوچو......'' صفحہ نمبر 21

17۔ لارنس' لاک ہارٹ، صفحہ نمبر 166

18۔ ایضاً، صفحہ نمبر 166

19۔ آغا نصیر خان احمد زئی، جلد پنجم، صفحہ نمبر 179

20۔ کچھی گزیٹیئر، صفحہ نمبر 40

21۔ لارنس' لاک لاک ہارٹ، صفحہ نمبر 231

22۔ گنڈا سنگھ، صفحہ نمبر 37

23۔ مبارک علی، ''بازار اور دوسرے مضامین، صفحہ نمبر 38

24۔ سید، محمد لطیف، ''تاریخ پنجاب''، 1994 تخلیقات لاہور، صفحہ نمبر 433

2 5۔ آغا نصیر خان احمد زئی، جلد پنجم، صفحہ نمبر 233

26۔ خان، میر احمد یار خان۔ مختصر تاریخ بلوچ قوم و خوانین بلوچ ۔1972۔ ایوان بلوچ۔ کراچی۔ صفحہ 43

27۔ سبطِ حسن۔ پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔ صفحہ 227

28۔ فیروز احمد/ فہمیدہ ریاض، ''افریقہ...... پاکستان کے ساحلوں پر'' کراچی کی کہانی، رسالہ ''آج ''صفحہ نمبر 180

29۔ پیکو لین، صفحہ 146

30۔ چارلس میسن ''......Narratives'' صفحہ نمبر 433۔

31۔سلویا میتھی سن، ''ٹائیگرز......''صفحہ نمبر 43

32۔پیھرسن،صفحہ نمبر 75

33۔ڈینس برے، ''سینس''، صفحہ نمبر 174

34۔پیھرسن،صفحہ نمبر 75

35۔ فیروز احمد / فہمید ہ ریاض، ''افریقہ......''، صفحہ نمبر 189۔

36۔عطائی ، ابراہیم، ''A Dictionary of Tercinology of Pashtoons Trible
Law and Usage''1979، اکیڈمی آف سائینسز ، افغانستان کابل، صفحہ 63

37۔ بروِان سِین ، و۔ مارٹن ۔ آغا، شیخ اینڈ سٹیٹ ۔ 1992۔ ریڈ بکس لمیٹڈ لندن ۔ صفحہ 152

38۔ پوٹینگر، صفحہ نمبر 283

39۔ گنڈا سنگھ، ''احمد شاہ ابدالی''، صفحہ نمبر 214

40۔اختر بلوچ، ''خوانین......''، صفحہ نمبر 43

41۔عبدالقدوس، صفحہ نمبر 44

42۔گنڈا سنگھ، صفحہ نمبر 294

43۔ایضاً، صفحہ نمبر 296

44۔ایضاً، صفحہ نمبر 301

45۔خان، میر احمد یار خان، تاریخ قومِ بلوچ وخوانینِ بلوچ، صفحہ نمبر 1

46۔ پوٹینگر، صفحہ نمبر 295

47۔ بلوچ ۔ حکیم ۔ بلوچ قومیت، خانیت وسرداریت ۔ 2007۔ گوشہ ادب کوئٹہ۔ صفحہ 22

48۔ ہیتو رام، ''تاریخ بلوچستان''، صفحہ نمبر 110

49۔ پوٹینگر ، ہنری، ''Travel in Balochistan and Sindh''سنِ اشاعت 1976،
انڈس پبلی کیشنز کراچی، صفحہ نمبر 282

50۔ بلیو۔ ھ۔ و۔ ''افغانستان اینڈ افغانز''1979، سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور صفحہ نمبر 23

51۔ پوٹینگر، صفحہ نمبر 395

52۔ پوٹنگر صفحہ نمبر 284

53۔ پوٹنگر صفحہ نمبر 287